ولادتِ عیسیٰؑ

اور منکرینِ حدیث



ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام اور منکرینِ حدیث

تالیف

ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

کتاب سرائے
بیت الحکمت لاہور کا اشاعتی ادارہ
الحمد مارکیٹ، اُردو بازار، لاہور

بیاد
پروفیسر عبدالجبار شاکرؒ
۱۹۴۷-۲۰۰۹

۱۴۳۱ ہجری ۲۰۱۰ء

کتاب : ولادتِ عیسیٰؑ اور منکرینِ حدیث

مصنف : پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

اہتمام : بیت الحکمت، لاہور

مطبع : روشن پرنٹرز، لاہور

ڈسٹری بیوٹرز

نعمانی کتب خانہ
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
فرسٹ فلور، الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ
اردو بازار، لاہور فون: 7320318 فیکس: 7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

ترتیب ابواب

ترتیب

باب۲

تذکرہِ ولادتِ افرادِ ثلاثہ (سورہ آل عمران کی روشنی میں)

باب ٣

ولادتِ مسیح سے وابستہ تین معجزانہ پہلو

باب۴

ولادتِ یحییٰ اور ولادتِ عیسیٰ (سورہ مریم کی روشنی میں)

باب ۵

معقول دلائل پر، نامعقول تنقید

☆..........☆..........☆

حرفِ اوّل

قرآن کریم کے حوالہ سے میرے شغفِ مطالعہ نے، جب کتبِ پرویز کو میری دسترس میں دیا، تو میں ایک کھلے دل و دماغ کا شخص ہونے کی بناء پر، جناب چوہدری غلام احمد پرویز صاحب کے یک رخے مطالعہ پر قانع نہ رہا، بلکہ میں، ہر وہ کتاب، اپنی کشادگیٔ قلب اور وسعتِ دماغ کی بناء پر، پڑھتا رہا، جو قرآنی تعلیمات کے کسی بھی پہلو پر تصنیف کی گئی ہو۔ میرے اسی ذوق سے شناسا، میرے ایک مہربان دوست، جناب شکیل عثمانی صاحب نے راولپنڈی سے، مجھے ایک کتاب ''ابن مریم اور پرویز'' کی فوٹو کاپی ارسال فرمائی۔ یہ کتاب ،مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی صاحب کی، بڑی خوبصورت اور مدلل نگارش ہے، جو ان کی قرآن فہمی اور جودتِ استدلال کا شاہکار ہے۔ کتاب پڑھتے ہی، معاً میرا خیال ،۲۰۰۴ء کے ماہنامہ طلوع اسلام کے اُس شمارہ کی طرف مبذول ہوگیا، جس میں اس کتاب کی تردید میں، چھپنے والی ایک کتاب کا اشتہار دیا گیا تھا، چونکہ میں طلوع اسلام کا مستقل قاری ہوں اور میرے پاس، اس کی فائل موجود ہے، اس لیے، میں نے اس فائل کی چھان بین سے یہ معلوم کر کیا کہ وہ (تردیدی) کتاب، ایک ایسے شخص کے رشحاتِ فکر کا نتیجہ ہے جو پاکستان میں عراقی سفارت خانہ میں کبھی ملازم تھے۔ ان کی کتاب کا پورا نام ''ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی'' ہے۔ چنانچہ کسی دوست کے ذریعہ، میں نے یہ کتاب، ادارہ طلوع اسلام، لاہور سے منگوائی، اور اِس کا مطالعہ بھی کیا۔ جناب طاہر سورتی، اور ان صاحب کی مذکورہ بالا دونوں کتابوں سے پہلے، میں، اس موضوع سے متعلق، جناب پرویز صاحب کے قلم سے برآمد ہونے والا سارا مواد پڑھ چکا تھا۔ چنانچہ تینوں مصنفین کی کتب کے مطالعہ کے بعد، میں نے لازم جانا کہ میں خود بھی، اس موضوع پر قلم اٹھاؤں۔ اس طرح، یہ کتاب، جو آپ

کے ہاتھوں میں ہے، میری اسی سوچ کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب کے پہلے باب میں، معجزاتِ انبیاء کے بارے میں، چند اصولی باتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں، ولادتِ مریمؑ، پیدائشِ یحییٰؑ اور پھر ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ، سورہ آل عمران کی روشنی میں کیا گیا ہے۔ تیسرے باب میں، سورہ مریم کی روشنی میں ولادتِ مسیح علیہ السلام سے وابستہ، تین اعجازی پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہے۔ یہ باب، خاص طور پر، اس کتاب کے لیے نہیں لکھا گیا تھا، بلکہ یہ میری ایک اور تصنیف کا حصہ ہے، لیکن، غور وخوض کے بعد، (تکرار کی کوفت کے باوجود) اسے موضوع کی مناسبت سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں ولادتِ یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام کو، سورہ مریم ہی کی آیات کی روشنی میں پھر بیان کیا گیا ہے۔ اور ایک ایک آیت کا ترجمہ ومفہوم، تسلسل کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ تیسرے اور چوتھے ابواب میں، اگرچہ بعض امور مشترک اور مکرر (Repatedl) بیان ہوئے ہیں، تاہم وہ فائدہ سے خالی نہیں ہیں۔ پانچویں باب میں، مولانا طاہر سورتی مرحوم کے معقول موقف پر، مصنفِ کتاب ''ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی'' نے جو نامعقول تنقید فرمائی ہے، اس کا جائزہ لیا گیا ہے۔ میں نے ان کا جہاں بھی ذکر کیا ہے، ''صاحبِ کتاب'' یا ''مصنفِ کتاب'' یا ''ناقد ومعترض'' یا ''فاضل تنقید نگار'' یا ''صاحبِ تردید'' کی حیثیت سے کیا ہے اور ان کے نام کو یکسر نظر انداز کر دیا ہے۔

آخر میں، مَیں قارئین کرام سے یہ درخواست کروں گا کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے کے بعد، آپ ہر اس شخص کو، اس کے مطالعہ کی دعوت دیں، جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے۔ ایک پڑھے لکھے آدمی سے ہمیں یہی توقع ہے کہ وہ خواہ کوئی رائے بھی رکھے، بہرحال، دونوں طرف کے موقف کا مطالعہ کر کے رائے قائم کرے گا۔ یک رخے مطالعہ پر رائے قائم کرنا، کسی معقول شخص کا کام نہیں ہے۔

پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی

باب اوّل

معجزات کے متعلق چند اصولی امور

اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش کے نتیجہ میں، دینِ اسلام کے جن امور و مسائل کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے، ان میں معجزاتِ انبیاء کا مسئلہ بھی شامل ہے، تہذیب مغرب سے مرعوب و مسحور طبقہ، جو مغربی نظام تعلیم کی آغوش میں پرورش پائے ہوئے ہے، نہ صرف یہ کہ معجزات اور خارقِ عادت امور کا منکر ہے بلکہ وہ اِن کا مذاق بھی اڑاتا ہے، یہ لوگ، خوارقِ عادت امور کو، قانونِ فطرت سے متصادم قرار دیتے ہیں، ان کا سائنسی مطالعہ، انہیں یہ عقیدہ اپنانے پر اکساتا ہے کہ کارگاہ کائنات میں فطرت کے قوانین، یکساں اور باقاعدہ کام کرتے ہیں، اگر واقعات وحوادث، طبیعی قوانین سے ہٹ کر، الل ٹپ یا پھر خوابِ پریشان کی صورت میں وقوع پذیر ہوں تو قوانینِ فطرت کا مطالعہ فضول بلکہ ناممکن ہوگا، ان لوگوں کے نزدیک، خوارق ومعجزات کے پائے جانے سے، فطرت کی یکسانی اور باقاعدگی میں خلل آجاتا ہے اور قوانین قدرت میں بے ترتیبی، بدنظمی اور ابتری پیدا ہو جاتی ہے، جو کائنات کے مجموعی نظم وضبط اور قوانینِ قدرت کے منافی ہے، ان لوگوں کے نزدیک کائنات کا ہر واقعہ اور ہر حادثہ، قانون علت ومعلول (Law of Cause & Effect) سے وابستہ ہے، علت کے بغیر، معلول کا صدور ناممکن ہے، اس بناء پر، اگر کہیں فی الواقعہ، معجزہ پایا بھی جائے، تو یہ لوگ، اس کی توجیہ میں، بڑے تکلّف اور تصنّع کے ساتھ، قانونِ علت ومعلول کی کھینچ تان کے ذریعہ، بات بنانے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ اسے عام قوانینِ قدرت کے تحت، معمول کا ایک عام اور عادی واقعہ قرار دیا جائے، یہی وہ بنیاد ہے، جس پر، انکارِ معجزات کی عمارت استوار کی جاتی ہے، خود پرویز صاحب کی تصانیف میں، انکارِ معجزات کے پس پردہ بھی یہی

چیز کارفرما ہے، (جیسا کہ آگے چل کر اس پر تفصیلی بحث آ رہی ہے) علاوہ ازیں، پرویز صاحب کے نزدیک، کفار کی طرف سے معجزات کا مطالبہ، ان کی اعجوبہ پسند فطرت کا تقاضا بھی تھا، جسے پورا کرنا، اس لیے مناسب نہ تھا کہ اس سے ان کے ذوقِ اعجوبہ پسندی کو خواہ مخواہ شہ ملتی۔ ایک مقام پر، پرویز صاحب مطالبۂ معجزات کو، بر بنائے اعجوبہ پسندی، یوں بیان کرتے ہیں:

> ''نسلِ انسانی میں بعض جذبات، خواہشات، تصورات اور معتقدات، انسان کے ابتدائی دور سے متوارث چلے آ رہے ہیں، انہی میں اعجوبہ پسندی بھی ہے، ابتدائی دور کے انسان کا شعور، نیم بیدار یا نیم پختہ تھا، اس لیے فطرت کا قانون علت و معلول (Law of Cause And Effect) اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا، اس بناء پر وہ فطرت کے ہر مظہر اور کائنات کے ہر حادثہ کو خارقِ عادت خیال کرتا تھا۔'' ؎۱

کائنات اور اس میں ''مقرر کردہ قوانین'' کے متعلق، صاحبِ تفسیر مطالب الفرقان لکھتے ہیں:

> ''اللہ تعالیٰ نے کائنات کو پیدا کرنے کے بعد، خود ہی یہ فیصلہ کر دیا کہ اب یہ سلسلہ، اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلتا رہے گا اور وہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کرے گا۔'' ؎۲

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم میں نہ تو کہیں اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ مذکور ہے کہ کائنات کا ''اب یہ سلسلہ، اس کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق چلتا رہے گا'' اور نہ ہی اس کا یہ وعدہ ہے کہ ''وہ ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں کرے گا۔'' یہ سب کچھ ''مفکرِ قرآن'' کا اپنا زعم و گمان ہے، جو مغرب کے میکانکی تصورِ کائنات پر مبنی ہے، جس کے تحت، خدا اور کائنات کا تعلق، گھڑی ساز اور خودکار (Automatic) گھڑی کے باہمی تعلق سے مختلف نہیں ہے، جس طرح گھڑی ساز، گھڑی بنا ڈالنے کے بعد، اس سے بے تعلق رہتا ہے اور گھڑی، اپنے

؎۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۲۲ ؎۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۱۰۹

خود کار اندرونی نظام کے تحت، خود بخود چلتی رہتی ہے، بالکل اسی طرح خالقِ کائنات، تخلیقِ کائنات کے بعد، اس سے لاتعلق ہو کر اب کسی آرام گاہ (Retiring Room) میں استراحت فرما رہا ہے اور کائنات اپنے طبیعی قوانین کے مطابق، خود کار گھڑی کی طرح، از خود چلے جا رہی ہے اور اندھے بہرے قوانینِ فطرت کے سامنے، گویا خود خداوند قدوس بھی بے بس ہے کہ وہ ان سے ہٹ کر یا ان کی موجودگی میں، وہ کوئی خارقِ عادت کام کر سکے، دراصل خدا کے متعلق یہی غلط تصور ہے، جو انکارِ معجزات کی بنیاد ہے۔

تصورِ خدا کے متعلق ایک فیصلہ کن سوال:

معجزات کے حوالہ سے، اللہ تعالیٰ کی ذات کے متعلق دو تصورات ہیں۔

(۱) ایک تصور یہ ہے کہ وہ کائنات کو وجود میں لا کر، اور پھر اسے قانون کے تحت چلا کر، اب خود معطل ہو چکا ہے، اور اس چلتے ہوئے نظام کائنات میں، کسی موقع پر، وہ کسی قسم کی مداخلت بھی نہیں کر سکتا، نظامِ کائنات، ایک آٹومیٹک گھڑی کی طرح، مقررہ قوانین پر، از خود چلے جا رہا ہے، اب یہ ممکن نہیں کہ ان طبیعی قوانین کو برقرار رکھتے ہوئے، یا ان میں تبدیلی کرتے ہوئے، کوئی ایسا واقعہ وقوع پذیر ہو، جو قوانینِ قدرت کے منافی ہو، یا سلسلۂ علت و معلول کی حدود سے خارج ہو۔

(۲) دوسرا تصور یہ ہے کہ تخلیقِ کائنات کے بعد، اللہ تعالیٰ، اس سے بے تعلق ہو کر، نہیں بیٹھ گیا، بلکہ اب بھی اپنی وسیع سلطنتِ کائنات کی زمامِ تدبیر و انتظام، اسی کے ہاتھ میں ہے، اور ہر آن، اُسی کے احکام نافذ بھی ہوتے رہتے ہیں، اسے ہر وقت، یہ اختیار حاصل ہے کہ اشیاء کی شکلوں یا واقعات کی عادی رفتار میں، جزوی طور پر، یا کلی طور پر، جیسا اور جب چاہے، تغیر کر دے، نہ صرف یہ کہ وہ اختیار رکھتا ہے بلکہ از روئے قرآن، حسب موقع و مصلحت، وہ ایسا کر بھی ڈالتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ آپ کس تصورِ خدا کے قائل ہیں؟ پہلے کے؟ یا دوسرے کے؟

جو لوگ، پہلے تصورِ خدا کے قائل ہیں، ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا ممکن نہیں ہے،

کیونکہ معجزہ، نہ تو ان کے تصورِ خدا سے میل کھاتا ہے اور نہ ہی ان کے تصورِ کائنات سے۔ ایسے لوگوں کے لیے، اگر کوئی ایماندارانہ اور دیانتدارانہ طرزِ عمل ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر و تشریح کے درپے ہونے کی بجائے، قرآن کا انکار کر دیں، کیونکہ قرآن قدم قدم پر، خدا اور کائنات کے اُس تصور کا ابطال کرتا ہے جس پر انکارِ معجزات کی بنیاد رکھی جاتی ہے، اور اس کے برعکس، وہ دوسرے تصور کا پرزور اثبات کرتا ہے جس کا منطقی اور بدیہی نتیجہ، خوارق عادات امور کا ممکن الوقوع ہونا قرار پاتا ہے، یہی وجہ ہے کہ خدا و کائنات کے متعلق، دوسرے تصور کو قبول کرنے والے شخص کے لیے، معجزات کو تسلیم کرنا، کچھ مشکل نہیں رہتا۔

سنت اللہ سے استدلال کی حقیقت:

دیگر منکرینِ حدیث کی طرح، پرویز صاحب بھی، انکارِ معجزات کے موقف کی حمایت میں، ان آیات سے استدلال کرتے ہیں، جن میں یہ کہا گیا ہے، کہ ''تم اللہ کی سنت میں، تغیر نہ پاؤ گے۔'' چنانچہ ان کے نزدیک، قوانینِ فطرت ہی وہ سنت اللہ ہے جو تغیر و تبدل سے بالاتر ہے، لہٰذا وقوعِ معجزات کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

> دوسری چیز ہے، خود قوانینِ فطرت، یہ قوانین اٹل اور غیر متبدل ہیں، اور انسان ان میں کسی قسم کی بھی تبدیلی نہیں کر سکتا، ان قوانین کو، قرآن، سنت اللہ سے تعبیر کرتا ہے، اور پورے حتم و یقین کے ساتھ اعلان کرتا ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (۳۵/۴۳) [۱]

پرویز صاحب، مطالبۂ معجزہ کو، قوانینِ فطرت سے اُسی طرح بے ربط گردانتے ہیں، جس طرح سنکھیا کی ہلاکت آفرینی کی دلیل کے طور پر، پتھر کو پانی میں تیرا دینے کا مطالبہ بے ربط ہے، چنانچہ وہ معجزات کی بحث میں لکھتے ہیں کہ:

> غور کرو، یہ رسول آخر تم سے کہتا کیا ہے؟ یہی نا کہ زندگی کی جن غلط شاہراہوں

---

[۱] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۴۸

پر تم چلے جا رہے ہو، یہ تمہیں بربادی اور ہلاکت کے عمیق غاروں کی طرف لیے جا رہی ہیں، تم اس بات کا یقین نہیں کرتے۔ یہ کہتا ہے کہ "تمہارے ہاتھ میں سنکھیے کی ڈلی ہے، اسے کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے" تم کہتے ہو کہ "ہم جب مانیں گے کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے، اگر تم اس پتھر کو پانی میں تیرا دو۔" یہ کہتا ہے کہ "نادانو! میرے دعویٰ اور تمہارے مطالبہ میں ربط کیا ہے؟ میرے دعویٰ کی دلیل چاہتے ہو تو ان سامنے کی قبروں کو دیکھو اور ان کے سرہانے گڑی ہوئی الواح کو پڑھو، جن پر لکھا ہے کہ انہوں نے سنکھیا کھایا اور اس کا یہ انجام ہوا۔ یہ ہے میرے دعویٰ کی دلیل، نہ کہ وہ جس کا تم مطالبہ کر رہے ہو۔ یہ فطرت کا اٹل قانون ہے، جو نہ پہلوں کی خاطر بدلا، نہ تمہاری خاطر بدلے گا۔"

سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا

(۳۳/۶۲)

خدا کا (اٹل قانون، ان لوگوں میں بھی جاری رہا، جو پہلے گزر چکے ہیں (اور آئندہ بھی اسی طرح رہیگا، چنانچہ) تم خدا کے قانونِ (محکم) میں کسی قسم کی تبدیلی نہ پاؤ گے۔ [1]

یہ طرز استدلال، اپنی پشت پر غلط فہمیوں کا ایک انبار رکھتا ہے، جسکی بناء پر یہ لوگ، نہ تو دعوائے رسالت اور مطالبۂ معجزات کے درمیان ربط ہی کو سمجھتے ہیں، اور نہ سنت اللہ کے حقیقی مفہوم کو، اور نہ ہی قانونِ عادت اور قانونِ قدرت کو، اور نہ ہی علت و معلول پر اللہ تعالیٰ کے ہمہ گیر اور ہمہ وقتی کنٹرول کو، اور نہ ہی خاص حالات میں، باری تعالیٰ کی خاص صفات و عادات کے ظہور کو، ...... اور پھر یہ لوگ، اس امر سے بھی بے بہرہ ہیں کہ لگے بندھے اصول وقوانین کے مطابق، عادتاً اور معمولاً واقع ہونے والے امور، خدائے لم یزل اور خالقِ لایزال کے ہاتھ نہیں باندھ دیتے کہ وہ غیر عادی اور غیر معمولی امور کو انجام دینے سے عاجز

---

[1] معراج انسانیت، صفحہ ۴۳۱

ہو جائے، بلکہ وہ غیر معمولی احوال میں، اپنی خاص صفات کا اظہار کرتے ہوئے بھی ...... نیز عادی امور کو برقرار رکھتے ہوئے بھی ...... بعض غیر معمولی اور غیر عادی وقائع کو وقوع پذیر کر سکتا ہے، جس میں خواہ علت و معلول کی کڑیوں کا فقدان ہی کیوں نہ پایا جائے۔

مندرجہ ذیل سطور میں، نمبر وار ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے، جن کا انبار، منکرینِ حدیث کے نہاں خانۂ دماغ میں ہے۔

(ا) مطالبۂ معجزات اور دعوائے رسالت میں ربط:

اس میں کوئی شک نہیں کہ دماغی صلاحیتوں، ذہنی قابلیتوں، اور غور و فکر کی جملہ استعدادات میں، تمام لوگ، ایک ہی سطح پر نہیں ہوتے ہیں، بعض لوگ، اس اعتبار سے انتہائی بلند و بالا ہوتے ہیں، اور بعض انتہائی پست اور ادنیٰ، بعض کسی دعوت کو فطری طور پر سمجھ کر، اپنی معاشی اغراض، سیاسی مجبوریوں یا دیگر وجوہ کی بناء پر، اسے ردّ یا قبول کر لیتے ہیں، لیکن دوسرے افراد، فکری طور پر، اس دعوت کو پرکھنے کی ذہنی صلاحیت ہی سے محروم ہوتے ہیں، وہ اگر اس دعوت کو ماننا بھی چاہتے ہوں تو داعی کے دعویٰ کی نسبت سے، ایک ایسا مطالبہ پیش کرتے ہیں، جسے پورا کر ڈالا جائے، تو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ دعوت، حق کی دعوت ہے، اور قبول کیے جانے کے لائق ہے۔

جن لوگوں کو قرآن، غور و فکر کی بنیاد پر، پیغامِ رسالت کو قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے، وہ دراصل، پہلی قسم سے تعلق رکھنے والے لوگ ہیں، یہ لوگ، زود یا بدیر، اس دعوت کو سوچ سمجھ کر قبول کر ہی لیتے ہیں الّا یہ کہ ان کی حق پرستی پر دیگر مصالح غالب آ جائیں۔ رہے دوسری قسم کے لوگ، تو دراصل یہی وہ لوگ ہیں، جو دعوتِ انبیاء کو بصیرت و فراست کی کسوٹی پر پرکھنے کی بجائے، خوارقِ عادات امور کا مشاہدہ کر کے، قبول کرنا چاہتے ہیں، ہو سکتا ہے کہ اس گروہ میں (دعوتِ حق کو ماننے کے لیے) معجزات کا مخلصانہ مطالبہ کرنے والوں کے علاوہ، ایسے بدنیت لوگ بھی شامل ہوں، جو مطالبۂ معجزات کو نہ ماننے کے لیے، بہانہ و اعتراض کے طور پر، اختیار کر رہے ہوں، لیکن ایسے بہانہ ساز کفار کی موجودگی، اُن لوگوں

کے وجود کی نفی نہیں کرتی، جو ذہن و دماغ کی فکری صلاحیتوں میں پست ہونے کی بناء پر، محض معجزات دیکھ کر ہی ایمان لانے والے ہیں، اور نیک نیتی سے مطالبۂ معجزہ کرنے والے ہیں۔

کیا معجزہ دلیل نبوت ہے؟

اب یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا معجزہ دلیل نبوت ہو بھی سکتا ہے یا نہیں؟ منکرین معجزات کا جواب اس لیے نفی میں ہے کہ ان کے نزدیک، پیغمبر کے دعوائے نبوت میں، اور کفار کے مطالبۂ معجزہ میں، کوئی مناسبت نہیں پائی جاتی، لیکن قائلین معجزات کا جواب اثبات میں ہے، جسے سید سلیمان ندویؒ نے بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے، ملاحظہ فرمائیے ان کا یہ اقتباس:

''نبوت، علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے، اور جو شخص، نبوت کا دعویٰ کرتا ہے، اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے، اور اسی کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے، اور انبیاء کے معجزات، اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے، اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات، اور ان دونوں کو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے، اخبار بالغیب سے اسکے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اسکی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے، ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ، خرقِ عادت کا نام ہے۔ اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیاء اور حقائق کے خصائص اور علل، خدا کے امر و حکم سے ہیں، اب جو شخص ان خصائص و علل کو، اپنے معجزہ سے توڑ دیتا ہے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے، وہی اُسکو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و خرق، چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوا ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اُسی کا فرستادہ ہے، اسکی مثال یہ ہے کہ ایک بادشاہ، اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا

ہے، رعایا پوچھتی ہے کہ اس کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہ ہی کے قاصد ہو؟ وہ اس کے جواب میں، بادشاہ کی مُہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے، اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعوائے پیامبری کو، مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت نہیں، لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہو جاتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہ کی نشانی ہے، جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی، اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دیکر بھیجا گیا ہے۔" [1]

آگے چل کر، دعوائے رسالت و نبوت اور مطالبۂ معجزات کے درمیان واقع مناسبت کو اس طرح واضح فرماتے ہیں:

ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے آداب و رسوم خاص ہوتے ہیں، بادشاہ، دربار میں معمولی فرش پر نہیں بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے، جلوس میں پیادہ نہیں بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے، ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمعِ عام میں آتا ہے، یہ مجمع اسکو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے، قاصد، بادشاہ سے کہتا ہے کہ "اے بادشاہ! اگر میں حقیقتاً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف، تو فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل"، بادشاہ، اس کے مطابق، دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے، اور پیادہ چلتا ہے، بادشاہ کا یہ عمل، یقیناً اس بات کی تصدیق ہو گی کہ وہ شاہی قاصد ہے، اسی طرح، دنیا کے اسباب و علل، اس دنیا میں، خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں، پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے، کفار اس کے قاصدِ الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں، وہ کہتا ہے، "اے خدا! اگر میں حقیقۃً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف، معجزہ اور خرقِ عادت دکھا"، وہ دکھا دیتا ہے، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ [2]

---

[1] سیرت النبی، حصہ سوم، (بابت معجزات) صفحہ ۹۳ [2] سیرت النبی، حصہ سوم، صفحہ ۹۳ تا صفحہ ۹۴

باندازِ دیگر یوں بھی کہا جا سکتا ہے، کہ کسی بھی نبی و رسول کا اولیں دعویٰ، نبوت و رسالت ہی کا دعویٰ ہوا کرتا تھا، اور نبوت و رسالت دراصل ایک ایسے خاص تعلق کا نام ہے، جو خالقِ کائنات اور نبیٔ مرسل کے درمیان پایا جاتا ہے، اس لیے جب کوئی نبیٔ مرسل، کسی قوم کے سامنے، اپنے رسول ہونے کا اعلان کرتا ہے، تو دراصل وہ اس بات کا اعلان ہوتا ہے کہ خدا اور اسکے درمیان، یہ خاص تعلق قائم ہے، جو دوسرے افراد کے ساتھ نہیں ہے، اسی خاص تعلق کو جانچنے کے لیے کچھ مطالبات پیش کیے جاتے ہیں، جنہیں اگر پورا کر دیا جائے تو یہ تعلق ثابت ہو جاتا ہے، اور ان فرستادگانِ خداوندی کا نبی و مرسل ہونا بھی پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتا ہے، جس کے نتیجہ میں اُن کی دعوت، قابل قبول قرار پاتی ہے۔

بلا شک وشبہ، پیغمبر، جب یہ کہتا ہے کہ ''سنکھیا کھانے سے انسان ہلاک ہو جاتا ہے'' تو مخاطبینِ رسول کی طرف سے، بطورِ دلیل، یہ مطالبہ پیش کیا جانا کہ ''پانی پر پتھر کو تیرا کر دکھا دو'' صرف اس دعویٰ کی جانچ پڑتال کے لیے ہے کہ واقعی، اس کا خدا کے ساتھ، وہ خاص تعلق استوار ہے جسے نبوت و رسالت کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے، کیونکہ سنکھیا کی ہلاکت آفرینی کا دعویٰ وہ بحیثیت، ایک عام طبیب کے نہیں، بلکہ بحیثیت رسول و نبی کے کر رہا ہے، جو خدا سے خصوصی تعلق رکھتا ہے، اب اگر، واقعی پیغمبر، پتھر کو پانی میں تیرا کر دکھا دیتا ہے، تو لوگوں کے نزدیک، اس کا من مانا مطالبہ پورا کر دینے کی بناء پر، وہ سچا پیغمبر قرار پاتا ہے اور اسکی دعوت قابل قبول۔ لیکن اگر وہ لوگ، اپنا منہ مانگا مطالبہ پورا کر دینے کے بعد بھی، انکارِ رسالت کے موقف پر جمے رہتے ہیں، تو ان پر اتمام حجت ہو جاتی ہے اور وہ اپنے کفر کی پاداش میں، ہر وقت، معرضِ خطر و عذاب میں رہتے ہیں۔

''صاحبِ کتاب'' کا موقف:

الغرض، معجزات کا انکار، جس کسی نے بھی کیا ہے، اس گمان کے تحت کیا ہے کہ ان کا وقوع، سنت اللہ کے خلاف ہے۔ ''صاحبِ کتاب'' کا موقف بھی یہی ہے۔ وہ اپنی کتاب میں، اپنے ایک ہم مسلک شخص کی تقریظ کو شائع کرتے ہیں جس میں یہ کہا گیا ہے کہ:

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی ایک نبی کی اپنی پیدائش، سنت اللہ اور معروف طریقے کے خلاف ہو، اور نبی کسی دوسرے طریقے سے دنیا میں تشریف لائے۔''[1]

علاوہ ازیں، وہ، حضرت زکریاؑ کے حد سے بڑھے ہوئے بڑھاپے اور ان کی بیوی کے دائمی بانجھ پن کی حالت میں، ولادتِ یحییٰؑ کو بھی، خلافِ سنت اللہ قرار دیتے ہیں، جیسا کہ ان کی کتاب کے صفحہ ۱۶ سے ظاہر ہے۔ مزید برآں اپنی اسی کتاب کے صفحہ ۸۹ پر بھی، بغیر باپ کے پیدائش عیسیٰؑ کو ''عمومی قاعدہ'' اور ''سنت اللہ'' کے منافی قرار دیا گیا ہے۔ لیکن حرام ہے کہ یہ لوگ کبھی اس امر پر بھی غور کریں کہ ''سنت اللہ'' سے خود قرآن کے نزدیک کیا مفہوم و مراد ہے؟

(۲) سنت اللہ کا اصل مفہوم:

جناب پرویز صاحب کی انکارِ معجزات کی دلیل، اور ''صاحبِ کتاب'' کی، بن باپ ولادتِ مسیح کے انکار کا مبنیٰ، دراصل سنت اللہ کا وہ خود ساختہ مفہوم ہے جسکی رو سے سنت اللہ کو کائنات کے طبیعی قوانین کا ہم معنی سمجھا جاتا ہے، اور یہ طے کر دیا جاتا ہے کہ یہ طبیعی قوانین ناقابل تغیر و تبدل ہیں اور چونکہ یہ قوانین اٹل ہیں، اس لیے خرق عادت یا معجزہ کے وقوع کی گنجائش نہیں۔ آیئے یہ دیکھیں، کہ قرآن میں سنت اللہ کا مرکب اضافی، کس مفہوم میں وارد ہوا ہے، قرآن میں یہ ترکیب، آٹھ مقامات پر آئی ہے، جنکی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) سُنَّةَ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنْ رُّسُلِنَا وَلَا تَجِدُ لِسُنَّتِنَا تَحْوِيْلاً

(بنی اسرائیل — ۷۷)

''یہ ہمارا مستقل طریق کار ہے جو تم سے پہلے والے رسولوں کے معاملہ میں بھی ہم نے برتا ہے اور ہمارے طریق کار میں تم کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔''

(۲) وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا اِذْ جَاءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّاۤ

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی'' صفحہ vii

اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ او يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا (الکھف - ۵۵)

''ہدایت آ جانے پر، اسے ماننے اور اللہ سے طلبِ مغفرت سے انہیں کسی چیز نے نہ روکا، ماسواء اسکے کہ وہ منتظر تھے کہ ان کے ساتھ پہلوں کا سا طرزِ عمل پیش آئے یا وہ عذاب کو سامنے آتے ہوئے دیکھ لیں۔''

(۳) سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوا مِنْ قَبْلُ وَكَانَ اَمْرُاللّٰهِ مَفْعُولاً

(الاحزاب - ۳۸)

''یہی سنت اللہ، پہلے گزرے ہوئے، افراد (انبیاء) میں بھی رہی ہے اور اللہ کا حکم، ایک قطعی طے شدہ فیصلہ ہوتا ہے۔''

(۴) سُنَّةَ اللّٰهِ فِى الَّذِيْنَ خَلَوا مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً

(الاحزاب - ٦٢)

''یہ اللہ کی سنت ہے جو (ایسے لوگوں میں) پہلے سے چلی آ رہی ہے جو گزر چکے ہیں اور تُو اللہ کی سنت میں کوئی تبدیلی ہرگز نہ پائے گا۔''

(۵-٦)وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّءُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّةَ الْاَوَّ لِيْنَ فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلاً وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَحْوِيْلاً

(فاطر - ۴۳)

''حالانکہ گھناؤنی چالیں، اپنے چلنے والوں ہی کو لے بیٹھتی ہیں، اب کیا یہ لوگ اسی طرزِ عمل کے منتظر ہیں جو پہلوں کے ساتھ روا رکھا گیا، یہی بات ہے تو تم اللہ کے طرزِ عمل میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے اور نہ ہی اللہ کی سنت کو اپنے اصل راستے سے ہٹا ہوا پاؤ گے۔''

(۷) فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِىْ قَدْ خَلَتْ فِىْ عِبَادِهٖ وَخَسِرَ هُنَا لِكَ الْكَافِرُوْنَ (المومن - ۸۵)

''ہمارا عذاب دیکھ لینے کے بعد، ان کا ایمان، ان کے لیے نافع نہ ہوا کیونکہ

یہی اللہ کا مقرر ضابطہ ہے، جو ہمیشہ اسکے بندوں میں جاری رہا ہے، اور پھر اس وقت کافر لوگ خسارے میں پڑ گئے۔''

(۸) سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِي قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً

(الفتح - ۲۳)

''یہ اللہ کی سنت ہے جو پہلے سے چلی آ رہی ہے اور تم اللہ کی سنت میں ہرگز کوئی تبدیلی نہ پاؤ گے۔''

ان تمام آیات میں، جس چیز کو سنت اللہ کہا گیا ہے، وہ دراصل اللہ تعالیٰ کا وہ طرز عمل ہے، جو وہ منکرینِ حق کے خلاف پاداشِ کفر و شرک کی صورت میں اور علمبردارانِ حق کی حمایت میں، انہیں دنیاوی غلبہ و کامیابی سے سرفراز کرتے ہوئے اختیار کرتا ہے، بعض آیات، اس مفہوم میں خود مکتفی ہیں، مثلاً آیت نمبر ۲، ۵ اور ۷۔ جبکہ بقیہ آیات میں سنت اللہ کا یہ مفہوم، ان کے سیاق و سباق سے واضح ہو جاتا ہے، آپ خود قرآن کھول کر دیکھ لیجئے، خود پرویز صاحب کو بھی بعض اوقات، اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہی بنی، چنانچہ وہ اپنی تفسیر کی تیسری جلد کے انڈیکس میں، سنت اللہ کا مفہوم ہی ''قانونِ مکافاتِ عمل'' کے لفظ سے واضح کرتے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۳، صفحہ ۵۱۴) اس حوالہ کے مطابق، تفسیر کی جلد دوم صفحہ ۱۵۳ پر، زیر آیت (۲/۴۰) جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ سنت اللہ کا مفہوم ''قانون مکافاتِ عمل'' کو تفصیل سے پیش کرتا ہے، چونکہ یہ اقتباس خاصا طویل ہے، اس لیے اسے نظر انداز کر کے، طلوع اسلام ہی سے ایک مختصر عبارت پیش کی جاتی ہے...... ''ترجمان القرآن مؤلفہ ابوالکلام آزاد کے متعلق چند باتیں......'' کے زیر عنوان، درج ذیل اقتباس ملاحظہ فرمایئے جس میں مولانا آزاد کے اس مؤقف کی تردید کی گئی ہے کہ...... ''سنت اللہ سے مراد، قوانین فطرت ہیں......''

''سنت اللہ کے لفظ سے مؤلف نے جو دھوکہ کھایا ہے یا اوروں کو اس میں گرفتار کرنے کی سعی کی ہے، اس کے متعلق، صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ یہ لفظ

قرآن مجید کے اندر، ایک خاص متعین معنٰی میں استعمال ہوا ہے ''سرکش اقوام کو ان کے باغیانہ اعمال کی پاداش دینا۔'' اس معنٰی کو کتاب اللہ میں سنت اللہ سے تعبیر کیا گیا ہے، مؤلف ترجمان القرآن نے تخصیصِ محل کو بے دردی سے نظر انداز کر کے (جو تقلید وحی سے ہٹ کر آزاد سوچ و چار کرنے والوں کا شیوہ ہے) اس مفہوم کو اٹل اور خود مختار، قوانینِ فطرت سے تعبیر کیا ہے، اور اس پر اپنے سب استدلال کی بنیاد رکھی ہے۔'' [۱]

اب غور فرمایئے کہ آج ''مفکر قرآن'' نے سنت اللہ کا جو مفہوم، اپنایا ہے، وہی کل جبکہ مولانا ابوالکلام آزاد بیان فرما رہے تھے، تو طلوع اسلام، ان کے طرزِ عمل کو ''تقلید وحی سے ہٹ کر، آزاد سوچ وچار کرنے والوں کا شیوہ'' قرار دے رہا تھا، لیکن آج اسی مفہوم کو جب پرویز صاحب نے اختیار کیا، تو وہ ''مفکر قرآن'' قرار پا گئے، جنکے ہاتھوں، کل کا غلط تصور، آج صحیح تصور قرار پا گیا، جس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ (ان کے نزدیک) زمانے کے گزرنے اور بدلنے کے ساتھ ساتھ، صحیح و غلط اور حق و باطل کے تصورات بھی تغیر پذیر ہوتے رہتے ہیں، لیکن اس عملی رویے کے ساتھ، ''مفکر قرآن'' یہ اعلان بھی کرتے ہوئے نہیں تھکتے کہ

''جو شے، اپنی اصل کے اعتبار سے باطل ہے، وہ مرورِ زمانہ کے بعد، حق نہیں ہو سکتی۔'' [۲]

الغرض، سنت اللہ کا قرآنی مفہوم، بقول پرویز صاحب ''قانون مکافات عمل'' اور بقول طلوع اسلام ''سرکش اقوام کو ان کے باغیانہ اعمال کی پاداش دینا'' ہے، اس مفہوم کی وضاحت کے بعد، یہ حقیقت، از خود، اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ جسے خود، اللہ تعالیٰ نے ''سنت اللہ'' قرار دیا ہے، وہ تو یقیناً ناقابل تغیر و تبدل ہے، لیکن جسے کوئی شخص، از خود اپنی طرف سے، ''سنت اللہ'' قرار دے لے، اس کے ناقابلِ تغیر و تبدل ہونے کی ضمانت نہیں

---

[۱] طلوع اسلام، مارچ ۱۹۴۰ء، صفحہ ۸۳ [۲] طلوع اسلام، مئی ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۸

ہے، بلکہ اس کے بدل جانے کا امکان، تو ہمیشہ اور ہر کہیں موجود ہے، اب ''قوانینِ فطرت'' کو، جبراً اور زبردستی ''سنت اللہ'' قرار دینا، اور پھر اس کے عدمِ تغیر اور غیر متبدل ہونے کو خوارقِ عادات اور معجزانہ امور کے منافی قرار دینا، بناءِ فاسد علی الفاسد کے ہی مترادف ہے۔

معجزات کی حقیقت کو سمجھ لینے میں، منکرینِ حدیث کے لیے، جو چیز رکاوٹ قرار پاتی ہے، وہ سنت اللہ کا یہی غلط مفہوم ہے، اسی غلط مفہوم کی بنیاد پر ہر معجزہ کی تردید و انکار میں، اُن کی آخری دلیل یہی ہوتی ہے کہ...... ''یہ خلافِ سنت اللہ ہے، اللہ کے عمومی قاعدے کے منافی ہے، قرآن نے کہیں بھی اس سنت اللہ میں استثناء پیش نہیں کیا وغیرہ وغیرہ......''

(۳) عادت اور قدرت:

منکرینِ معجزات کی طرف سے، عامۃ الناس کی آنکھوں میں جو دھول جھونکی جاتی ہے، اس کی ایک صورت، الفاظ کے مفاہیم و مدلولات میں خلط مبحث سے کام لینا بھی ہے۔

ایک کام، اگر دائمی طور پر، ایک انداز میں ہو رہا ہے، اور اس میں استمرار کی خاصیت پائی جاتی ہے، تو اسے جس ضابطہ کے تحت انجام دیا جا رہا ہے، اسے ''قانون عادت'' کا نام تو دیا جا سکتا ہے، لیکن اس سے آگے بڑھ کر، اس فعلِ مستمر کو ''دائمی قانونِ قدرت'' اور اس عادتِ جاریہ کو ''مستقل قانونِ فطرت'' قرار دینا، اور پھر یہ خیال کرنا، کہ اس قانون کے خلاف، دنیا میں، کچھ ہو ہی نہیں سکتا، ایک بیجا دعویٰ ہے۔ وہ لوگ، جو بزعمِ خویش، ''قانونِ قدرت'' یا ''قانونِ فطرت'' کا بہت وسیع مطالعہ رکھتے ہیں، وہ اگر کسی چیز کو، روزمرہ کے معمول سے ذرا سا بھی مختلف پاتے ہیں، یا ''قانون عادت'' سے کچھ بھی ہٹا ہوا دیکھتے ہیں، تو فوراً یہ دعویٰ کر دیتے ہیں کہ یہ امر ''قانونِ قدرت'' کے خلاف ہے، ''قانون قدرت'' کا لفظ تو بڑا مرعوب کن ہے، مگر اس لفظ سے، جس مفہوم کو ادا کیا جاتا ہے، وہ اس لفظ کی صحیح تعبیر نہیں ہے، فی الحقیقت، جسے یہ لوگ، ''قانونِ قدرت'' کہتے ہیں، وہ، دراصل ''قانونِ عادت'' ہے، جسکی سوءِ تعبیر سے انسان، خود بھی راہِ راست سے بھٹکتا ہے اور دوسروں کو بھی

بھٹکا تا ہے۔

''قدرت'' اور ''عادت''...... یہ دو الفاظ ہیں، جن کا فرق، ان کے سادہ مدلول ہی سے واضح ہے، ایک ہے کام کی قدرت (یعنی کر سکنا)، اور ایک ہے اس کی عادت (یعنی کرتے رہنا)۔ دونوں بالکل الگ الگ چیزیں ہیں۔

ہر شخص، خود بخود، اپنے متعلق یہ محسوس کرتا ہے کہ خورد و نوش، لباس، سواری اور معاشرت کے متعلق، جو امور، اسکی عادت میں داخل ہیں، اور جنہیں وہ ہمیشہ کرتا رہتا ہے، وہ ان کے خلاف پر بھی قادر ہے، اگرچہ ان کے خلاف، عمل کرنا، اُسکی عادت میں داخل نہیں ہے، اس طرح، جو لوگ، خدا کی ہستی اور اس کی قدرت کے قائل ہیں، اور اسے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ اور یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ کی صفات سے متصف مانتے ہیں، وہ خدا کی قدرت کو صرف اُنہی امور تک محدود تسلیم نہیں کرتے، جو عادتاً اور معمولاً کائنات میں وقوع پذیر ہوتے رہتے ہیں۔ اہل ایمان، خدا کی قدرتِ مطلقہ پر ایمان رکھتے ہوئے بھی، یہ ضروری نہیں سمجھتے کہ جو کچھ خدا کر سکتا ہے وہ سب کچھ کر ہی ڈالے، اور جو کچھ وہ کر رہا ہے، اس کو بار بار، اُسی طرح اور ہمیشہ کرتے ہوئے، دیکھ کر، وہ اس غلط فہمی میں بھی مبتلا نہیں ہوتے کہ خدا کی قدرت، بس، ''قانونِ عادت'' تک ہی محدود ہے۔ الغرض، خدا کی قدرت اور عادت کو مترادف ثابت کرنے کی کوئی دلیل کسی کے پاس نہیں ہے، بلکہ ایسے دلائل موجود ہیں، جو ''قدرت'' اور ''عادت'' کے فرق و تفاوت کو بخوبی واضح کر دیتے ہیں۔

ہم اس قادرِ مطلق کی یہ عادت برابر دیکھتے چلے آ رہے ہیں کہ وہ بچہ کو بحالت جنین، رحم مادر میں پالتا ہے، اور پھر بتدریج نشو و نما دیکر مکمل انسانی صورت عطا کرتا ہے، پھر بصورت طفل، اسے رحم مادر سے نکالتا ہے، چنانچہ ہم نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ کوئی انسان، یونہی آسمان سے گرا دیا گیا ہو، یا زمین سے اگ آیا ہو، اور یہ بھی ہم جانتے ہیں کہ ہر بچہ، جو پیدا ہوتا ہے، وہ اختلاط مرد و زن کا نتیجہ ہوتا ہے، یہ ایک مسلسل عادی امر ہے، جو ہمارے مشاہدہ میں آتا ہے، مگر اللہ تعالیٰ اس پر بھی قادر ہے کہ وہ اس ''عادت مستمرہ'' کے خلاف، مرد و زن

کے ملاپ کے بغیر یا رحم یا نطفہ کے توسط کے بغیر بھی انسان پیدا فرما دے، اسی طرح، یہ بھی ایک عادی امر ہے، کہ آگ جلاتی ہے، لیکن اگر کبھی کسی مصلحت سے، اس عادت سے مختلف کوئی معاملہ ظاہر ہو جائے، جس میں آگ موجود ہوتے ہوئے بھی جلانے کا فعل انجام نہ دے، اور آگ کی تحریقی قوت ختم یا سلب ہونے کے بعد، اس میں حرارت کی جگہ برودت پیدا ہو جائے، تو یہ بات، نہ تو اللہ کی قدرت سے خارج ہے اور نہ ہی بعید از عقل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ایک مخصوص دائمی عادت کو دیکھ کر، یہ نتیجہ نکالنا کہ اس دائمی عادت کے ضابطہ نے، اللہ تعالیٰ کو ایسا جکڑ بند کر ڈالا ہے، کہ وہ کسی بھی مصلحت و حکمت کے تحت، ایک لمحہ کے لیے بھی، ان اسباب و وسائل کے سلسلہ سے الگ ہو کر، کوئی چھوٹے سے چھوٹا کام کرنے سے بھی عاجز، بے بس اور مجبور ہو گیا ہے، ایک غلط استنتاج ہے، اور ایسا غلط استنتاج، ہستی باری تعالیٰ پر مستحکم ایمان رکھنے کی بجائے، محض، ان ''قوانین فطرت'' پر پختہ اعتقاد و یقین کے باعث ہے جنہیں انسان نے بطور خود، اس لیے سنت اللہ قرار دے رکھا ہے، تاکہ معجزات کے انکار کی راہ ہموار کی جا سکے۔

(۴) قانونِ علت و معلول:

قوانینِ فطرت پر اندھے اعتقاد ہی کا ایک پہلو یہ ہے کہ انسان، قانونِ علت و معلول کے ساتھ، اس قدر مبالغہ آمیز راسخ الاعتقادی اور عملی وابستگی اختیار کرتا ہے کہ اس قانون کے خالق کی ہستی، پسِ منظر میں چلی جاتی ہے اور فکر و نظر کا تمام تر محور و مرکز، یہی قانونِ علت و معلول ہی بن کر رہ جاتا ہے۔ کائنات میں، جو کچھ ہوتا ہے، اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا ہے۔ کہ وہ علل و اسباب کے تحت واقع ہوتا ہے، ہستیٔ باری تعالیٰ کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں ہے، اس طرح نہ تو خدا پر ایمان ہی برقرار رہتا ہے اور نہ ہی اسباب و علل کے پیچھے خدا کا مخفی ہاتھ کارفرما نظر آتا ہے۔ یہ ہے اس قانون کے ساتھ مبالغہ آمیز شغف کا نتیجہ، جس کا اقرار و اعتراف، خود پرویز صاحب نے بھی کیا ہے۔

''عصرِ رواں کے جدید تعلیم یافتہ طبقہ کو اس کا احساس ہوا کہ ''تن بہ تقدیر'' کا

نظریۂ حیات، بڑا تباہ کن ہے، احساس نیک تھا، لیکن چونکہ صحیح تعلیم سامنے نہ تھی، اس لیے یہ اٹھے تو دوسرے کنارے کی انتہا تک جا پہنچے، یورپ کی مادہ پرستی، ان کے قلوب واذہان کو اس قدر متاثر کر چکی تھی، کہ انہوں نے سمجھ لیا کہ جو کچھ ہوتا ہے علل واسباب کے تحت ہوتا ہے، خدا کا اس میں کوئی دخل نہیں، پہلا طبقہ غلطی پر تھا، تو قوتِ عمل سے عاری ہو چکا تھا، اس دوسرے طبقے نے بزعم خویش اصلاح کی تو خدا پر ایمان ہی جاتا رہا۔'' [۱]

خدا پر صحیح ایمان، اور اس کے عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ قَدِیْر ہونے کا اعتقاد، اگر پختہ اور مستحکم ہو، تو قانونِ علت ومعلول، خود بخود اپنے ٹھیک اور اصل مقام پر متعین ہو جاتا ہے، سلسلۂ علت ومعلول، فی الواقع، ایک ''قانونِ عادت'' ہے، لیکن اللہ کی قدرت، کسی حکمت ومصلحت سے، ''قانونِ عادت'' سے ہٹ کر بھی، کوئی امر واقع کر سکتی ہے، خود پرویز صاحب، فرماتے ہیں۔

''ہم عالمِ اسباب میں دیکھتے ہیں کہ جب تک علت موجود نہ ہو، معلول پیدا نہیں ہو سکتا، یعنی بھاپ پیدا نہیں ہو سکتی، جب تک پانی اور آگ موجود نہ ہو، لیکن اللہ تعالیٰ، اپنے معاملات میں اسباب وعلل کا محتاج نہیں، وہاں ہر شے، ارادے کے ساتھ ہی وقوع پذیر ہو جاتی ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنٰهُ اَنْ نَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ ۝ (۱۶/۴۰)

''ہم جب کسی چیز کے متعلق ارادہ کرتے ہیں تو ہمارا قول فقط اتنا ہوتا ہے کہ ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتی ہے۔'' [۲]

الغرض، وہ قادر مطلق اور فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ ہے، وہ جب چاہے، سبب کو بغیر مسبب کے اور مسبب کو بغیر سبب کے پیدا فرما دے، مثلاً آگ موجود ہو اور نہ جلائے، یا کوئی چیز جل جائے بغیر اسکے کہ آگ موجود ہو۔ یقیناً، آگ سے جلانا، اللہ کی عادت تو ہے، لیکن کسی

---

[۱] معارف القرآن، جلد۱، صفحہ ۳۱۰ تا صفحہ ۳۱۱ [۲] معارف القرآن، جلد۱، صفحہ ۳۱۲

اہم تر مصلحت کے تحت وہ خلاف عادت، امر ظاہر کرنے پر بھی قادر ہے، اس لیے سبب اور مسبب اور علت و معلول کے تمام سلاسل کو کسی ایسی حد پر ختم کرنا، ایمان باللہ کا ناگزیر تقاضا ہے، جہاں خلاقِ عالم کا دستِ قدرت، اسباب و وسائط کو نظر انداز کر کے واقعات و حوادث کو وقوع پذیر کرتا ہے، اور قرآن فی الواقعہ ایسے ہی خدا کا تصور پیش کرتا ہے، نہ کہ ایسے خدا کا جو خود اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کے ہاتھوں، جکڑ بند ہو کر رہ گیا ہو۔

قرآن کا تصوّرِ خدا......اسباب وعلل سے بالاتر، نہ کہ ان کا غلام:

انسانی ارادہ، زبان، ہونٹ، اور دیگر اعضاء، جو اثنائے گفتگو میں عادتاً استعمال ہوتے ہیں، یہ سب کلام و گفتگو کے اسباب و وسائط اور علل ہیں، جن کے نتیجہ میں معلول یعنی کلام و گفتگو واقع ہوتا ہے، قرآن بیان کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس پر قادر ہے کہ گفتگو کے جملہ اسباب وعلل صحیح و سالم موجود ہوں، لیکن ان کا نتیجہ یعنی معلول بصورت کلام و گفتگو ظاہر نہ ہو، یا یہ کہ کلام و گفتگو، بطور معلول واقع ہو جائے بغیر اس کے کہ انسانی ارادہ، زبان، ہونٹ اور دیگر معروف اعضاء (جو دوران گفتگو عادتاً مستعمل ہوں) موجود ہوں، جیسا کہ قرآن کہتا ہے کہ:

حَتّٰى إِذَا مَا جَآءُوْهَا شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ وَ اَبْصَارُهُمْ وَجُلُودُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ۝ وَقَالُوا لِجُلُودِهِمْ لِمَ شَهِدتُّمْ عَلَيْنَا قَالُوا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىْ اَنْطَقَ كُلَّ شَىْءٍ (حم السجدہ — ۲۰-۲۱)

’’جب سب وہاں آ جائیں گے تو ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے جسم کی کھالیں ان پر گواہی دیں گی کہ وہ دنیا میں کیا کچھ کرتے رہے ہیں۔ وہ اپنے جسم کی کھالوں سے کہیں گے، ’’تم نے ہمارے خلاف کیوں گواہی دی؟‘‘ وہ جواب دیں گی ’’ہمیں اسی خدا نے گویائی دی ہے، جس نے ہر چیز کو گویا کر دیا ہے۔‘‘

یہ آیت، کلام و گفتگو (معلول) کے وقوع کا اثبات کر رہی ہے بغیر اسکے کہ، زبان، ہونٹ اور دیگر اعضاء (اسباب و علل) موجود ہوں، اس کے بعد، پھر سنئے اور دیکھئے کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے:

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْۤ اٰیَةً قَالَ اٰیَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَیَّامٍ اِلَّا رَمْزًا وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِیْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ (اٰل عمران — ۴۰-۴۱)

''اُس (زکریا) نے کہا ''پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا؟ میں تو بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے'' جواب ملا ''ایسا ہی ہوگا، اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے''، عرض کیا ''مالک! پھر کوئی نشانی میرے لیے مقرر فرما دے'' کہا ''نشانی یہ ہے کہ تم تین دن تک لوگوں سے، اشارہ کے سوا، بات چیت نہ کرو گے (یا نہ کر سکو گے)، اس دوران، اپنے رب کو بہت یاد کرنا، اور صبح و شام اسکی تسبیح کرتے رہنا۔''

اِن آیات کی رو سے، قانون علت و معلول سے ہٹ کر، اللہ تعالیٰ نے، دو امور سر انجام دیئے ہیں۔

اولاً...... یہ کہ، حضرت زکریاؑ کا بڑھاپا اور ان کی بیوی کا بانجھ پن، دونوں امور ''قانونِ عادت'' کی رو سے اولاد پیدا کرنے سے قاصر ہیں، گویا اسباب و وسائط کی دنیا میں، علت کا کوئی پہلو بھی موجود نہیں ہے کہ معلول واقع ہو سکے، لیکن اسی ''قانون عادت'' سے ہٹ کر، انہیں، اسی حالت میں بشارتِ پسر سے نوازا جاتا ہے۔ یہ صریحاً ایک معجزہ ہے (اس پر تفصیلی گفتگو آگے آ رہی ہے)۔

ثانیاً......نشانی یہ طے کی جاتی ہے کہ بھلے چنگے اور صحتمند و تندرست ہونے کے باوجود بھی حضرت زکریا علیہ السلام، اسبابِ گفتگو اور عللِ کلام رکھتے ہوئے بھی، لوگوں سے گفتگو

نہ کر پائیں گے، یعنی علت موجود ہے لیکن معلول بصورت گفتگو معدوم ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے نظام کائنات کو جو سلسلۂ علت و معلول سے وابستہ کر رکھا ہے، تو یہ "قانون عادت" ہے، لیکن وہ اس قانون سے ہٹ کر بھی کچھ کرنا چاہے تو اس کے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں، وہ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيدُ اور قادر مطلق ہے۔

کیا اللہ، عالمِ دنیا میں یفعل ما یشاء اور یحکم مایرید کے اختیار سے محروم ہے؟:

یہاں ایک اور بات بھی قابل غور ہے، پرویز صاحب کے نزدیک، اس کائنات کے تین گوشے ہیں جیسا کہ خود انہوں نے "اسلام کیا ہے؟" کے صفحہ ۸۲ تا صفحہ ۸۵ پر وضاحت کی ہے۔

پہلے گوشے کو وہ "عالم مشیت" یا "عالم امر" قرار دیتے ہیں، اس گوشے میں، کوئی قانون، ضابطہ یا کوئی سلسلۂ علت و معلول نہ تھا، یہ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيدُ کا دائرۂ عمل تھا۔

دوسرے گوشے کو وہ "عالم دنیا" کہتے ہیں، اور یہی وہ دنیا ہے جس میں قانون و ضابطہ کی حکمرانی قائم ہے، خدا کا وہ امر، جو گوشۂ اول میں پابندِ ضوابط نہ تھا، اب وہ ضابطوں میں گھر گیا، انہی قوانین و ضوابط کو، بقولِ پرویز صاحب، سنت اللہ کہا جاتا ہے جو نا قابل تغیر و تبدل ہیں۔

تیسرا گوشہ، "انسانی دنیا" سے متعلق ہے، (اسے ہم فی الحال نظر انداز کیے دیتے ہیں، کیونکہ ہمارے پیش نظر مقصود کا تعلق، پہلے دو گوشوں ہی سے ہے)۔

پرویز صاحب، گوشۂ دوم کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں

"غور کیجئے کہ وہی خدا، جو (دائرہ اول میں) کہہ رہا تھا کہ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (وہ جو جی میں آئے، کرتا ہے) وَيَحْكُمُ مَا يُرِيدُ (جو کچھ اس کے ارادے میں آئے فیصلہ کرتا ہے)، اب کہہ رہا ہے کہ تم اس کی روش، عادت، سنت

،قانو۔۔۔ں کوئی تبدیلی نہیں پاؤ گے۔'' [۱]

حقیقت یہ ہے کہ اول، تو قرآن، تین گوشہ ہائے کائنات کا ذکر ہی نہیں کرتا، یہ صرف ذہن پرویز کی خلاقی کا کرشمہ ہے۔ پھر کائنات کے ان تینوں گوشوں میں سے، کسی کو (قانون وضابطہ اور علت ومعلول سے بالاتر) عالمِ مشیئت قرار دینا اور کسی دوسرے گوشے کو اس طرح پابندِ ضوابط قرار دینا کہ اللہ تعالیٰ، یفعل ما یشاء اور یحکم ما یرید کی قدرتِ کاملہ سے محروم وتہی دست ٹھہرے، قطعی خلافِ قرآن تصور ہے۔ اور ثانیاً، اگر ان تین گوشہائے کائنات کو مان بھی لیا جائے، تو بھی ''مفکرِ قرآن'' کی یہ بات قطعی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ، صرف پہلے گوشۂ کائنات ہی میں، فَعَّالٌ لِمَا يُرِيْدُ تھا، اور اسکی يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کی صفت، دائرۂ اول ہی سے متعلق تھی، اور گوشۂ ثانی میں یعنی عالمِ دنیا میں، اب وہ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کے اختیار سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے، اور گوشۂ اول میں اس کا امر، عالمِ دنیا میں آ کر پابندِ ضوابط ہو گیا ہے، حالانکہ حقیقتِ نفس الامر، اب بھی یہی ہے کہ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کا جیسا اختیار، پہلے گوشۂ کائنات میں، اللہ تعالیٰ کے ہاں تھا، ویسا ہی اقتدار، ازروئے قرآن، اب بھی عالمِ دنیا میں، اسکے لیے ثابت ہے، اگر ایسا نہ ہوتا تو حضرت زکریا علیہ السلام کے حد سے گزرے ہوئے، بڑھاپے کی حالت میں اور ان کی بیوی کی بانجھ پن کی کیفیت میں، فرزند ارجمند پیدا نہ ہوتا، کیونکہ ولادتِ فرزند کے اسباب وعلل، میاں اور بیوی دونوں میں مفقود تھے، جس کا نتیجہ یہی ہونا چاہیے تھا، کہ معلول (یعنی ولادتِ پسر) وقوع پذیر نہ ہوتا، لیکن علت کی عدم موجودگی میں، معلول کا واقع ہو جانا، اور وہ بھی اسی عالمِ دنیا میں، (نہ کہ عالمِ امر میں)، اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ، قانونِ علت ومعلول کے بعد بھی، يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ اور يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کا اختیار واقتدار رکھتا ہے، اور جیسی قدرتِ تامہ، اسکی عالمِ امر میں تھی، ویسی ہی مقتدرتِ کاملہ، عالمِ دنیا میں بھی موجود ہے، اس حقیقت پر قرآن کی بہت سی آیات گواہ ہیں، صرف دو آیات ملاحظہ فرمائیے، ان میں سے بھی ایک آیت پہلے گزر چکی ہے، کہ جب حضرت زکریا نے،

اللہ کے ہاں سے بشارتِ فرزند پا کر، اپنی حیرت و استعجاب کا یوں اظہار کیا کہ ''میرے پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میں بڑھاپے میں حد سے گزر چکا ہوں اور میری بیوی بھی بانجھ ہو چکی ہے''، تو اللہ تعالیٰ نے جواباً ارشاد فرمایا:

كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ (آل عمران – ۴۰)

''اسی طرح، (ایسا ہی ہوگا) اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔''

اس آیت سے واضح ہے کہ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کا اختیارِ ایزدی اور اقتدارِ الٰہی، اسی ''عالمِ دنیا'' میں کارفرما ہوا ہے۔

رہی دوسری آیت، جو موقفِ پرویز کے بطلان پر شاہدِ عدل ہے، تو وہ درج ذیل ہے:

يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اَوْفُوا بِالْعُقُوْدِ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّى الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ (المائدہ – ۱)

''اے ایمان والو! اللہ کی بندشوں کی پابندی کرو، تمہارے لیے، از قسمِ مویشی سب چرندے حلال کیے گئے، ماسوا ان کے جو تم کو بتائے جاتے ہیں، لیکن بحالت احرام، شکار کو اپنے لیے حلال نہ کر لو، بیشک اللہ جو چاہتا ہے، حکم دیتا ہے۔''

حلت و حرمت کے ضابطوں کی وضاحت کے سلسلہ میں، نیز، اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ پابندیوں کی نگرانی کے سلسلہ میں، احکام خداوندی کی وضاحت کے دوران، اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ کے الفاظ میں مذکور، اختیارِ خداوندی، خود اس بات کی دلیل ہے کہ اِس کا تعلق، اِسی عالمِ دنیا سے ہے (نہ کہ پرویز صاحب کے مزعومہ عالم امر سے)۔

(۵) عادتِ عامہ اور عادتِ خاصہ:

''قانونِ عادت'' کی عام روش سے ہٹ کر، غیر عادی امور کو انجام دینا، اور معمول کی شاہراہ کو چھوڑ کر، غیر معمولی واقعات و حوادث کو ظاہر کرنا، دراصل ''عادت عامہ'' کے

مقابلہ میں، ''عادتِ خاصہ'' کا اظہار ہے، اس طرح عادت کی دو قسمیں ہیں: (۱) عادتِ عامہ، اور (۲) عادتِ خاصہ۔ اول الذکر عادت کا استعمال، ایک تسلسل کے ساتھ، دائماً اور مستقلاً بتکرار واعادہ، بکثرت ہوتا رہتا ہے، جبکہ ثانی الذکر کا ظہور، نادر اور مخصوص اوقات میں، کبھی کبھار ہوتا ہے، دونوں قسم کی عادات کا تجربہ ہمیں روزمرہ زندگی میں بھی، اور خاص اور نادر مواقع پر بھی، بعض اشخاص میں دکھائی دیتا ہے، مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص، بڑا نرم خو، حلیم الطبع اور بردبار ہے، ہزار گالیاں سنکر بھی، اور اشتعال دلائے جانے پر بھی، اسے غصہ نہیں آتا، لیکن اس کے باوجود، کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جب کبھی دین پر حملہ ہو، یا اس کے سامنے، پیغمبرِ اسلام، علیہ الصلوٰۃ والسلام، کی ادنیٰ سی توہین بھی کیجائے، تو اس وقت، وہ غصہ سے بے تاب ہو کر، آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔ ایسے موقع پر، اس کی سخت گیری اور درشتی، اگرچہ اس کی عام عادت (تحمل و بردباری اور عفو و درگزر) کے مخالف ہے لیکن یہ بھی، بہر حال، اس کی خاص اور مستقل عادت ہے، جس کے ظہور کا موقع، گاہ بگاہ، اس کے اسباب مہیا ہونے پر، ملتا رہتا ہے، اللہ تعالیٰ کے بارے میں، مخصوص احوال و امکنہ میں، اسکی خاص صفات کا ظہور پذیر ہونا، خود پرویز صاحب کو بھی مسلم ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ:

> ''یہ حقیقت کہ خاص حالات میں، خدا کی ایک خاص صفت کا ظہور ہوتا ہے، قانونِ خداوندی کہلاتی ہے۔'' [۱]

جس چیز کو، ہم معجزہ کہتے ہیں، وہ بھی، دراصل، اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فعل ہے، جو اگرچہ اسکی عام عادت کے خلاف ہی ہو، مگر اس کی ''عادتِ خاصہ'' کے خلاف نہیں ہوتا، بلکہ اس کے عین مطابق ہوتا ہے، کیونکہ خاص اوقات میں، مخصوص مصالح کی بناء پر، عام عادت کو ترک کر کے، خوارق و معجزات کا ظاہر کرنا، اللہ تعالیٰ کی ''عادت خاصہ'' ہی کا نتیجہ ہوتا ہے۔

سلسلۂ اسباب و علل کا قائم رکھنا، اگرچہ، اللہ تعالیٰ کی عام عادت ہے، لیکن بارہا یہ بھی

---

[۱] طلوعِ اسلام، جولائی ۱۹۵۸ء، صفحہ ۲۵

تجربہ ہو چکا ہے کہ جب سفراء اور مقربین کی تصدیق کرانا، مقصود ہو، تو ان کے ہاتھوں پر، وہ، غیر معمولی علامات ظاہر کرتا ہے، جس سے دنیا سمجھ لے کہ بیشک یہ اس کے سفیر اور مقرب و معتمد ہیں، جنکے دعویٰ کی تصدیق کے لیے، وہ، خلافِ معمول، ایسی چیزیں پیش کر کے، ساری مخلوق کو، اس کی مثل لانے سے عاجز کر دیتا ہے، اور ایسا ہونا بھی چاہیئے، عقل اور فطرت، اس کی مقتضی ہے کہ خدائے قدوس، اپنے خاص وفادار بندوں کے ساتھ، وہ معاملہ کرے جو دوسرے افراد سے نہ ہو، اس پہلو سے دیکھا جائے تو معجزہ، خلاف فطرت نہیں، بلکہ عین مقتضائے فطرت قرار پاتا ہے، جس کا عدم ظہور، خلافِ حکمت کام ہوگا، حکمت کا یہ تقاضا ہے کہ وہ لوگ، جو اپنی جان، مال، عزت و آبرو، الغرض، ہر چیز معرضِ خطر میں ڈال کر، اللہ رب العزت ہی کے لیے، اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، اور خود خدا ہی ان سے دعویٰ کرواتے ہوئے، اپنا کلام، اُن کے منہ میں ڈالتا ہے کہ...... ''آج تم سب کی نجات، میری اتباع میں مضمر ہے''...... اُن کے حق میں ضروری ہے کہ اُن کی وجہ سے ''عام عادت'' سے بالاتر کارنامے، خدا کی قدرت سے ظاہر ہوں، جو کہ تمام دنیا کو اپنی نظیر پیش کرنے سے قاصر کر دیں، اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

معجزاتِ انبیاء اور قرآن کریم:

قرآن کریم، بہت سے انبیاء کے معجزات کا ذکر کرتا ہے، معجزات کا یہ قرآنی تذکرہ، منکرینِ معجزات کے لیے بہت پریشان کن ہے، کیونکہ قوانینِ فطرت پر ان کا اندھا اور مبالغہ آمیز اعتقاد، ان کے ذہن کا جو سانچہ تشکیل کر چکا ہے، اس میں، ان قوانین سے ہٹ کر، واقع ہونے والے خوارق و معجزات، راست نہیں بیٹھتے، اس لیے وہ معجزات کو پیش کرنے والی آیات کی ایسی تاویل بلکہ تحریف کرنے پر جت جاتے ہیں، جس سے وہ خوارقِ عادت امور، عام عادی واقعات بن کر رہ جائیں، اور جہاں کہیں ایسا ممکن نہیں ہو سکا، وہاں اپنی نکتہ آرائیوں اور سخنسازیوں کی آڑ میں، وہ بحث کا ایسا رخ اختیار کرتے ہیں جس سے معجزات کا اصل مبحث، صرفِ نظر کا شکار ہو جاتا ہے اور بات، اصل ٹھکانے سے دور ہو جاتی

ہے۔

اس موقعہ پر چاہیئے تو یہ کہ قرآن کریم کی روشنی میں، جملہ معجزاتِ انبیاء کرام کو واضح کیا جائے، اور اس کے ساتھ، منکرینِ حدیث کی حد تحریف کو پہنچی ہوئی، ان تاویلات پر بھی نظر ڈالی جائے، جو ان خوارقِ عادت امور کو، عام عادی امور اور قوانین فطرت کے تحت رونما ہونے والے معمول کے عام واقعات ''ثابت کرنے'' کے لیے کی گئی ہیں، لیکن چونکہ مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی مرحوم اور ان کے ''ناقد و معترض'' صاحب نے، اپنی کتاب میں ''ولادتِ مسیح'' تک ہی اپنی بحث کو محدود رکھا ہے، اس لیے ہمارے قلم کی جولان گاہ بھی اسی دائرے تک محدود ہوگی۔

☆..........☆..........☆

باب دوم

تذکرۂ ولادتِ افرادِ ثلاثہ

(سورۃ آل عمران کی روشنی میں)

سورۂ آل عمران میں، قرآن کریم نے تفصیل کے ساتھ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تذکرہ فرمایا ہے، لیکن اس سے قبل، حضرت مریم اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا ذکرِ ولادت بھی موجود ہے۔ ان تینوں ہستیوں میں سے، ترتیب کے لحاظ سے، حضرت مریم کا ذکر سب سے پہلے، اس کے بعد حضرت یحییٰ کا، اور پھر آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا تذکرہ ہے، جبکہ سورہ مریم میں، ولادتِ مریم کا ذکر نہیں ہے، لیکن باقی دونوں حضرات کا ذکرِ پیدائش موجود ہے، اور ان میں وہی ترتیب پائی جاتی ہے، جو سورہ آل عمران میں موجود ہے۔

ہم ان حضراتِ ثلاثہ کے حالات کو، تاریخی ترتیب کی بجائے، قرآنی آیات ہی کی ترتیب کے پیشِ نظر بیان کر رہے ہیں تاکہ ہر آیت کی توضیح و تشریح میں، پرویز صاحب، طاہر سورتی صاحب اور ''صاحبِ کتاب'' میں سے، ہر ایک کا موقف، قارئین کرام کے سامنے آتا رہے۔

☆............☆............☆

قصۂ اولیٰ

ذکرِ ولادتِ مریم علیہا السلام

قرآن کریم میں، خواتین میں سے، جس قدر تفصیلی تذکرہ، حضرت مریمؑ کا آتا ہے، کسی اور عورت کا نہیں آتا۔ یہود و نصاریٰ دونوں نے، ان کے بارے میں، افراط و تفریط کا رویہ اپنایا۔ یہود نے جنہیں قرآن، **مغضوب علیھم** قرار دیتا ہے، حضرت مریم کی شانِ اقدس کے منافی، ایسے ایسے بہتان تراشے، کہ جنہیں نقل کرنا بھی، سلیم الفطرت شخص پر گراں گزرتا ہے۔ یہودِ بے بہبود نے، ایک طرف، حضرت مریم کی پاکدامنی پر، زبانِ طعن دراز کرتے ہوئے، ان کے فرزند ارجمند حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، نقلِ کفر، کفر نباشد) ناجائز تعلقات کی پیداوار قرار دیا، تو دوسری طرف، خود نصاریٰ نے، جنہیں قرآن ضالّین کہتا ہے، افراط کی طرف بڑھتے ہوئے، اُنہیں خدا کا بیٹا، بلکہ خود خدا بنا ڈالا۔ اس بناء پر، قرآن کریم نے، نہ صرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذاتی حالاتِ حیات، اور ان کی پیدائش کو تفصیل سے بیان کیا، بلکہ ان کی والدہ ماجدہ، حضرت مریم کی ولادت کو بھی اطناباً بیان کیا ہے، تاکہ یہود و نصاریٰ، دونوں کی گمراہیوں کا سدباب کر دیا جائے۔

چونکہ قرآن مجید کے پیشِ نظر، سب سے پہلے، حضرت مریم کی عفت و پاکدامنی کا اثبات ہے، اس لیے سورۂ اٰل عمران میں، ولادتِ عیسیٰ سے قبل، ولادتِ مریم کو بیان کیا گیا ہے، اس کا آغاز، آیت ۳۳ سے ہوتا ہے، جہاں سے اہل کتاب اور بالخصوص نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے۔

آیت ۳۳-۳۴/۳:

اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰۤی اٰدَمَ وَ نُوۡحًا وَّ اٰلَ اِبۡرٰہِیۡمَ وَ اٰلَ عِمۡرٰنَ عَلَی الۡعٰلَمِیۡنَ ذُرِّیَّۃًۢ بَعۡضُہَا مِنۡۢ بَعۡضٍ وَ اللّٰہُ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ

''اللہ تعالیٰ نے آدمؑ، نوحؑ، آل ابراہیم اور آل عمران کو، تمام جہانوں میں

شرفِ برگزیدگی بخشا۔ یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں، اور اللہ سننے اور جاننے والا ہے۔''

آدم، نوح اور ابراہیم علیہم السلام، سلسلۂ نبوت و رسالت کے اساطین وعمائد ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذکر کے ساتھ، ان کے آل کے ذکر میں، نبی اسرائیل اور بنی اسماعیل کی دونوں شاخوں کے پیغمبروں کا ذکر آ گیا، جن میں سے اول الذکر شاخ کے آخری نبی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں، اور مؤخر الذکر شاخ میں خاتم الانبیاء، حضرت محمد ﷺ شامل ہیں۔ آل عمران، یہاں خاص اہمیت رکھتا ہے، کیونکہ یہی وہ مبارک خاندان ہے، جس میں حضرت مریم کی اور پھر ان کے بطن سے حضرت عیسیٰ کی ولادتِ باسعادت ہوئی۔ عمران، حضرت مریم کے والد کا اسم گرامی ہے، جو حضرت عیسیٰ کے نانا ہیں۔ اس سارے شجرہ کے ذکر سے مقصود، اس حقیقت کا اظہار ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی نبوت و رسالت کے اس سلسلہ کی ایک کڑی ہیں، جس کا آغاز، آدم علیہ السلام سے ہوا تھا۔ یہ سارے خاندان (جس کے آخر میں، اُسرۂ عمران بھی شامل ہے) باہم دگر وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کی ذُرّیّت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اسی خاندان میں سے اٹھے ہوئے، ایک شخص کو اِلٰہ بنا ڈالنے کے کیا معنیٰ؟

وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ میں یہ حقیقت ظاہر کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو بھی، مقام نبوت و رسالت پر فائز کیا ہے، اُن کا انتخاب، تمام تر، اللہ تعالیٰ کے علم و سمع پر موقوف ہے، نہ کہ کسی خاندان کے ذاتی شرف و نجابت پر، جیسا کہ بزرگی میں مبتلا لوگوں کا شیوہ ہوا کرتا ہے۔ لیکن اس جملہ کا تعلق، اگلی آیت سے بھی ہو سکتا ہے، جس میں آل عمران کے شجرہ کی وضاحت کے بعد، ولادتِ مریم کا ذکر، بایں الفاظ کیا گیا ہے۔

آیت ۳۵/۳:

اِذْ قَالَتِ امْرَءَةُ عِمْرَانَ رَبِّ اِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّيْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ.

''اور (وہ وقت بھی یاد کرو) جبکہ عمران کی بیوی نے دعا کی ''خدایا! جو کچھ میرے پیٹ میں ہے، وہ تیرے لیے نذر کرتی ہوں، میری طرف سے قبول فرما۔ بیشک تو (دعاؤں کو) سننے والا (اور نیتوں کو) جاننے والا ہے۔''

والدۂ مریمؑ، جو نہایت پاکباز اور پاک دل اور پرہیزگار و نیک طینت تھیں۔ ان کی نیکیوں کی طرف رغبت کے کیا ہی کہنے۔ وہ پیٹ میں پلنے والے بچے کو، قبل از ولادت ہی، اللہ کے حضور، بطور نذر پیش کر رہی ہیں، جس کے متعلق ان کا گمان یہ تھا کہ وہ لڑکا ہوگا۔ اس نذر کا مفہوم، والدۂ مریم کے نزدیک کیا تھا؟ اور معاشرہ اسے کیا سمجھتا تھا؟ اس پر روشنی آئندہ ابواب میں ڈالی جائے گی۔ یہاں تو صرف یہ دیکھئے کہ پاکیزہ دل و دماغ میں مچلنے والی حسین آرزوؤں اور خوبصورت تمناؤں کے ساتھ، نذر کرنے والی والدۂ مریمؑ پر، بالآخر، وہ مرحلہ بھی آ گیا۔

آیت ۳/۳۶:

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّی وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی وَاِنِّی سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَاِنِّیٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ .

''جب اس نے بچی کو جنم دیا تو عرض کیا ''پروردگار! میرے ہاں تو بچی ہوئی ہے......'' اللہ خوب جانتا ہے جسے اس خاتون نے جنم دیا ہے ...... اور لڑکا لڑکی کے مانند تو نہیں ہوتا۔ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے، اور میں اسے اور اس کی اولاد کو شیطانِ رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔''

اِنِّی وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی کے الفاظ، والدۂ مریم کے اس تردد کا مظہر ہیں، جو توقع کے خلاف لڑکی پیدا ہونے پر، انہیں لاحق ہوا، کیونکہ انہوں نے منت مانی ہی اس توقع پر تھی کہ اُن کے ہاں بیٹا پیدا ہوگا، لیکن جب خلافِ توقع بیٹی پیدا ہوئی، تو والدۂ مریم کے قلبی احساسات، وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰی کے الفاظ میں ڈھل گئے، کہ کہاں وہ لڑکا، جو مطلوب

متوقع تھا، اور کہاں یہ لڑکی، جو وجود میں آئی۔ یہ لڑکی، اُس پسرِ مقصود کا بدل تو نہیں ہو سکتی۔ تاہم، اے میرے پروردگار! فَتَقَبَّلْ مِنِّی. گر قبول افتد زہے عزو شرف - . نہ میں اُس دستور کو تو جانتی ہی ہوں، جس کے تحت منذور صرف لڑکے ہی ہوا کرتے ہیں، لڑکیاں نہیں ہوا کرتیں۔ اس کے بعد والدہ مریم وَاِنِّي اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ کے الفاظ میں دعاء مانگتی ہیں۔ جس کا مقصود یہ بتانا ہے کہ جس لڑکی اور پھر اس کی اولاد کے لیے، یہ دعا مانگی جا رہی ہے، اور جس بیٹی کو، بحضور رب العزت، نذر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے، عمران کی بیوی کو اس درجہ احساس کمتری لاحق ہوتا ہے، اُسی کو نصاریٰ، بعد میں، خدا کی ماں، بلکہ خود خدا قرار دے ڈالتے ہیں۔ اس ساری سرگذشت کے بیان کا مقصد یہ ہے کہ واقعات کی اصل نوعیت کو سامنے لا کر، یہ واضح کر دیا جائے، کہ کس طرح سیدھے سادے واقعات کو، افسانہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

آیت ۳/۳۷:

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّ اَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّ كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ.

''پھر اس کے رب نے اسے پسندیدگی کے ساتھ شرف قبولیت بخشا، اور عمدگی کے ساتھ پروان چڑھایا، اور زکریا کو اس کا کفیل بنایا، جب بھی زکریا محراب میں، اس کے پاس جاتا، وہاں رزق پاتا۔ اس نے پوچھا ''اے مریم! یہ رزق تمہیں کہاں سے ملتا ہے؟'' اس نے کہا ''اللہ کے ہاں سے، بیشک اللہ جسے چاہے، بے حساب دیتا ہے۔''

والدہ مریم کو، نومولود کے لڑکی ہونے کا جو احساس تھا، اس کے برعکس، اللہ تعالیٰ نے اپنے حسنِ قبولیت سے انہیں نوازا، اور ان کی تمام عقلی صلاحیتیں، بدنی قوتیں اور روحانی

استعدادیں خوب پروان چڑھیں۔ اس پر مستزاد یہ فضل خداوندی کہ ان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری حضرت زکریا کو سونپی گئی، جو اُن کے رشتہ دار بھی تھے، اور وہ بیت المقدس کے سربراہوں اور سرپرستوں میں ممتاز حیثیت کے مالک بھی تھے۔

کفالتِ زکریاؑ:

حضرت زکریاؑ، حضرت مریمؑ کے کفیل کس طرح بنے؟ یہ ایک وضاحت طلب امر ہے۔ حضرت مریمؑ، ایک معزز اور ممتاز خاندان کی چشم و چراغ تھیں، ان کے والد، بیت المقدس کے امام اور خطیب تھے، اس اعتبار سے خواص وعوام میں، وہ، احترام واکرام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ مریم ابھی بطن مادر ہی میں تھیں کہ والد، دار فانی سے سدھار گئے، والدۂ مریم بھی انتہائی نیک، پارسا اور زاہدہ تھیں۔ دورانِ حمل ہی، والدۂ مریم نے، اس گمان کے تحت، کہ ان کے ہاں لڑکا پیدا ہوگا، اُسے اللہ کے لیے بطور نذر وقف کر دیا، خلافِ توقع بچی پیدا ہوئی، تو انہیں تردد ہوا، کیونکہ لڑکیوں کی نذر کے قبول کرنے کا رواج نہ تھا، اس سلسلہ میں، لڑکوں ہی کو قبول کیا جاتا تھا۔ تاہم چونکہ وہ، بچی کی ولادت سے قبل ہی، یہ فیصلہ کر چکی تھیں کہ جو کچھ بھی، ان کے بطن میں (ما فی بطنی) ہے، اُسے وہ للّٰہِ فِی اللہ نذر کر دیں گی، تا کہ وہ خدمتِ دین اور خدمتِ بیت المقدس کے لیے وقف رہے۔ پھر مریمؑ بچپن ہی سے نہایت عبادتگذار اور انزوا پسند تھیں۔ متانت، سنجیدگی، وقار اور کم گوئی کی صفات سے متصف تھیں۔ اپنی عمر میں قصیر ہونے کے باوجود، شائستہ عادات واطوار میں کثیر تھیں۔ عین ممکن ہے کہ کتبِ سابقہ کی پیشینگوئیوں اور انبیائے گذشتہ کی دی ہوئی خبروں کے سبب، حضرت عیسیٰؑ کی آمد کے ساتھ ساتھ، اُن کی والدہ محترمہ کا تذکرہ بھی لوگوں نے سُن رکھا ہو۔ اِس لیے اس منذورہ کو، اپنی کفالت میں لینا، ہر شخص نے (خواہ اس کا تعلق طبقۂ علماء ومشائخ سے ہو، یا خدام بیت اللہ سے، افراد خاندان سے ہو یا سربرآوردہ اصحاب فضل سے) اپنی سعادت سمجھا ہو، اور اس امر کی پوری پوری کوشش کی ہو، کہ یہ سعادت اسی کے حصہ میں آئے۔ اُن کے مرحوم والد عمران کے ساتھ، لوگوں کی عقیدت بھی اس بات کا محرک

تھی کہ یہ بچی، اُن کی سپرد داری میں آ جائے۔ حضرت زکریاؑ، جو حضرت مریم کے خالو تھے، وہ سب سے بڑھ کر شدید رغبت رکھتے تھے، کہ وہ خود اس منذورہ کے کفیل بنیں، کیونکہ ایک تو ان کی بیوی، حضرت مریم کی سگی خالہ تھی، اور دوسرے، وہ، خود بھی محرومِ اولاد تھے، لیکن ان کی یہ دلیل بھی لوگوں کی نگاہ میں کارگر نہ ہو سکی، چونکہ ہر کوئی کفالتِ مریمؑ کی سعادت کا خواہشمند تھا، اس لیے ان میں اختلافِ رائے ہوا، اور پھر اس اختلاف نے نزاع کی صورت اختیار کر لی، یہاں تک کہ نوبت قرعہ اندازی تک پہنچ گئی، اسی قرعہ اندازی کا ذکر، آگے آیت ۴۴ میں مذکور ہے۔

اللہ کے ہاں سے رزقِ مریمؑ:

حضرت مریمؑ کے پاس، جب بھی حضرت زکریاؑ بحیثیتِ کفیل، اُن کے معتکف یا محراب میں داخل ہوتے، تو فراواں رزق پاتے، اس رزق کے حوالہ سے دو باتوں کی توضیح ضروری ہے۔ اولاً یہ کہ اس رزق سے مراد کیا ہے؟ ثانیاً یہ کہ اس رزق کا ماخذ اور سرچشمہ و ذریعۂ حصول کیا ہے؟

رزق سے مراد؟:

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے کہ اس رزق سے مراد کیا ہے؟ اس کے متعلق، اہل تفسیر میں دو آراء پائی جاتی ہیں، بعض علماء کے نزدیک روحانی رزق ہے، اور بعض دیگر حضرات کے نزدیک مادی رزق مراد ہے۔ جیسا کہ درج ذیل اقتباسات سے ظاہر ہے:

> "رزق سے مراد، یہاں، حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لیے، یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات پر استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیح کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا، بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آرہا ہے کہ حضرت زکریاؑ حضرت مریمؑ کی علم و معرفت کی باتوں

باوجود، اپنے لیے بھی ایسی اولاد صالح کی دعا مانگی۔ ظاہر ہے کہ حضرت زکریاؑ جیسے صاحبِ معرفت کو سیب وانگور والا رزق، اس درجہ متاثر نہیں کرسکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر، اولاد کی دعا شروع کردیں، اس طرح کی باتیں اربابِ کمال کے ہاں، کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریاؑ جیسے صاحبِ کمال ، اگر متاثر ہوسکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزقِ روحانی سے متاثر ہوسکتے تھے، جو خود ان کی اشتہاءِ روحانی کو بھی بھڑکا دے اور جس کو دیکھ کر، وہ بھی عش عش کر اٹھیں، اور جو ان کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کردے کہ کاش، ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔'' [1]

لیکن علماءِ تفسیر کی اکثریت ، اور وہ بھی بہت بڑی اکثریت ، اس معاملہ میں یہ رائے رکھتی ہے:

كلما دخل عليها زكريا حجرتها و مكان عبادتها وجدعندها فاكهة و طعاما ، قال مجاهد : وجد عندها فاكهة الصيف في الشّتاء وفاكهة الشتاء في الصيف. [2]

''جب بھی حضرت زکریاؑ، حضرت مریمؑ کے حجرہ اور اس کی عبادت گاہ میں داخل ہوئے ، اُس کے پاس پھل اور کھانے پاتے۔ امام مجاہدؒ کا قول ہے کہ وہ گرمیوں کے پھل سردیوں میں اور سردیوں کے پھل، گرمیوں میں، اس کے ہاں پاتے۔''

ان دونوں قسم کی آراء میں، علماءِ سلف کی عبارات کی روشنی میں، مولانا عبدالماجد دریا بادی ارشاد فرماتے ہیں:

''دلت الأية على وجود الرزق عندها كل وقت يدخل عليها.....

آیت اس امر پر دلیل ہے کہ جب کبھی حضرت زکریاؑ حضرت مریم کے پاس جاتے ، تو رزق کو موجود پاتے۔ رزقاً ، کھانے پینے کا سامان، مثلاً تروتازہ

---

[1] تدبرِ قرآن، جلد ۲، صفحہ ۸۷

[2] صفوة التفاسير، جلد ۱، صفحہ ۱۹۹

میوے۔"[۱]

آگے چل کر، وہ، تفسیر الکبیر کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

التنکیر فی قوله رزقًا یدل علی تعظیم حال ذالك الرزق كانه قیل رزقًا ای رزق عجیب غریبٌ .[۲]

اللہ کے فرمان وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا میں رزق کا بطور اسم نکرہ کے آنا، اس کی عظمت پر دلیل ہے گویا کہ یہ "عجیب و غریب رزق" ہے۔

اس آیت کی تفسیر میں، مولانا عبدالماجد دریآبادی، خود اپنی طرف سے بھی اور علماء سلف کی طرف سے بھی یہ فرماتے ہیں:

بعض "جدت پسندوں" نے یہاں رزق کے معنٰی فیض اور علم و حکمت کے لیے ہیں، لیکن محققین نے کہا ہے کہ یہ تفسیر کی حدود سے تجاوز کر جانا ہے۔ ابعد من فسر الرزق هنا بانه فیض (بحر) هٰذا شبیه بتفسیر الباطنیة[۳]

یعنی جس نے یہاں رزق کی تفسیر فیض سے کی ہے، وہ بہت بعید از حقیقت ہے (بحر)، ایسی تفسیر، فرقہ باطنیہ کی تفسیر کے مشابہ ہے۔

لیکن بہر حال قرآنی اشارات کی روشنی میں، راجح بات یہی ہے کہ رزق سے مراد، سامانِ اکل و شرب اور بالخصوص غیر موسمی پھل ہیں، جو براہ راست، انہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے (من عند اللہ) ملا کرتے تھے، اور جو فی الواقعہ ایک خارقِ عادت امر ہے۔ اسی خارقِ عادت امر کے مشاہدہ کے ساتھ ہی، حضرت زکریا کا، اپنے بڑھاپے اور اپنی بیوی کے بانجھ پن کے باوجود، اپنے لیے غیر موسمی ثمرِ حیات (فرزند) کے لیے دعا کرنے کی تحریک کا پیدا ہونا بھی سمجھ میں آتا ہے جس کا ذکر اگلی آیت میں آتا ہے۔

رزق کا سرچشمہ اور ذریعۂ حصول:

هٰذا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ کے ضمن میں، دوسرا سوال، سرچشمۂ رزق اور ذریعۂ حصول سے

---

۱ + ۲ تفسیر ماجدی، اردو، صفحہ ۱۳۱ ۳ تفسیر ماجدی، اردو، صفحہ ۱۳۱

تعلق رکھتا ہے، پرویز صاحب، ان الفاظ سے یہ مراد لیتے ہیں کہ رزق کی یہ فراہمی، کسی مافوق الاسباب ذریعہ سے نہ تھی، بلکہ عام انسانی ذریعہ سے تھی، لیکن، بہرحال، یہ انسانی ذریعہ، ہیکل کے بدنیت پجاری نہیں تھے، بلکہ وہ معتقدین اور زائرین تھے، جو بر بناءِ عقیدت، انہیں یہ اشیاءِ خوردونوش بہم پہنچایا کرتے تھے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> حضرت زکریا کے اس قسم کے سوالات سے مقصد یہ معلوم کرنا تھا کہ ہیکل کے پجاریوں میں سے تو کوئی ایسا نہیں جو اس طرح مریم کے قریب آنا چاہتا ہو؟ حضرت مریم بھی ان کے سوال کی لم کو پالیتیں اور انہیں مطمئن کر دیتیں کہ اس قسم کے شبہات اور خدشات کی کوئی بات نہیں، معتقدین اور زائرین، انہیں بر بناءِ عقیدت، یہ چیزیں ''فی سبیل اللہ'' دے جاتے ہیں اس لیے آپ کسی قسم کا وسوسہ دل میں نہ لائیے۔ ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کی جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ میری طرف اس قسم کی پیش رفت کر سکے۔ میں انہیں خوب پہچانتی ہوں اور اس قابل ہوں کہ ان سے اپنی حفاظت کر سکوں۔ آپ بے فکر رہئے۔ [1]

اس اقتباس سے یہ واضح ہے کہ پرویز صاحب کے نزدیک، مریمؑ کو ملنے والے رزق کا ذریعہ اور سبب، وہ زائرین و معتقدین تھے، جو اپنی عقیدت کی بناء پر، مریمؑ کو یہ چیزیں پیش کیا کرتے تھے، لیکن ''ناقد و معترض'' صاحب کے نزدیک، فراہمیٔ رزق کا بندوبست کرنے والے، نہ تو عام زائرین اور عقیدتمند لوگ تھے، اور نہ ہی ہیکل کے پجاری، بلکہ ایسا کرنے والے، حضرت زکریاؑ کے شریر موالی تھے جو بدنیتی کے ساتھ یہ کام کر رہے تھے۔

> ''اُنہوں نے جب کئی بار دیکھا کہ حضرت مریم کو، ان کی غیر حاضری میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز پہنچائی جا رہی ہے، تو انہوں نے حضرت مریم سے پوچھا کہ یہ کھانے کی چیزیں، انہیں کہاں سے ملتی ہیں، اس کے جواب میں، اس بھولی بھالی لڑکی نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے۔ اس پر حضرت زکریا نے محسوس کر لیا کہ یہ کام بدنیت موالی کر رہے ہیں۔ [2]

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۸۰ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۷

لیکن فراہمی رزق کی ان تمام توجیہات میں سے، قرآنی اشارات کی روشنی میں، وہی توجیہ اقرب الی الصواب ہے جو براہ راست، اللہ کی طرف سے (مِنْ عِنْدِ اللّٰہ) رزق کے ملنے پر دلالت کرتی ہے، اور جو فی الواقعہ ایک خارقِ عادت امر ہے، جس کا مشاہدہ، اس امر کا محرک بنتا ہے کہ حضرت زکریاؑ طلبِ فرزند کے لیے، بحضورِ ربِ کائنات، دعا کریں، اگرچہ ولادتِ اولاد کے ظاہری اسباب منقطع ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ دعا فرماتے ہیں، اور اسی دعا سے، ولادتِ یحییٰ علیہ السلام کی داستان کا آغاز ہوتا ہے۔

قصۂ ثانیہ

ولادتِ یحییٰ علیہ السلام

قرآن مجید، حضرت زکریا علیہ السلام کے الفاظِ دعا کو، ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

آیت ۳۸/۳:

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَاءِ

''وہیں اور اُسی وقت، حضرت زکریا نے دعا کی، عرض کیا ''خدایا! مجھے اپنی جانب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بیشک تو دعا کو سننے والا (اور جاننے والا) ہے۔''

اولاد کے لیے یہ دعا، حضرت زکریاؑ نے، هُنَالِكَ، وہیں اور اُسی جگہ (There & Then) کی، کیونکہ وہ دیکھ چکے تھے کہ بغیر کسی ظاہری سبب کے تر و تازہ میوے بھی، اور بے موسم پھل بھی، حضرت مریمؑ کو براہ راست، اللہ کی طرف سے (مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ) پہنچ رہے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر، اُن کے دل میں بھی بے موسم کا ثمرِ حیات (فرزندِ نیک صفات) پالینے کی خواہش نے زور پکڑا، کیونکہ ان کے ہاں عادتاً اولاد کی پیدائش کا موسم گزر چکا تھا۔ وہ، خود انتہائی بوڑھے تھے (قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا) اور ان کی بیوی قطعی بانجھ تھی، جس میں اولاد پیدا کرنے

کی صلاحیت مفقود تھی۔ ایسے میں، انہوں نے یہ سمجھ کر، کہ جو خدا مریمؑ کو، (مِنْ عِندِ اللّٰہ) بغیر کسی ظاہری سبب و واسطہ کے تروتازہ پھل اور بے موسے اثمار، فراہم کر سکتا ہے، وہ، مجھے بھی بے موسمی اولاد عطا کر سکتا ہے، دستِ سوال دراز کر دیا۔

من لدنک:

پھر اس دعا میں **من لدنك** کے الفاظ قابل غور ہیں، جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ حضرت زکریا، اپنے حد سے بڑھے ہوئے بڑھاپے، اور بیوی کے قطعی بانجھ ہونے کے باعث، ظاہری حالات کو تو ناساعد پا رہے تھے، لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اگر چاہے، تو اس کی قدرت و طاقت اور فضل و رحمت سے ایک بوڑھے کی تمنا بھی بر آسکتی ہے، اور ایک قطعی بانجھ بڑھیا کی گود بھی ہری ہو سکتی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر ہی کا پردہ ہیں۔ اصل چیز تو خدا کی قدرت، اس کا اقتدار و حکم اور اس کی عنایت و نوازش ہے۔

پھر یہ بات بھی یہاں لائق توجہ ہے کہ **من لدنك** کے الفاظ میں، خرقِ عادت کا وہی مفہوم پایا جاتا ہے، جو حضرت مریم کے جواب میں **مِنْ عند اللّٰہ** کا مفہوم ہے۔ دونوں میں، ظاہری اسباب سے بالاتر، مسبب الاسباب ہستی ہی پر اعتماد و توکل کا ذکر ہے۔

آیت ۳/۳۹:

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِنَ اللّٰهِ وَ سَيِّدًا وَّحَصُورًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ

”پس فرشتوں نے پکارا جبکہ وہ محراب میں نماز و دعاء میں مشغول تھا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں یحییٰ کی بشارت دیتا ہے، جو اللہ کی طرف سے ایک کلمہ کا مصدق، سردار، ضابط النفس اور صالحین میں سے ایک نبی ہوگا۔“

دعاءِ زکریا کو شرف قبولیت ملا، اور فرشتوں نے عین مناجات و نماز میں، انہیں یحییٰ نامی، ایک ایسے فرزند کی بشارت دی، جو حضرت عیسیٰ (یا ان کی کتاب) کا مصدق ہونے

کے علاوہ، دینی سیادت اور انتہائی ضبطِ نفس کا مالک ہوگا، اور ان خوبیوں پر مستزاد، وہ، از حد متقی و صالح اور حاملِ نبوت بھی ہوگا۔ یہ خوشخبری پا کر، پھر کیا ہوا؟ قرآن بیان کرتا ہے۔

آیت ۴۰ / ۳:

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ غُلٰمٌ وَّقَدۡ بَلَغَنِیَ الۡکِبَرُ وَامۡرَاَتِیۡ عَاقِرٌ
قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ

"زکریا نے عرض کیا "پروردگار! میرے ہاں بیٹا کس طرح ہوگا؟ درآنحالیکہ مجھے بڑھاپا آن پہنچا ہے، اور میری بیوی قطعی بانجھ ہے۔" ارشاد ہوا "اسی طرح (اے زکریا) اللہ تعالیٰ کر ڈالتا ہے، جو چاہتا ہے۔"

"پروردگار! میرے ہاں بیٹا کس طرح ہوگا؟"...... یہ سوال، شک یا انکار پر مبنی نہیں ہے، بلکہ یہ دعا کے بسرعت وعجلت قبول کیے جانے پر، حیرت و استعجاب کے ساتھ، حسین و بلیغ انداز میں طلبِ تصدیق ہے۔ اس بشارت کے عملی جامہ پہننے میں، تعجب و حیرت کا یہ پہلو بھی ہوسکتا ہے کہ ان کے سامنے، اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کی روکاوٹیں بھی موجود تھیں، چنانچہ وہ ان دونوں روکاوٹوں کا ذکر کر کے، تعجب کے ساتھ مستفسر ہیں کہ آخر بیٹا ان نا مساعد حالات میں کس طرح ہوگا؟ جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ "اسی طرح اللہ وہ سب کچھ کر ڈالتا ہے، جو وہ چاہتا ہے"، لہٰذا، بوڑھے باپ کی شیخوخت اور بوڑھی بیوی کے بانجھ پن کے باوجود، بیٹا پیدا ہو کر رہے گا، کیونکہ اصل چیز تو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر میں سے پانی کے چشمے جاری ہو سکتے ہیں، صحرا کے سینے سے حباب اٹھ سکتے ہیں، اور تنور سے عالمگیر تباہی برپا کر دینے والا طوفان برآمد ہوسکتا ہے۔

چند غور طلب امور:

اس آیت کی توضیح وتشریح میں، منکرینِ معجزات کو، اعترافِ معجزہ کے خطرہ سے بچنے کے لیے، جو تحریف کی راہ اختیار کرنا پڑی ہے، اُسے دیکھتے ہوئے، چند باتیں بڑی غور طلب

ہیں۔

(۱) پہلی بات تو یہ کہ، جنابِ پرویز صاحب، پیدائش اولاد میں، حضرت زکریاؑ کے بڑھاپے کو، کوئی روکاوٹ قرار ہی نہیں دیتے، حالانکہ خود حضرت زکریاؑ اَنّٰى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ کہہ کر، اپنے بڑھاپے کو ایک رکاوٹ قرار دے رہے ہیں، اور پھر بڑھاپا بھی، وہ، جو حد سے گزر چکا ہو، جیسا کہ قرآن، دوسرے مقام پر، ان کے قول کو بایں الفاظ ذکر کرتا ہے کہ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا، یعنی میں بڑھاپے میں حد سے گزر چکا ہوں، لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، فرماتے ہیں:

''زکریا میں تو کوئی نقص نہیں تھا، اس کی بیوی میں نقص تھا جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی، اس کی اصلاح ہوگئی۔'' [۱]

ذرا اور آگے چل کر، وہ پھر لکھتے ہیں:

''حضرت زکریا میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت موجود تھی، ان کی بیوی میں نقص تھا، سو اس کی اصلاح ہوگئی۔'' [۲]

شیخ کبیر کے ہاں انتہائی بڑھاپے کی حالت میں، اولاد کا متولد ہونا، چونکہ اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتا ہے، اس لیے اس واقعہ میں سے معجزانہ کیفیت کو زائل کرنے کے لیے، ہمارے ''مفکر قرآن'' اُس حقیقت کے انکار وجود پر تُل گئے، جس کا اظہار، خود حضرت زکریا نے بطور روکاوٹ کیا تھا۔

باقی رہا، ان کی بیوی کی اصلاح کا معاملہ تو اس پر بحث آگے آ رہی ہے۔

جہاں تک ''صاحبِ کتاب'' کا تعلق ہے، انہوں نے حضرت زکریا کے نقصِ شیخوخت کو تو تسلیم کیا ہے، لیکن پھر اس نقص کے ازالہ کے لیے دلیل، اُس آیت کو بنایا ہے، جس سے ازالۂ نقص کا مفہوم نکلتا ہی نہیں ہے، اس پر بحث بھی آئندہ صفحات میں آ رہی ہے۔

---

[۱] + [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۶۹

(۲) دوسری بات یہ کہ عاقر کا اصل مفہوم کیا ہے؟ کیونکہ وابستگانِ طلوعِ اسلام اور مولانا طاہر سورتی کے درمیان، اس معاملہ میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے، موصوف مؤخر الذکر فرماتے ہیں:

"یہاں عربی زبان میں لفظ عاقر آیا ہے۔ پرویز صاحب نے اس کے معنیٰ بانجھ کیے ہیں (دیکھیے شعلۂ مستور صفحہ ۱۱ و لغات القرآن صفحہ ۱۱۸) حالانکہ یہ ہر بانجھ عورت کے لیے نہیں بولا جاتا۔ مادۂ اصلی کی بناء پر، یہ ایسی بانجھ عورت کے لیے مستعمل ہے جس میں جڑ سے ولادت کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ عقر کا مادہ، تمام کا تمام، اسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے۔ مفردات میں عقرت النخل کا معنیٰ لکھے ہیں "میں نے کھجور کے درختوں کو جڑ سے کاٹ دیا۔" قرآن مجید میں عاقر اونٹنی کی کونچیں کاٹنے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس عمل کے بعد، اونٹنی کھڑی نہیں ہوسکتی اور مر جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اونٹنی کو نحر کرنے کے لیے بھی، یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ اس کے مقابلہ میں ایسی بانجھ عوت، جس کا علاج ہو سکے عقیم کہلاتی ہے، کیونکہ یہ کیفیت، اخلاط مزاج کے عدم اعتدال سے پیدا ہوتی ہے اور اعتدال پر لانے سے اس کا ازالہ ہوسکتا ہے۔

"قرآن کریم میں عاقر اور عقیم کا یہ فرق ملحوظ ہے، عرب والے جب کسی عورت کو بددعا دیتے ہیں تو عقریٰ کا لفظ بولتے ہیں یعنی خدا کرے تو نپٹ بانجھ رہے۔ لیکن پرویز صاحب، باوجود لغات القرآن کی تالیف کے، اس فرق کو واضح نہیں کرتے۔ یہ تساہل نہیں، بلکہ اس میں بھی، ایک مصلحت کارفرما ہے۔" [1]

جبکہ وابستگانِ طلوعِ اسلام کے نزدیک عاقر کا معنیٰ محض "بانجھ" ہے۔ ہمیں اس سے بحث نہیں کہ عاقر اور عقیم مترادف المعنیٰ الفاظ ہیں، یا ان میں وہ خفیف فرق پایا جاتا

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۱۹ تا ۲۰

ہے جسے مولانا طاہر سورتی صاحب نے بیان کیا ہے۔ لفظ عاقر کو اگر محض بانجھ ہی کے معنیٰ میں لیا جائے، تب بھی، اس واقعہ میں اعجازی شان برقرار رہتی ہے، اور بانجھ پن کا معنیٰ، بہر حال، فریقین میں سے ہر ایک کو مسلّم ہے، اس اعجازی پہلو کا ذکر آگے آ رہا ہے۔

(۳) تیسری بات یہ کہ پوری آیت کا ترجمہ پہلے دیا جا چکا ہے، اسے بھی دیکھ لیجئے اور آیت کے الفاظ کو، نگاہوں کے سامنے اور ذہن میں مستحضر رکھتے ہوئے، پرویز صاحب کا مندرجہ ذیل مفہومِ آیت بھی ملاحظہ فرمائیے:

> ''زکریا نے جب یہ سنا تو کہا ''خدایا! میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہے؟ (کیا میرے سچ مچ بیٹا پیدا ہوگا، یا اسی طرح کوئی لڑکا مل جائے گا جس طرح مریم جیسی بیٹی ملی تھی)۔ جواب ملا کہ ''نہیں، جس طرح ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق، بیٹے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح یہ پیدا ہوگا۔'' [1]

اس ''مفکرانہ مفہومِ آیت'' میں چند باتیں، غور طلب ہیں:

اولاً ...... یہ کہ، اَنّٰی یَكُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ کا ترجمہ (مفہوم نہیں، بلکہ ترجمہ) بالکل صحیح دیا گیا ہے۔ اس صحیح ترجمہ پر، پرویز صاحب کی جتنی بھی تعریف کیجائے، کم ہے۔

ثانیاً ...... یہ کہ، بین القوسین، جو کچھ لکھا گیا ہے، وہ قطعی طور پر اضافی اور الحاقی الفاظ ہیں، جنہیں صرف اور صرف، اس لیے مفہومِ آیت میں گھسیڑا گیا ہے، تاکہ جو کچھ وہ آگے چل کر ''ثابت'' کرنا چاہتے ہیں، یہ الفاظ، اس کے لیے اساس و بنیاد فراہم کر سکیں۔

ثالثاً ...... یہ کہ، كَذٰلِكَ کا ترجمہ نظر انداز کر دیا گیا ہے، کیونکہ ''مفکر قرآن'' کے فرائض میں (یوں معلوم ہوتا ہے کہ) مفہومِ آیت، پیش کرنے کے علاوہ، ''اصلاحِ قرآن'' بھی شامل ہے۔ حالانکہ لفظ كَذٰلِكَ یہاں، ایک اہم حقیقت کا آئینہ دار ہے۔

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۳

اس لفظ کے آخری ''ک'' سے حضرت زکریاؑ کو خطاب کر کے، کہا یہ گیا ہے کہ ''اسی طرح، بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہی ولادتِ فرزند ہوگی۔'' پھر اسی جملہ میں، اللہ تعالیٰ، اپنی قدرتِ مطلقہ کا اظہار اَللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کہہ کر کرتا ہے، یعنی اللہ جو چاہے، وہ، کر ڈالتا ہے۔

رابعاً...... یہ کہ، آخری حصہٗ آیت کا مفہوم، جو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ...... ''نہیں، جس طرح، ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق، بیٹے پیدا ہوتے ہیں، اُسی طرح یہ پیدا ہوگا''...... بالکل غلط اور قطعی باطل ہے۔ قواعدِ زبان کے اعتبار سے، یا محاورۂ عرب کے نقطۂ نظر سے، الغرض، جس پہلو سے بھی اُسے دیکھا جائے، یہ مفہوم، ہر لحاظ سے بعید از حقیقت ہے۔ كَذٰلِكَ میں واقع آخری ''ک'' حضرت زکریا سے خطاب کے لیے ہے، اور ''ان کے حد سے گزرے ہوئے بڑھاپے'' اور ''ان کی بیوی کے قطعی بانجھ پن'' کی تصدیق کر رہا ہے، جبکہ ''مفکر قرآن'' صاحب،...... ''نہیں، جس طرح، ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق، بیٹے پیدا ہوتے ہیں، اسی طرح یہ پیدا ہوگا''...... کہہ کر كَذٰلِكَ کی تائید کرنے کی بجائے، تردید کر رہے ہیں۔ اب خود سوچ لیجیے کہ یہ تائیدِ قرآن ہے، یا تردیدِ قرآن؟ تاویلِ قرآن ہے یا تغلیطِ قرآن؟ تصدیقِ قرآن ہے یا تکذیبِ قرآن؟

اب اسی آیت کا صحیح ترجمہ (یا مفہوم)، بجائے اس کے کہ کسی اور مترجم کی طرف سے پیش کیا جائے، پرویز صاحب ہی کے قلم سے پیش کیا جا رہا ہے، ملاحظہ فرمایئے:

''زکریا نے جب یہ سنا تو کہا ''خدایا! میرے یہاں لڑکا کیسے ہوسکتا ہے جبکہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے'' حکمِ الٰہی ہوا ''اسی طرح، اللہ جو چاہتا ہے، کرتا ہے (اس کی قدرت سے کوئی بات بعید نہیں)۔'' [1]

یہ صحیح ترجمہ، پرویز صاحب نے، اُس دور میں پیش کیا تھا، جب وہ وجودِ معجزات اور

---

[1] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۵۹

حضرت عیسیٰ کی بن باپ ولادت کے قائل تھے، لیکن بعد میں، جو غلط ترجمہ، شعلۂ مستور کے ذریعہ سے پیش کیا گیا، وہ، انکارِ معجزات کی مجبوری کے تحت، جس ''نظریۂ ضرورت'' کے پیش نظر، گھڑا گیا، وہ اظہر من الشمس ہے۔

آیت زیر بحث پر اعتراضات:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت کے ضمن میں، ''صاحبِ کتاب'' نے جو کچھ، طاہر سورتی صاحب کی تردید میں لکھا ہے، اُس کا جائزہ بھی لے لیا جائے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پرویز صاحب ہوں یا ان کے کوئی اور اندھے مقلد ہوں، ہر ایک اپنی اس خصلت میں یکتا ہے کہ قرآنی آیات کا ترجمہ کرتے ہوئے، وہ، بین القوسین، خود ساختہ الفاظ کا اضافہ کرتا ہے یا کسی اور انداز میں مفہوم میں تحریف کرتا ہے تاکہ اپنی مطلب برآری کے لیے راہ ہموار کی جا سکے۔ اسی آیت کا اب وہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے ''صاحبِ کتاب'' نے پیش کیا ہے۔

> ''میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا، حالانکہ میں اس بڑھاپے کو پہنچ گیا ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہے (یعنی کیا ان روکاوٹوں کو دور کر دیا جائے گا؟) اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ''اللہ جس بیٹے کو بنانا چاہے، اسے اسی طرح بنا دیتا ہے جیسا کہ تیرے سوال سے ظاہر ہے (یعنی روکاوٹیں دُور کر دیتا ہے)۔ [1]

اسے ترجمۂ آیت کہیئے یا مفہومِ آیت، ان میں واقع بین القوسین الفاظ، قطعی خود ساختہ اضافہ ہیں، جسے محض اس لیے داخلِ مفہوم کیا گیا ہے کہ اسے اپنے مقصود و مطلوب کے اثبات کے لیے، بنیاد بنایا جائے۔ اسی طرح كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کے ترجمہ (یا مفہوم) میں ''جیسا تیرے سوال سے ظاہر ہے'' کے الفاظ بھی، اسی نظریۂ ضرورت کے تحت وضع کیے گئے ہیں۔ اس کے بعد پھر بین القوسین، یہ الفاظ ''یعنی روکاوٹیں دور کر دیتا ہے'' بھی مفہومِ آیت میں، اپنی من پسند تحریف کے لیے گھسیڑے گئے ہیں۔ خود ساختہ اضافوں

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۶

یا تحریفی کارگزاریوں کے باعث، کیے گئے تراجم (یا مفاہیمِ آیات) کے ذریعہ، آخر وہ کون سی ''گمراہی'' ہے، جسے ثابت نہیں کیا جا سکتا، اور وہ کون سی حقیقت ہے، جسے رد نہیں کیا جا سکتا؟

تراجم آیات (یا مفاہیم آیات) میں اس قسم کی حرکتیں، یہ ثابت کرتی ہیں کہ آیات کا صحیح اور سیدھا سادا ترجمہ، ان لوگوں کے مفادات کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے وہ مجبور ہیں کہ قرآن سے اپنے من پسند نظریات کو کشید کرنے کے لیے، اس قسم کی کاروائیاں کریں۔ نیز ایسی حرکات سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ یہ لوگ، قرآن مجید سے ہدایت لینے کی بجائے، الٹا اُسے ہدایت دینا چاہتے ہیں، اور قرآن کے پیچھے چلنے کی بجائے، قرآن کو اپنے پیچھے چلانا چاہتے ہیں۔

اسی آیت کا (۳/۴۰) کا ترجمہ اور تشریح، جناب طاہر سورتی صاحب نے بایں الفاظ کیا ہے:

> ''انہوں نے کہا ''اے میرے رب! اس حالت میں کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور میری بیوی نپٹ بانجھ ہے، میرے لڑکا کیونکر ہوگا؟ ارشاد ہوا کہ اے زکریا، جو کچھ تو نے کہا واقعہ ایسا ہی ہے، اللہ جو کچھ چاہتا ہے، کر دیتا ہے۔'' [1]

ترجمہ کے بعد، جناب طاہر سورتی صاحب، كَذَالِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَايَشَآءُ کی مزید تشریح بایں الفاظ کرتے ہیں:

> بات ایسی ہی ہے، جو تو کہہ رہا ہے یعنی واقعی تو بوڑھا ہو چکا ہے اور تیری بیوی نپٹ بانجھ ہے، مگر اللہ، اپنی مشیت سے جو چاہتا ہے، کر دیتا ہے۔ [2]

''صاحبِ کتاب'' کے اعتراضات:

اس ترجمہ وتشریح پر، اعتراض کرتے ہوئے، ''صاحبِ کتاب'' فرماتے ہیں:

> ''طاہر سورتی مرحوم کے ترجمہ وتشریح پر غور کیا جائے تو مفہوم یہ نکلتا ہے کہ

---

۱ ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۱۹ تا ۲۰ ۲ ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۲۰

حضرت یحییٰ کی پیدائش معجزانہ تھی، کیونکہ مذکور ترجمہ وتشریح کے مطابق، اللہ تعالیٰ، حضرت زکریا کو بتا رہا ہے کہ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں، اللہ، انہیں بڑھاپے، ازدواجی تعلقات میں عجز اور بیوی کے لاعلاج بانجھ پن کے باوجود، یحییٰ نامی بیٹا عطا کرے گا، کیونکہ اللہ جو چاہے، کر دیتا ہے۔'' [1]

اس میں قطعاً کوئی شک وشبہ نہیں کہ مولانا طاہر سورتی صاحب کے درست ترجمہ و تشریح پر مبنی موقف، ولادتِ یحییٰ کو معجزہ کے طور پر پیش کرتا ہے، ہر وہ شخص، جو تراجم آیات (یا ان کے مفاہیم) میں، اپنے زوائد واضافات کو داخل کیے بغیر، اور تحریفی کرشمے دکھائے بغیر، قرآنی تعلیمات کو پیش کرتا ہے، وہ یقیناً اُسی نتیجہ پر پہنچے گا، جس پر جناب طاہر سورتی صاحب پہنچے ہیں، اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام کی پیدائش کو معجزہ قرار دیئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

پہلا اعتراض اور اس کا جائزہ:

اس کے بعد، ''صاحبِ کتاب''، مولانا طاہر سورتی صاحب کے بیان کردہ مفہوم کی بابت فرماتے ہیں کہ:

لیکن یہ، درج ذیل وجوہ کی بناء پر غلط ٹھہرتا ہے۔

اولاً، عاقر کا معنیٰ صرف بانجھ ہے، نپٹ بانجھ نہیں۔ [2]

جہاں تک **عاقر** کے نپٹ بانجھ ہونے کی بنا پر ناقابل علاج ہونے کا تعلق ہے، تو یہ بات غلط نہیں ہے۔ حضرت زکریاؑ کی بیوی کا بانجھ پن اگر دور ہوا ہے، اور وہ اصلاح یافتہ ہوئی ہیں، تو کسی طبیبِ حاذق اور ڈکٹورِ ماہر کے ہاتھوں نہیں بلکہ قادرِ مطلق کے دستِ لم یزل کی کارفرمائی سے اصلاح یافتہ ہوئی ہیں۔ اَصلحنالَهٗ زَوجه اور پھر اس اصلاح میں بھی ایک معجزانہ شان پائی جاتی ہے (جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا)۔

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲ تا ۳ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳

دوسرا اعتراض اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتی صاحب کے ترجمہ وتشریح پر، دوسرا اعتراض، ان الفاظ میں کیا گیا ہے:

كَذَالِك ...... اور ...... يفعل مايشاء دو جملے نہیں بلکہ ایک ہی جملہ ہے، جبکہ طاہر سورتی کے ترجمہ کے مطابق، یہ دو جملے بنتے ہیں (۱) جو کچھ تو نے کہا ہے، واقعہ ایسا ہی ہے (۲) اللہ جو کچھ چاہتا ہے، کر دیتا ہے۔ طاہر سورتی نے اس غلطی کے تدارک کے طور پر، اپنی تشریح میں، دو جملوں کے درمیان اپنی طرف سے "مگر" کا اضافہ کر کے، ان دو جملوں کو ایک بنانے کی کوشش کی ہے، اور فرمایا ہے۔ "بات ایسی ہی ہے جو تو کہہ رہا ہے، یعنی واقعی تو بوڑھا ہو چکا ہے، اور تیری بیوی بانجھ ہے، مگر اللہ اپنی مشیت سے جو چاہتا ہے، کر دیتا ہے۔" [1]

جہاں تک اس اعتراضِ ثانی کا تعلق ہے کہ مولانا طاہر سورتی صاحب نے كَذَالِك اور الله يفعل ما يشاء کو الگ الگ جملہ قرار دیا ہے، تو یہ محض ایک بیجا قسم کی سخن سازی ہے، جو محض اپنی بات بنانے کے لیے، قلمی ورزش کی ہی حیثیت رکھتی ہے۔ اب جناب "صاحبِ کتاب" کو یہ بات کون سمجھائے کہ اسی مضمون کو جب سورہ مریم میں بیان کیا گیا تو كَذَالِك کو ایک پورا اور الگ جملہ قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیے، الفاظ آیت:

قَالَ كَذَالِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (سورہ مریم – آیت ۹)

"فرمایا "ایسا ہی ہوگا" تیرے رب کا فرمان ہے کہ "ایسا کرنا، میرے لیے آسان ہے، جبکہ قبل ازیں، میں تجھے خود پیدا کر چکا ہوں، اور تو معدومِ محض تھا۔"

اب اسی آیت کا، وہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے خود پرویز صاحب نے كَذَالِك

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳

کو ایک الگ جملہ قرار دیتے ہوئے، بایں الفاظ پیش کیا ہے:-

''ارشاد ہوا ''ایسا ہی ہوگا''۔ تیرا پروردگار فرماتا ہے کہ ''ایسا کرنا میرے لیے کچھ مشکل نہیں ہے۔ میں نے اس سے پہلے خود تجھے پیدا کیا، حالانکہ تیری ہستی کا نام ونشان نہ تھا۔'' [1]

پھر نتیجۂ کلام کے اعتبار سے بھی دیکھا جائے، تو یہ معترضانہ سخن سازی، پانی میں مدھانی چلانے کے مترادف ہے، کیونکہ **كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ** کو ایک جملہ قرار دیا جائے، یا دو جملوں کا مجموعہ، معنیٰ ومفہوم کے لحاظ سے بات ایک ہی رہے گی، کچھ فرق نہ ہوگا، بشرطیکہ صحیح ترجمہ کرتے ہوئے، خود ساختہ حشو وزوائد سے پرہیز کیا جائے۔

الغرض یہ کہ، جب ''کیونکر'' جیسے سوال کے جواب میں، **كَذٰلِكَ** کا واحد لفظ ہی بولا جائے، اور اسے تقویت دینے والا کوئی اور تائیدی جملہ نہ بھی بولا جائے، تب بھی، یہ واحد لفظ پورے جملے ہی کا قائم مقام ہوگا۔ مثلاً جب یہ کہا جائے کہ ''آج، آپ اپنے دفتر میں کیونکر پہنچیں گے، جبکہ آپ کے پاس، نہ تو موٹر سائیکل ہے، اور نہ ہی کار؟'' تو جواب میں ''اسی طرح'' (**كَذٰلِكَ**) کہہ دینا، یہی مفہوم رکھتا ہے کہ ''باوجودیکہ، موٹر سائیکل اور کار موجود نہیں ہے، میں اسی حالت میں دفتر پہنچ جاؤں گا''، نہ یہ کہ ''میں ان سواریوں میں سے کسی ایک ذریعہ ہی سے وہاں پہنچوں گا۔''

تیسرا اعتراض اور اس کا جائزہ:

جناب ''صاحبِ کتاب'' کا تیسرا اعتراض، ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے:

''اگر اللہ تعالیٰ نے، حضرت زکریا کو ازدواجی تعلقات سے مستثنیٰ کر کے، اور ان کی بیوی کے بانجھ پن کو دور کیے بغیر، بیٹا دینے کی بشارت دی تھی، تو یحییٰ، نہ تو طیب اولاد کہلا سکتے ہیں، اور نہ فی الواقع ان کا بیٹا۔ کیونکہ پاکیزہ وہ ہوتا ہے جو ماں باپ کے نکاح میں پیدا ہو۔'' [2]

---

[1] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۳۶۲ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳

حقیقت یہ ہے، کہ مولانا طاہر سورتی کے موقف پر، یہ اعتراض اور ان کے نظریہ کی یہ وجۂ تردید، سرے سے کوئی دلیل ہی نہیں ہے، بلکہ اپنے "عقلِ کُل" ہونے کا ایک ایسا تحکمانہ دعویٰ ہے، جو خود محتاجِ دلیل ہے، اور جس کی بنیاد پر یہ طے کرلیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و طاقت، صرف اُن عادی امور تک ہی محدود ہے جسے ہماری نگاہیں دیکھنے کی خوگر ہیں۔ ان عادی امور سے ہٹ کر، کچھ کرسکنے سے وہ عاجز و بے بس ہے۔ لہٰذا، صرف وہی اولاد، پاکیزہ و طیب قرار پاسکتی ہے جو انسانی حواس کی گرفت میں آنے والے عادی امور کے مطابق ہے۔ رہے وہ خارق عادات امور، جو عام "عادتِ خداوندی" کے خلاف ہیں، تو وہ گویا "قدرتِ خداوندی" ہی سے خارج ہیں۔ اور اسی کے ساتھ، وہ یہ بھی، طے کرلیتے ہیں کہ کسی بچے کا ماں باپ کے ملاپ سے پیدا ہونا ہی، وہ "سنت اللہ" ہے جس کے متعلق، قرآن کہتا ہے کہ "تم اس میں کوئی تغیر نہ پاؤ گے۔" حالانکہ قرآن نے یہ کہیں بھی نہیں کہا کہ بچے کی پیدائش کا، مرہونِ ملاپِ والدین ہونا "سنت اللہ" ہے۔ یہ لوگ، قرآنی الفاظ و اصطلاحات میں، پہلے ایک خود ساختہ اور باطل مفہوم کو گھسیڑتے ہیں، اور پھر اُسے معیار قرار دے کر، ہر اُس چیز کو باطل ٹھہرا دیتے ہیں، جو اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ مثلاً وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اس کائنات میں، عادتاً آگ جلانے ہی کا کام کرتی ہے، چنانچہ اس عادی امر کو، وہ، خدا کی ناقابل تغیر سنت قرار دیتے ہیں۔ اور پھر خواہ، خدائے کائنات، کتنے ہی، زوردار انداز میں کہے کہ "ہم نے اپنے فلاں بندے کی خاطر، آگ سے تحریقی صلاحیت سلب کرلی" مگر یہ "نیچر پرست" لوگ، خدا کی بھی مان کر نہیں دیتے۔ اور اس قسم کے فرمانِ خداوندی کو، "خلافِ سنت اللہ" قرار دے کر، اس کی تاویل بلکہ تحریف پر اتر آئیں گے۔

اسی طرح وہ کائنات میں یہ دیکھتے ہیں کہ ہر بچہ، ماں باپ کے ملاپ سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ لوگ، اس "عادی امر" کو از خود، اللہ کی ناقابلِ تبدیل سنت قرار دیکر، یہ طے کرلیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، خواہ کتنا ہی قادر مطلق ہو، وہ اس عادی امر سے ہٹ کر، کسی کو پیدا نہیں کرسکتا، اور اُس کی قدرت، بس انہی عادی امور تک محدود ہے، جسے انسانی حواس محسوس کرتے ہیں۔

ان حدود سے باہر، اگر اللہ کچھ کرنا بھی چاہے، تو کر نہیں سکتا، وہ اپنے ہی عادی امور کی حدود میں جکڑا ہوا ہے۔ پھر آخر ایسے عاجز و بے کس کو کس لیے خدا تسلیم کیا جائے؟ اور کیوں اس پر ایمان لایا جائے؟ ان لوگوں کے نزدیک، اعتقاد و ایمان کے لائق، دراصل، اللہ تعالیٰ کی ذات نہیں ہے، بلکہ اس کی، وہ ''عادت'' ہے، جس کے دوام و استمرار کو دیکھ کر، وہ اس پر اس قدر وثوق سے یقین کر لیتے ہیں کہ ''خدا کی ہستی، پس منظر ہی میں چلی جاتی ہے، اور یہی عادی اور طبعی قوانین، خدا قرار پاتے ہیں، چنانچہ، اسی ذہنیت کے تحت، وہ، یہ کہتے ہیں۔

> ''والد کے جنسی عجز، اور والدہ کے نپٹ بانجھ پن برقرار رہنے سے نہ تو حمل قرار پائے گا، اور نہ بچہ جنا جا سکتا ہے۔'' [1]

حالانکہ خدا کی قدرت، اُن حدود کے اندر گھری ہوئی نہیں ہے، جو ان لوگوں کے اذہان نے سوچ رکھی ہیں۔ وہ، ایک کلمہ ''کن'' سے، ایک کیا، ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں اور اربوں بچے، معجزانہ طور پر پیدا کر سکتا ہے۔

پھر اسی ذہنیت کے تحت، قرآنی آیات کی تحریف کرتے ہوئے، انکارِ معجزات کی راہ ہموار کی جاتی ہے، اور یہ کہا جاتا ہے کہ:

> ''بچہ چونکہ ماں باپ کے جنسی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ باپ تندرست ہو، اور ماں بانجھ نہ ہو۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے دونوں شرطیں پوری کر دیں۔ حضرت زکریا کو تندرست کر دیا قال' ایتلث الاتکلم الناس ثلاث لیال سَوِیا (۱۹/۱۵)، اور ان کی بیوی کا بانجھ پن بھی دور کر دیا فاستجبنا له ووهبنالہ یحی وَاصْلَحْنَالَهٗ زَوْجَهٗ (الانبیاء - ۹۹) [2]

اس اقتباس میں کذب و تحریف کے جو کرشمے دکھائے گئے ہیں، ایک نظر، اُن پر بھی ڈال لیجیے۔

(۱) ''حضرت زکریا کو تندرست کر دیا''...... یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا وہ بیمار تھے؟

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴

مبتلائے مرض تھے؟ علیل وسقیم تھے؟ کیا کہیں قرآن نے ان کے کسی عارضۂ علت کا ذکر کیا ہے؟ کیا خود خداوندِ قدوس نے، ان کی بیماری کا تذکرہ کیا ہے؟ کیا خود حضرت زکریاؑ نے اپنے کسی مرض کا انکشاف کیا ہے؟ جب ان میں سے ہر سوال کا جواب نفی میں ہے، (اور یقیناً نفی میں ہے) تو ''حضرت زکریاؑ کو تندرست کر دیا'' کے کیا معنیٰ؟ وہ خود، جس چیز کو بیان کرتے ہیں، وہ، اُن کا ''حد سے بڑھا ہوا بڑھاپا ہے۔'' لیکن کیا بڑھاپا کوئی بیماری ہے؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ بھی، شیر خوارگی، لڑکپن، جوانی، اور کہولت جیسی طبیعی حالتوں میں سے ایک حالت ہے۔ پھر آخر، اس کذب، اور افتراء علی اللہ کی کیا حیثیت کہ ''حضرت زکریاؑ کو تندرست کر دیا''؟

پھر اس تندرستی کی جس آیت سے دلیل کشید کی گئی ہے، اس میں نہ ان کی بیماری کا ذکر ہے، اور نہ کسی مرض کا۔ بلکہ صرف یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''تمہاری نشانی یہ ہوگی کہ تین دن تک، صحیح سالم ہونے کے باوجود، تم لوگوں سے بات چیت نہ کرسکو گے۔'' اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ بیمار تھے، اور اب صحت مند ہو گئے ہیں؟ لیکن ضد، ہٹ دھرمی کا یہ عالم ہے کہ آیت کا غلط ترجمہ کیا جاتا ہے اور پھر اس غلط ترجمہ کے بل پر، کذب و زور اور افتریٰ علی اللہ کرتے ہوئے، اپنے ''اکاذیب و اباطیل'' کو ''دلائل'' کا نام دیکر، یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ:-

''قرآن مجید سے ثابت کیا جاچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت زکریا کو تندرست سَوِيًّا (مریم - ۱۰) بنادیا۔ [1]

اب رہا، اُن کی بیوی کا معاملہ! تو اُن کے متعلق، یہ کہنا کہ ''اس کا بانجھ پن بھی دور کر دیا'' ایک نہایت سطحی بات ہے، جو سرسری طور پر، اصلحنالہ زوجہ سے برآمد کی گئی ہے۔ یہ اصلاح، کسی دنیاوی علاج معالجہ کا نتیجہ نہ تھی، جیسا کہ پرویز صاحب اور ان کے مقلدین نے گمان کر رکھا ہے، بلکہ معجزۂ خداوندی کا نتیجہ تھی۔ اگر منکرین حدیث

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۵

اصلحناله زوجه پر کما حقہ غور کرتے، تو یہ اعجازی پہلو ابھر کر ان کی نگاہوں کے سامنے آ جاتا۔ خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:-

"یہاں اصلحناله زوجه کا ٹکڑہ قابل غور ہے، حضرت زکریا نے عرض کیا تھا، کہ میری بیوی عقیم ہے، اس لیے اس کے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے، آپ کی بیوی میں، اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت پیدا کر دی۔" [1]

جی ہاں! یہ قطعۂ آیت واقعی قابل غور ہے۔ لیکن "مفکر قرآن" نے، خود بھی اس پر کما حقہ غور نہیں کیا، حالانکہ وہ خود، دوسروں کو اس کی تلقین اور نصیحت یہ کہہ کر کیا کرتے تھے:

"قرآن کا ایک ایک لفظ غور طلب ہوتا ہے، قرآن کے لفظوں پر سے یونہی نہ گزر جایا کرو کہ اس کا ہر لفظ رک کر، سوچنے اور سمجھنے کا تقاضا کرتا ہے۔" [2]

اب یہاں غور طلب سوال یہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کی بیوی کی یہ اصلاح کس طرح ہوئی؟ عام عادی اسباب کے تحت، علاج معالجہ کے ذریعہ؟ یا براہ راست خدا کی طرف سے معجزانہ طور پر؟

پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"زکریا میں تو کوئی نقص نہیں تھا، اس کی بیوی میں نقص تھا، جس کی وجہ سے ان کے ہاں اولاد پیدا نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اصلاح ہوگئی، یعنی مناسب علاج کرنے سے وہ نقص دور ہوگیا، اور ان کے ہاں بیٹا پیدا ہوگیا۔ اصلحناله زوجه میں دونوں باتیں آ جاتی ہیں۔" [3]

اگر واقعی "مفکر قرآن" اور "صاحبِ کتاب" نے، یہاں ایک ایک لفظ پر غور کیا ہوتا، تو خود ان پر عطاءِ فرزند کے عمل میں، اعجازی کیفیت واضح ہو جاتی، قرآن یہ نہیں کہتا کہ "ہم نے اُس کی بیوی کو ٹھیک کر دیا" بلکہ یہ کہتا ہے کہ "ہم نے اس کی بیوی کو، اس کے لیے (لهٗ) ٹھیک کر دیا۔" ہمارے "مفکر قرآن" صاحب ہوں، یا کوئی دیگر منکر معجزات، انہوں

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۸ تا ۹ [2] طلوع اسلام، اپریل ۱۹۸۵ء، صفحہ ۳۴

[3] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۶۹

نے کبھی اور کہیں بھی لہٗ پر غور نہیں کیا۔

پھر، ان حضرات کی یہ توجیہ، بلکہ تاویل بھی خود ساختہ اور بے اصل ہے کہ ''مناسب علاج سے بیوی کا نقص، دور ہو گیا''...... الفاظِ قرآن، یہ ظاہر کرتے ہیں کہ بغیر کسی علاج معالجہ کے، نہ صرف یہ کہ، یہ نقص دور ہو گیا، بلکہ دور ہوا بھی، تو صرف اور صرف حضرت زکریاؑ کے حق میں، اور اُن ہی کے لیے، اور فقط ان ہی کی خاطر، محض اُن ہی کی اولاد پیدا کرنے کے پیشِ نظر...... اگر اُن کی بیوی، وفاتِ شوہر کے بعد، نکاحِ ثانی کر لیتیں، (بشرطیکہ ایسا کرنا، اس شریعت میں جائز ہوتا)، یا حضرت زکریاؑ سے طلاق پا کر، کسی اور سے نکاح کر لیتیں (اگر بالفرض یہ جائز ہوتا)، تو بیوی کا یہ نقص بدستور برقرار رہتا، اور وہ حسبِ معمول عقیم و عاقر ہی رہتیں۔ اب اگر ان کا بانجھ پن دور ہوا ہے (اور نتیجتاً وہ اولاد پیدا کرنے کے قابل ہوئی ہیں) تو صرف اور محض، حضرت زکریاؑ کے لیے، (نہ کہ کسی اور کے لیے)۔ اَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ ۔ اور یہ صریحاً ایک خارقِ عادت امر اور واضح معجزہ ہے۔ نیز، اس کا معجزہ ہونا، اس پہلو سے بھی واضح ہے کہ حضرت زکریاؑ کو، جو حد سے بڑھی ہوئی بڑھاپے کی ایسی حالت میں ہیں، جس میں عادتاً بچہ پیدا ہونا محال ہوتا ہے، فرزندِ ارجمند سے نوازا جاتا ہے، قد بلغت من الکبر عتیا کی حالت، بجائے خود، ولادتِ پسر میں رکاوٹ ہے (جس کا رکاوٹ ہونا، ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، مانتے ہی نہیں ہیں، حالانکہ خود حضرت زکریاؑ نے اسے بطور رکاوٹ ذکر کیا ہے) اور اس رکاوٹ کے باوجود (نہ کہ اس کا ازالہ کرتے ہوئے)، انہیں ذریۃ طیبۃ سے نوازا جانا، صریحاً ایک معجزہ ہے۔

چوتھا اعتراض اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتی صاحب کے موقف کے ابطال کی چوتھی وجہ، ''صاحبِ کتاب'' نے بایں الفاظ پیش کی ہے۔

''مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے مطابق، حضرت زکریا تندرست بنا دیئے گئے، اور ان کی بیوی کا بانجھ پن دور کر دیا گیا، تو یحیٰی علیہ السلام، یقیناً اپنے والدین کے ملاپ ہی سے

تعلقات۔ نتیجہ میں پیدا ہوئے، اور فی الواقعہ اپنے ماں باپ کے بیٹے تھے۔" [1]

جن دونوں آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں سے کسی ایک میں بھی یہ مذکور نہیں ہے کہ حضرت زکریا علیل و سقیم یا مریض و بیمار تھے، اور پھر وہ "تندرست بنا دیئے گئے"۔ آیت میں، یہ معنی، تسویلِ نفس کے زور پر، خود پیدا کیے گئے ہیں۔ اوپر، اس پر بحث کی جا چکی ہے۔

رہی دوسری آیت، جس میں اصلحنالہ زوجہ کے الفاظ کو، بناءِ دلیل بنایا گیا ہے، تو اس سے وہ مضمون، ہرگز نہیں نکلتا جو پرویز صاحب اور "صاحبِ کتاب" نے نکالا ہے، بلکہ اس میں بھی اعجازی شان پائی جاتی ہے، جیسا کہ اوپر، اس پر بحث کی جا چکی ہے۔

باقی رہی یہ بات کہ "حضرت یحییٰ علیہ السلام فی الواقعہ اپنے ماں باپ کے بیٹے تھے۔" تو اس کا انکار کسی نے بھی نہیں کیا۔ سب یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے والدین ہی کے فرزند ارجمند تھے، مگر ان کی پیدائش باپ کے بڑھاپے کے باوجود اور ماں کے عقیم و عاقر ہونے کی حالت کے معجزانہ ازالہ کے نتیجے میں ہوئی تھی۔

پانچواں اعتراض اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتی صاحب کی تردید میں، "صاحبِ کتاب" فرماتے ہیں:

"خامساً، آیت زیر بحث (مریم - ۸) میں ایجاز حذف کی صنف استعمال ہوئی ہے، اور وہ یہ ہے قال رب انی یکون لی غلام و قد بلغنی الکبر وامرءتی عاقر (أیکون بازالۃ العقر عن زوجی وردّ شبابی علیّ) یعنی زکریا نے کہا "اے میرے پروردگار! میرے لڑکا کیونکر ہوگا حالانکہ میں اس بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہے (کیا میری بیوی کا بانجھ پن دور کر کے اور میری جوانی لوٹا کر؟) یہ قوسین کی عبارت "کیا میری بیوی کا بانجھ پن دور کر کے اور میری جوانی لوٹا کر؟" سوال کی وضاحت ہے۔ سادہ لفظوں میں معنی یہ ہے کہ حضرت زکریا نے پوچھا کہ میرے ہاں بیٹا کیونکر ہوگا،

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴

حالانکہ میں بڑھاپے کی حد کو پہنچا ہوا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے، کیا یہ دونوں رکاوٹیں (بڑھاپے کی وجہ سے جنسی عجز اور بیوی کا بانجھ پن) دور کر کے، مجھے وہ بیٹا عطا کیا جائے گا جس کی مجھے بشارت دی گئی ہے۔ [1]

معلوم ہوتا ہے کہ ''صاحبِ کتاب'' نے کہیں سے ایجاز حذف کا نام سن لیا، اور پھر خود ہی یہ طے فرما لیا کہ متعدد تفسیری جملوں میں سے جس جملے کو، کوئی شخص چاہے، ایجاز حذف قرار دینے میں، وہ، آزاد و خود مختار ہوتا ہے، اور پھر اُسے یہ جاننے کی بھی کوئی ضرورت نہیں رہتی کہ ایسا حذف، قرآنی عبارت میں، نظم کلام کا تقاضا بنتا بھی ہے یا نہیں؟ نیز، وہ، اس امر سے بھی بے نیاز ہوتا ہے کہ قرآنی سیاق وسباق میں واقعتاً اس حذف کو سمو دینے کی گنجائش پائی بھی جاتی ہے، یا نہیں؟

جس آیت میں، ایجاز حذف کا یہ پھانہ ٹھونکا جا رہا ہے، ایک نظر اس کے الفاظ پر بھی ڈال لیجئے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُونَ لِی غُلَامٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَ امْرَءَ تِیْ عَاقِرٌ
قَالَ کَذٰلِكَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ (اٰل عمران — ۴۰)

''عرض کیا'' پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیسے پیدا ہوگا جبکہ میں بڑھاپے کو پہنچ چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے'' فرمایا: ''اسی طرح، اللہ جو چاہتا ہے، کر دیتا ہے۔''

یہی مضمون، سورہ مریم کی آیت میں بھی موجود ہے۔ ایک نظر اسے بھی دیکھ لیجئے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُونُ لِی غُلَامٌ وَّکَانَتِ امْرَءَ تِی عَاقِراً وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْکِبَرِ عِتِیّاً قَالَ کَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ ھُوَ عَلَیَّ ھَیِّنٌ وَقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَیْئاً (مریم — ۸، ۹)

''عرض کیا'' پروردگار! بھلا میرے ہاں کیسے بیٹا ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے اور بڑھاپے میں انتہاء کو پہنچ چکا ہوں''، فرمایا ''ایسا ہی ہوگا'' تیرا رب فرماتا

---

[1] ابن مریم پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴۴

ہے کہ ''یہ تو میرے لیے ایک ذرا سی بات ہے، آخر اس سے پہلے میں تجھے پیدا کر چکا ہوں، جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا۔''

اس آیت میں حضرت زکریاؑ کا وہی فرمان موجود ہے، جو سورہ 'ال عمران کی آیت میں ہے۔ یہاں **ما یشاء** کے وہ الفاظ موجود نہیں ہیں، جن کی بنیاد پر، ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب الفاظ کی طغیانی کے ساتھ، ''اللہ کے قانون مشیت'' کی آڑ میں، اس واقعۂ معجزہ کو، ایک عام عادی واقعہ بنا ڈالتے ہیں۔ یہاں حضرت زکریاؑ صرف یہ عرض کر رہے ہیں کہ ''پروردگار! میں از حد بوڑھا ہو چکا ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہے، ایسی حالت میں میرے ہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے؟'' جواب دیا گیا کہ ''ایسا ہی ہوگا'' یعنی تیرے بڑھاپے اور تیری بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، تیرے ہاں لڑکا ہوگا، اور پھر، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا یہ کہہ کر حوالہ دیا کہ جس خدا نے تجھے نیست سے ہست کیا، اس کی قدرت سے یہ بات بعید نہیں کہ تجھ جیسے شیخ فانی سے، ایک ایسی عورت کے ہاں اولاد پیدا کر دے، جو عمر بھر بانجھ رہی ہے۔

دونوں آیات، اپنے سیدھے سادے ترجمہ کے ساتھ واضح ہیں۔ حضرت زکریاؑ بچے کی ولادت میں دو موانع کا ذکر کرتے ہیں، ایک ان کا بڑھاپا اور دوسرا، بیوی کا بانجھ پن۔ ان دونوں موانع کے باوجود، خود فاطر کائنات اور خالقِ انسان، نہ تو یہ فرماتے ہیں کہ ان دونوں موانع کا ازالہ کیا جائے گا، نہ ہی عقد ثانی کے ذریعہ اولاد دینے کا وعدہ ہے، نہ شوہر کی جوانی کو لوٹا دینے اور بیوی کے بانجھ پن کے ازالہ کی یقین دہانی ہے، بلکہ جواب میں کہا یہ جاتا ہے کہ **کذالك** ''اسی طرح ہوگا''۔ اور پھر، اللہ تعالیٰ، اپنی قدرتِ مطلقہ کے حوالہ سے، (ایک مقام پر) یہ کہہ کر، **کذالك** کی تائید و تقویت فرماتے ہیں کہ **اللّٰہ یفعل مایشاء** (اللہ جو چاہتا ہے، کر ڈالتا ہے)، اور (دوسرے مقام پر) یہ کہہ کر، کہ **كَذَالِكَ** (اسی طرح ہی کی صورت میں) بچہ پیدا کر دینا، اللہ کے لیے قطعاً مشکل نہیں، بلکہ یہ تو ذرا سی بات ہے۔ آخر اس سے قبل، وہ، خود تجھے پیدا کر ہی چکا ہے، جبکہ تو کوئی چیز نہ تھا۔

خود سوچئے کہ اس عبارت میں ''ایجاز حذف'' کہاں نصب ہوتا ہے؟ بلکہ اس ''ایجاز حذف'' کی ضرورت ہی کہاں پیدا ہوتی ہے؟ اور اگر سینہ زوری کے بل پر، اسے لا رکھنے پر اصرار کیا بھی جائے تو مخمل میں ٹاٹ کا یہ پیوند، آخر، لگے گا کہاں؟

کیا قرآن مجید کو کلام الٰہی مانتے ہوئے، اور اس سے ہدایت کا طلبگار ہوتے ہوئے، کوئی شخص یہ رویہ اختیار کر سکتا ہے کہ وہ خارج از قرآن، کسی ''ایجاز حذف'' کو ڈھونڈتا پھرے اور پھر اسے لا کر قرآن میں نصب کر ڈالے، اور پھر اصرار کرے کہ یہی قرآنی تعلیم ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ کسی خداترس آدمی سے، اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

چھٹا اعتراض اور اس کا جائزہ:

''مصنفِ کتاب''، طاہر سورتی صاحب کے ترجمہ وتشریح کے باطل ہونے کی چھٹی وجہ، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

> ''اس سوال کے جواب میں، جو ایجاز حذف کے اظہار سے واضح ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ نے کہا ''اللہ تعالیٰ، جس (بیٹے) کو بنانا چاہتا ہے، اُسے اسی طرح بنا دیتا ہے، جیسا تیرے سوال سے ظاہر ہے۔''[1]

اسے کہتے ہیں ''بناء فاسد علی الفاسد'' پہلے تو انکارِ معجزات کے ''نظریۂ ضرورت'' کے تحت، ایک ایسا ایجاز حذف تراشا جاتا ہے، جس کی قرآنی سیاق وسباق میں سرے سے ضرورت نہیں ہے، اور پھر اِس فاسد بنیاد پر، دوسرے فاسد کا ردا یہ کہہ کر جما دیا جاتا ہے کہ جب دونوں روکاوٹیں دور ہو گئیں تو ولادت کا عمل، ایک عام عادی واقعہ بن کر رہ گیا، اس کا معجزہ سے کیا تعلق؟ اور یوں، یہ بناءِ فاسد علی الفاسد، کا عمل ''صاحبِ کتاب'' کے ہاں، مولانا طاہر سورتی کے موقف کے بطلان پر ''چھٹی دلیل'' قرار پا جاتا ہے۔

ساتواں اعتراض اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتی صاحب کے موقف کی تغلیط میں، ساتویں وجہ، بایں الفاظ بیان کی

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴

گئی ہے۔

''اوپر جو ایجاز حذف، خازن سے لیا گیا ہے، اس کے ساتھ ہی تفسیر خازن نے ایک اور ایجاز حذف بھی دیا ہے، جو یہ ہے اَو یکون و نحن علی حالنا من الکبر و الضعف ؟ (یا ہمارے بڑھاپے اور کمزوری کی حالت میں؟)۔ طاہر سورتی نے یہ دوسری صورت بیان کر کے، حضرت یحییٰ کی پیدائش کو معجزہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن حضرت زکریاؑ نے یہ بات نہیں کہی ہوگی۔ [1]

اس اقتباس میں، ''صاحبِ کتاب'' نے دو زیادتیوں کا ارتکاب کیا ہے۔ ایک تو یہ، بہتان تراشی کی گئی ہے کہ...... ''طاہر سورتی نے یہ دوسری صورت بیان کر کے، حضرت یحییٰ کی پیدائش کو، معجزہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے''...... حالانکہ طاہر سورتی صاحب نے، نہ یہ ایجاز حذف، تفسیر خازن سے لیا ہے، اور نہ ہی انہیں ایسا کرنے کی ضرورت تھی، کیونکہ قرآن کے سیاق وسباق اور نظمِ کلام میں، کسی بھی ایجاز حذف کی، یہاں سرے سے ضرورت ہی نہیں ہے۔ خود خدائے قدوس کی طرف سے کذالك کہہ دینے کے بعد، کسی خود ساختہ اور من گھڑت ''ایجاز حذف'' کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اور دوسری زیادتی، یہ کہ حضرت زکریاؑ نے یہ بات نہیں کہی ہوگی کہ ''کیا ہمیں بچہ، اسی حالت میں عنایت کیا جائے گا کہ ہم اپنے بڑھاپے اور بانجھ پن پر برقرار رہیں؟'' سوال یہ ہے کہ ''صاحبِ تردید'' کے اس حتم ویقین اور وثوق واعتماد کی بنیاد کیا ہے، جس پر وہ یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ حضرت زکریاؑ نے یہ بات نہیں کہی ہوگی؟ اور اسکے برعکس، اس بات کا یقین واذعان انہیں کس بنیاد پر حاصل ہوا کہ حضرت زکریاؑ نے ''اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ضرور کہا تھا'' حالانکہ حضرت زکریاؑ نے جو کچھ کہا، وہ مذکور فی القرآن ہے، اور وہ بجائے خود واضح (Self Explainced) اور خود مکتفی (Self Sufficient) ہے کہ اس کی موجودگی میں، کسی ''ایجاز حذف'' کی طرف، آنکھ اٹھا کر

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴

دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ طاہر سورتی صاحب کے موقف کی تردید میں، ''صاحبِ کتاب'' کی یہ ساتوں وجوہات، انتہائی لچر، لغو، بودی اور ضعیف ہیں، انہیں پیش کرتے ہوئے۔ اُن کے دل و دماغ پر انکارِ معجزات کی دھن سوار رہی ہے، اس دُھن میں، نہ وہ قرآنی آیات کا غلط ترجمہ کرنے سے رکے ہیں اور نہ ہی ایجاز حذف کی آڑ میں، قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈالنے سے باز رہے ہیں، نہ معنوی تحریف اور لغوی انحرافات سے ممتنع رہے ہیں، اور نہ ہی قواعدِ زبان کا لحاظ رکھتے رہے ہیں۔ پوری تصنیف کے دوران، ان کا قلم، انکارِ معجزات کے جذبات کی طغیانیوں کے رحم و کرم پر ہی رہا ہے۔

آیت ۴۱:

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ

''زکریاؑ نے عرض کیا ''پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دیجیے۔'' فرمایا ''تیری نشانی یہ ہوگی کہ تو لوگوں سے ماسوا اشارہ و کنایہ کے تین دن تک بات نہ کر سکے گا (یا نہ کرے گا) اور تو اپنے رب کا بکثرت ذکر کیجیو، اور صبح و شام، تسبیح کیجیو۔''

اس قدر سرعت و عجلت کے ساتھ، دعا کا قبول ہو جانا کہ ابھی ابھی حالتِ نماز میں دعا کی، اور ابھی نماز سے فارغ بھی نہیں ہوئے کہ بشارتِ فرزند مل گئی، انتہائی حیرت و استعجاب کے ساتھ، از حد فرحت و سرور کے عالم میں انہوں نے استفسار کیا۔ حضرت زکریاؑ کو اگرچہ وثوق تو اسی بات پر تھا کہ یہ بشارت، اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے، لیکن چونکہ وہ نہایت متقی، محتاط اور متواضع تھے، اس لیے دل کے کسی گوشے میں شاید کھٹک یہ بھی ہو، کہ کہیں یہ اپنے ہی گنبدِ دل کی صدائے بازگشت نہ ہو، اس لیے عرض کیا کہ ''پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دیجیے'' (تاکہ مجھے علم ہو جائے کہ بیوی حاملہ قرار پا چکی ہے)۔ اس درخواست

کے جواب میں، جو نشانی ٹھہرائی گئی، وہ بجائے خود، اعجازی شان کی حامل ہے، کیونکہ جہاں تک لوگوں سے بات چیت کا تعلق ہے، اُن کی زبان، تین دن تک گفتگو پر قادر نہ رہی، اور وہ اشاروں کنائیوں میں بات کرنے پر مجبور رہے، اور جہاں تک اللہ تعالیٰ کے ذکر و شکر کا تعلق ہے، وہ زبان کے عمل و حرکت میں کوئی روکاوٹ نہ پاتے تھے، عوامی گفتگو میں، صحیح و سالم ہونے کے باوجود بھی، زبان کا نہ چلنا، اور عبادت و ریاضت اور اداءِ شکر و ذکر میں، لسان کا چلتے رہنا، صریحاً ایک معجزہ ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ تین ایام ہی میں، بصحت وسلامتی، اس غیر معمولی حالت کا برقرار رہنا، اور ان ایام کے علاوہ دیگر ایام میں حالتِ معمول پر آ جانا بھی ایک معجزہ ہے۔ مزید برآں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے، اس بات کی اطلاع ملنا کہ جب یہ غیر معمولی حالت تمہیں لاحق ہوگی، تو اس وقت تمہاری بیوی حاملہ ہوگی، اور اس خبر کے عین مطابق، صورتِ حال کا وقوع پذیر ہونا بھی، ایک معجزہ ہے۔

دو معجزاتی کرشمے:

یہاں کچھ دیر کے لیے ٹھہر کر، اگر غور و فکر سے کام لیا جائے، تو اس واقعہ میں، اللہ تعالیٰ نے دو ایسے کرشمے پیش کیے ہیں، جو مختلف ہونے کے باوجود، اپنے اندر معجزانہ شان رکھتے ہیں۔

ایک تو یہ، کہ حضرت زکریاؑ، حد سے بڑھے ہوئے بڑھاپے کا شکار ہیں، ان کی بیوی قطعی بانجھ ہے جو اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہے۔ میاں کا شدید بڑھاپا اور بیوی کا سنگین بانجھ پن، دونوں ہی ظاہری اسباب کی دنیا میں، ایسے نقائص ہیں، جو ولادتِ فرزند میں حائل ہیں۔ گویا نہ شوہر ہی میں ولادتِ پسر کا کوئی سبب، اور نہ ہی ان کی شریکۂ حیات میں کوئی صلاحیت موجود ہے، لیکن فقدانِ اسباب کے باوجود، اسی حالت میں، فرزند متولد ہو جاتا ہے۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ۔

دوسری طرف، نشانی پر غور فرمائیے، حضرت زکریاؑ صحیح و سالم ہیں، بَشَرًا سَوِيًّا ہیں۔ زبان میں کوئی روکاوٹ اور کوئی گرہ نہیں ہے۔ ذکر و شکر میں زبان چل رہی ہے۔ عبادت و

ریاضت ہیں زبان اپنا کام کر رہی ہے، اس شعبہ میں زبان کی قدرت برقرار ہے۔ لیکن...... لوگوں سے بات چیت کے معاملہ میں، یہ قدرت سلب ہو جاتی ہے، طاقتِ لسانی جواب دے جاتی ہے، اور زبان، اس امر پر قادر نہیں رہتی کہ وہ لوگوں سے گفتگو کر سکیں۔ انہیں مجبور ہو کر اشارہ و کنایہ سے کام لینا پڑتا ہے۔ گویا یہاں اسبابِ گفتگو موجود ہیں، لیکن نتیجۂ اسباب، بصورت گفتگو، برآمد نہیں ہوتا (حالانکہ یہی نتیجہ عبادت و ریاضت اور اداءِ شکر و ذکر میں ظاہر ہو جاتا ہے) جبکہ اس کے برعکس، پہلے واقعہ میں ولادت کے اسباب موجود نہیں ہیں، لیکن نتیجہ، بصورتِ ولادتِ پسر ظاہر ہو جاتا ہے، کس قدر دلچسپ اور حیرت انگیز ہیں، یہ معجزانہ کرشمے۔

آیت ۳/۴۱ کا غلط ترجمہ:

منکرینِ حدیث کی یہ عام عادت ہے کہ اعترافِ معجزات کے خطرات سے بچنے کے لیے، آیات کے ترجمہ و مفہوم میں تحریف سے کام لیتے ہیں۔ اب یہاں دیکھیے۔ ولادتِ پسر کی بشارت پا کر، جب حضرت زکریا علیہ السلام نے رَبِّ اجْعَل لِّي آيَةً کی درخواست کی، تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ''تیری نشانی یہ ہے کہ تو تین دن تک لوگوں سے کلام نہ کر سکے گا'' لیکن منکرینِ حدیث میں سے ہر کوئی، اس فرمانِ خداوندی کا ترجمہ غلط ہی کیا کرتا ہے، حتّٰی کہ پرویز صاحب بھی، ہمیشہ صحیح ترجمے سے گریزاں ہی رہے ہیں، چنانچہ وہ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ کا ترجمہ یوں بیان کرتے ہیں۔

''تم تین دن تک بات چیت نہ کرو ......''[1]

حالانکہ ان الفاظ میں، جو فعل مذکور ہے، وہ فعلِ مضارع ہے، نہ کہ فعلِ نہی۔ اگر یہ واقعی فعل نہی ہوتا تو لَا تکلم کی میم، مجرور ہوتی نہ کہ مفتوح۔ ایسی باتوں سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یا تو یہ حضرات، عربی زبان سے بالکل کورے ہیں، اور یا پھر یہ لوگ، جان بوجھ

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۳

کر، ان تحریفات کے درپے رہتے ہیں۔ دونوں میں سے خواہ کوئی بھی صورت ہو، یہ انتہائی گھناؤنی اور گھٹیا حرکت ہے۔ پہلی صورت میں، جہالت و بے خبری، اور دوسری صورت میں بددیانتی اور دانستہ تحریف کا عیب ظاہر ہی ہے۔

اس کے بعد، اگلی دو آیتوں میں، حضرت مریمؑ کے کچھ فضائل بیان کیے گئے ہیں۔

آیت ۴۲-۳/۴۳:

وَإِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰلكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰلكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِيْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِيْ وَارْكَعِيْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ

''اور جب فرشتوں نے کہا'' اے مریم! بیشک اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا اور پاک کر دیا، اور تمام دنیا کی عورتوں کے مقابلہ میں تمہیں چُن لیا۔ اے مریم! اپنے رب کی بندگی کرتی رہ، اور سجدہ کرتی رہ، اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرتی رہ۔''

آیت میں حضرت مریمؑ کے اصطفاء کا ذکر دو دفعہ آیا ہے، پہلے اصطفاء کا تعلق، اُن کے بچپن سے ہے، یعنی اللہ نے اوائل عمر ہی سے، انہیں بزرگی دے رکھی تھی۔ ماں نے حسین آرزوؤں کے ساتھ اسے جنم دیا۔لڑکی ہونے کے باوجود، اللہ تعالیٰ نے انہیں نذر کے طور پر قبول کیا، ان کے سامان خوردونوش کے لیے غیر معمولی اہتمام ہوا۔ یہ سب شواہد، آپ کے اصطفاء و بزرگی پر دلالت کرتے ہیں۔ رہی اُن کی تطہیر، جو مذکورہ فی الآیت ہے، تو یہ کئی پہلوؤں پر مشتمل ہے، کفر وشرک اور گناہوں کی آلائش سے وہ پاک ہیں، افعال ذمیمہ اور عادات قبیحہ سے وہ بالاتر ہیں، بہتاناتِ یہود سے وہ پاک ہیں، اور دوسرے اصطفاء کا تعلق، اُن کے دور بلوغ سے ہے، جس میں انہیں بغیر مسِ بشر، معجزانہ طور پر ماں بنایا گیا، اور ان کے نومولود نے شیر خوارگی کی حالت میں، معجزانہ کلام کے ذریعہ، اپنی ماں کو یہود کی تہمتوں سے بری قرار دیا، اور یوں وہ اور ان کی والدہ، اللہ تعالیٰ کی عظیم الشان نشانی ٹھہرائے گئے،

وَجَعَلْنَا هَا وَابْنَهَا اٰيَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء - ۹۱) وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ اٰيَةً (المومنون - ۵۰)

اس سے اگلی آیت میں، اس اصطفاء و بزرگی اور تطہیر و برگزیدگی پر، انہیں مشغولِ قنوت وعبادت رہنے کا حکم دیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ ایک طرف تو یہود کو یہ بتایا گیا ہے کہ مریمؑ، اپنے اخلاق و کردار میں ایسی نہیں تھی جیسی تم انہیں سمجھتے ہو، بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کی بڑی عبادت گذار، طاعت شعار، مخلص پرستار اور فرمانبردار تھیں۔ اور دوسری طرف نصاریٰ پر واضح کیا گیا کہ مریمؑ، نہ تو معاذ اللہ، خدا کی ماں تھیں اور نہ ہی خود خدا تھیں کہ وہ لائق پرستش ٹھہرتیں، بلکہ ان کی ساری بزرگی و برگزیدگی صرف اس بناء پر تھی کہ وہ اپنے مولیٰ و مالک کی انتہائی وفادار، پرستار، اور طاعت شعار تھیں۔

آیت ۳/۴۴ بطور جملہ معترضہ:

اس کے بعد، اگلی آیت میں، بطور جملہ معترضہ۔ حضرت نبی اکرم ﷺ کو خطاب کیا گیا ہے۔

ذَالِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ

"یہ (واقعات) غیب کی خبروں میں سے ہیں، جن کو ہم تیری طرف (اے نبیؐ) وحی کرتے ہیں، اور آپؐ اس وقت، اُن کے پاس نہ تھے جب وہ کفالتِ مریمؑ کی خاطر اپنی قلمیں پھینک رہے تھے، اور آپؐ اس وقت بھی ان کے پاس نہ تھے جب وہ جھگڑ رہے تھے۔"

اس آیت میں حضور اکرم ﷺ کو براہ راست خطاب کیا گیا ہے کہ (اے پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام) یہ واقعات وہ ہیں، جو آپؐ سے کئی سو سال قبل، ایک دوسرے ملک میں پیش آئے تھے، اور اب دنیا سے ان کی صحیح تاریخ تک مٹ چکی ہے، اور ان کے علم واقعی کا کوئی ذریعہ بھی، اب بجز وحیٔ الٰہی کے باقی نہیں ہے۔ ہم آپ پر بالکل ٹھیک وحی کے

ذریعہ، ان واقعات کا القاء کر رہے ہیں، اور یہ بجائے خود، آپؐ کے پیغمبرِ صادق، نبی برحق، اور مرسلِ حقیقی ہونے کی دلیل ہے۔

دوسری بات، جو آیت میں مذکور ہے، وہ یہ امر طے کرنے کے لیے، کہ مریمؑ کا کفیل کسے بنایا جائے، قرعہ اندازی ہے، جس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت مریمؑ، حالت یتیمی میں پیدا ہوئی تھیں، ان کے والد، حضرت عمران، نہ صرف یہ کہ خانۂ خدا کے امام اور خطیب تھے، بلکہ بیت اللہ کی خدمت و نگہداشت کے لیے، جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں اور مؤذنوں پر مشتمل پورے عملہ کے سردار بھی تھے۔ اس لیے سوال پیدا ہوا کہ اس یتیم بچی کی کفالت کون کرے؟ اس سعادت کو پالینے کے لیے، بیت المقدس کے خدمت گاروں، حضرت مریمؑ کے رشتہ داروں، اور حضرت عمران کے عقیدتمندوں کے درمیان اختلاف ہوا، جو نزاع کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کو طے کرنے کے لیے یہ قرعہ اندازی ہوئی جس کا ذکر، اس آیتِ (زیر بحث) میں ہے، اس مساہمت کے نتیجہ میں، حضرت زکریاؑ کفیل بنائے گئے۔ وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا.

پرویز اور مسخِ حقیقت:

امر واقعہ یہ ہے کہ قرآنی آیات کی تفسیر و توضیح کے دوران، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهِ کی کرشمہ سازی میں، پرویز صاحب کو یدطولیٰ حاصل تھا۔ وہ اس آیت میں مذکور کفالت کو، اُس کفالت سے الگ، ایک دوسرا واقعہ قرار دیتے ہیں، جو كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا کے الفاظ میں، آیتِ (۳۷) میں مذکور ہے، اندھے کی لاٹھی کے سہارے، چلنے کے باعث، ''صاحبِ کتاب'' بھی، اسی ڈگر پر چلتے ہوئے، یہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت زکریا، مریم کے بچپن میں، ان کے کفیل بنے تھے، سورۃ آل عمران میں ایک اور کفالت کا بھی ذکر ہے، جو قلموں کے پھینکنے سے کی گئی۔ اس وقت مریم بالغہ تھیں، اور حضرت یحیٰؑ، ابھی بچے تھے۔'' [1]

---

[1] ابنِ مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۹

بلاشبہ، مریم بعد میں بالغہ بھی ہوئیں، اور حضرت یحییٰ، اپنی پیدائش کے بعد، صبیانی حالت میں بھی رہے، لیکن یہ قرعہ اندازی، کسی دوسری کفالت کے لیے ہرگز نہ تھی۔ قرآن، دونوں جگہ، ایک ہی کفالت کا ذکر کرتا ہے۔ آیتِ زیرِ بحث میں، قرعہ اندازی کا مقصد یہ بیان کیا گیا ہے کہ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ ''مریم کا کفیل کون بنے؟'' علاوہ ازیں، کفالت مریم پر واقعۂ نزاع و مخاصمت، ایک ہی مرتبہ پیش آیا تھا جس میں قرعہ اندازی کے نتیجہ میں، حضرت زکریا کفیل قرار پائے۔ ایک واقعہ کی طرف، اگر کسی دوسری جگہ اشارہ کیا گیا ہو، تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ وہ واقعہ، دو مرتبہ پیش آیا ہے۔

واقعہ کفالت کے واحد واقعہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اَیُّھُمْ یَکْفُلُ مَرْیَمَ میں مذکور واقعہ کو، قرآن نے قصۂ مریم میں حکایتاً بیان نہیں کیا، بلکہ اس کا ذکر، ضمناً، بطور جملہ معترضہ، حضرت محمد ﷺ کو خطاب کرتے ہوئے کیا ہے۔ آیت کے ابتدائی الفاظ وَمَا کُنْتَ لَدَیْھِمْ اِذْ...... ہی یہ ظاہر کرتے ہیں کہ مخاطب، نبیٔ آخر الزمان ﷺ ہیں، اور آپ کی طرف (نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ) جن انباء و واقعات کی وحی جا رہی ہے، اُن میں وہ واحد واقعۂ کفالت بھی شامل ہے جس کا ذکر کَفَّلَھَا زَکَرِیَّا میں مذکور ہے۔

مزید برآں، اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَھُمْ اور اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ میں مذکور، اِذ کا کلمہ، کسی نئی کفالت پر نہیں، بلکہ ماضی ہی کی کفالت پر دلالت کرتا ہے، کیونکہ عربی زبان کے قواعد کے مطابق، اِذ، واقعاتِ ماضی کے بیان کے لیے ہی مستعمل ہے۔ خود پرویز صاحب اپنی لغات القرآن میں لکھتے ہیں:

> اِذ ..... جب، جس وقت، جس جگہ کے معنوں میں آتا ہے۔ یہ عموماً زمانہ ماضی (گزرے ہوئے زمانے) کے لیے آتا ہے۔'' [1]

زیرِ بحث آیت (۳/۴۴) میں، دُہری کفالت کے شاخسانہ کی لغویت کو واضح کرنے کے لیے، قرآن مجید ہی سے ایک مثال پیش کی جاتی ہے۔

---

[1] لغات القرآن، جلد ۱، صفحہ ۲۱۶

سورہ یوسف میں، حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری سرگزشت کو بیان کرنے کے بعد، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرتے ہوئے، یہ فرمایا گیا ہے:

ذَالِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ اَجْمَعُوا اَمْرَهُمْ وَهُمْ يَمْكُرُونَ (یوسف - ۱۰۲)

''یہ (قصہ) غیب کی خبروں میں سے ہے، جس کو ہم آپؐ کی طرف وحی کرتے ہیں، اور آپؐ ان کے پاس اسوقت موجود نہ تھے جب انہوں نے اجماع کیا اور وہ چالیں چل رہے تھے۔''

اب کیا اس آیت سے استدلال کرنا صحیح ہوگا کہ اس میں جس اجماع (اور جن چالوں) کا ذکر ہے، وہ برادرانِ یوسف کے اُس اجماع اور اُن چالوں کے علاوہ ہیں، جو قصۂ یوسف میں پہلے مذکور ہو چکی ہیں۔

اس آیت کی ساخت اور ترکیب الفاظ بالکل ویسی ہے جیسی سورۃ آل عمران کی زیر بحث آیت کی ہے، اور پھر دونوں میں خطاب بھی، حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو کیا گیا ہے۔ اگر سورہ یوسف کی آیت سے ایسا استدلال، غلط اور خلافِ حقیقت ہے، تو زیر بحث آیت سے بھی، ایسا استدلال غلط، اور ایسا استنتاج باطل ہے۔

ایک زمانہ تھا، جب پرویز صاحب، انبیاءِ سابقین کے معجزات کے بھی قائل تھے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش کو بھی تسلیم کرتے تھے، نیز علماءِ سلف و خلف کی ہمنوائی میں، واقعۂ کفالت کو اُس وقت کا واحد واقعہ ہونا بھی وہ مانتے تھے، جبکہ والدۂ مریمؑ، منذورہ کو ہیکل میں لے کر آئی تھیں، اُس دور میں، سورہ آل عمران کی اسی زیرِ بحث آیت (۳/۴۴) کا مفہوم، اِن الفاظ میں پیش کیا کرتے تھے۔

(اے پیغمبر!) یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جس کی ہم تم پر وحی کر رہے ہیں، ورنہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تم اُس وقت ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب (مریم کی ماں مریم کو لے کر ہیکل میں آئی تھی اور ہیکل کے مجاور) اپنے اپنے

قلم پھینک رہے تھے (کہ قرعہ ڈال کر فیصلہ کرلیں) کون مریم کا کفیل ہو، اور یقیناً تم اُس وقت بھی موجود نہ تھے، جب وہ (مریم کی کفالت کے لیے) آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ [1]

لیکن اس کے بعد، جب پرویز صاحب نے مسلکِ انکارِ معجزات کا کھلے بندوں پرچار شروع کیا، اور حضرت عیسٰی کی بن باپ ولادت کے قائل نہ رہے، تو قرآنی آیات کا مفہوم بھی بدلتا چلا گیا، اور کفالتِ مریم کو طے کرنے کا واحد واقعہ بھی ایک نہ رہا بلکہ دو ہو گئے، اور پھر وہ یہ فرمانے لگے کہ آیت (۳/۴۴) میں مذکور قرعہ اندازی کا تعلق، کفالتِ مریم کے اُس دوسرے واقعہ سے ہے، جس کا مقصد، پہلے واقعہ کی رو سے حضرت زکریا کی کفالت میں آئی ہوئی مریم کو، اُن کی کفالت سے نکالنا تھا۔ ''صاحبِ کتاب'' نے بھی، اندھے کی لاٹھی کا سہارا لے کر، مکھی پر مکھی مارتے ہوئے، اُسی موقف کو اپنے قلم سے اگل دیا ہے۔

مسخ حقیقت کا محرک:

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مسخِ حقیقت اور تحریفِ آیات کی ضرورت، پرویز صاحب کو کیوں پیش آئی، آپ غور فرمائیں گے تو فوراً اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ یہ سب کچھ انکارِ معجزات کی راہ ہموار کرنے کے لیے کیا گیا ہے۔ حضرت مریم، بلا مسِ بشر، حاملہ ہو جانے کے باعث، جس پریشانی وتشویش کے ساتھ، مبتلائے آزمائش ہوئیں، اس کا سبب، پرویز صاحب کچھ اور گھڑنا چاہتے تھے، چنانچہ انہوں نے اپنی اُس عقلِ عیار کی بناء پر، جسے وہ ''قرآنی بصیرت'' کہا کرتے تھے، مریم کی تشویش و پریشانی کی وجہ یہ تراشی کہ (۱) مریم نے بالغ ہوتے ہی، قوانینِ ہیکل کی خلاف ورزی کی، اور (۲) پھر اپنی مرضی سے شادی کر لی، اور (۳) اُن مجاورینِ ہیکل میں سے کسی کے ساتھ شادی نہ کی جو خدمتگارِ ہیکل تھے۔ اب اس خود ساختہ افسانۂ پرویز کی بناء پر، (بقول پرویز) لوگوں کی طرف سے ولادتِ عیسٰی کے وقت جو تہمت لگائی گئی تھی، وہ یہ نہیں تھی کہ مریم نے حملِ عیسٰی اور ولادتِ عیسٰی کے حوالہ

---

[1] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۴۸۸

سے کسی گناہ کا ارتکاب کیا تھا، بلکہ یہ تھی کہ انہوں نے قوانین ہیکل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے شادی کی اور اس طرح بچے کو جنم دیا۔

اب چونکہ مجاورینِ ہیکل میں سے (بقول پرویز) ہر ایک یہ چاہتا تھا کہ مریمؑ سے شادی کرے، یوں ہر ایک کی خواہش وتمنا نے اُن کے درمیان اختلاف پیدا کیا جو بعد میں نزاع ومخالفت میں ڈھل گیا، جسے رفع کرنے کے لیے، قرعہ اندازی تک نوبت پہنچی، اور یہ قرعہ اندازی کا واقعہ، اُس واقعۂ کفالت سے مختلف ہے جس کا ذکر، كَفَّلَهَا زَكَرِيَّا کے الفاظ میں مذکور ہے۔ لیکن اس تحریفی مفہوم میں الجھن یہ تھی کہ آیت میں ذکر کفالت کا ہے جس میں سرپرستی کا مفہوم پایا جاتا ہے، نہ کہ شوہریت کا۔ لیکن جب قرعہ اندازی کا مقصد، کفالت و سرپرستی کی بجائے، ''شوہریت'' قرار پایا، تو اس کے لیے پرویز صاحب نے اندازِ نگارش یہ اختیار کیا کہ لفظ کفالت کو (Inverted Commas) میں لاکر، اُس میں معروف معنٰی سے گریز کرتے ہوئے، ایک ''خاص مفہوم'' پیدا کیا۔ ملاحظہ فرمایئے، ان کا یہ اقتباس:

''معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ہیکل کے پجاریوں نے راہبات کے متعلق ضابطہ میں یہ ترمیم کر لی کہ راہبہ کو ان پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی کرنی ہوگی، جب شادی کا ''شرعی جواز'' موجود ہو تو پھر (ان پجاریوں) کی نگاہوں کا آلودہ ہو جانا، چنداں مستبعد نہیں ہوسکتا، اس وقت انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اس راہبہ کو (مریم کو) حضرت زکریا کی کفالت سے نکال کر، اپنی کفالت میں لے لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس ''کفالت'' کے پردہ میں ان کا مقصد کچھ اور تھا۔ اس ''مقصد'' کی طرف، قرآن مجید نے نہایت لطیف انداز میں اشارہ کیا ہے، اس نے کہا ہے کہ اس باب میں، ان میں باہمی جھگڑے تک نوبت پہنچ گئی، اور جب تصفیہ کی کوئی اور صورت باقی نہ رہی تو انہوں نے طے کیا کہ قرعہ ڈال لیا جائے، جس کے نام قرعہ نکل آئے، اسی کی تحویل میں اس لڑکی کو دیدیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس داستان کے ضمن میں رسول اللہ سے فرمایا کہ یہ تمام باتیں

آپؐ کو وحی کے ذریعہ بتائی جا رہی ہیں۔ ذالك من انباء الغیب ...
(۳/۴۴) ۱

جناب پرویز صاحب کی نگاہ "بڑی تیز" تھی۔ جس چیز کو وہ "ثابت کرنا" چاہتے تھے، اس کا اُنہیں، قرآن مجید میں "نہایت لطیف انداز میں اشارہ" نظر آ جاتا تھا (اگرچہ خلافِ مزاج، قرآن کے واضح حقائق کو دیکھنے کے لیے، اُن کی آنکھوں کی بینائی جواب دے جایا کرتی تھی)۔ پھر قرآن کے اس "نہایت لطیف انداز میں اشارہ" کی وضاحت کے لیے، مفہوم آیت میں، اپنی تحریفی صلاحیتوں کا اظہار یوں فرمایا کرتے تھے:-

وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ (۳/۴۳)

"اے رسول! تو اُن پجاریوں کے پاس نہیں تھا، جب وہ مریم کی کفالت کے لیے قرعہ اندازی کر رہے تھے، نہ ہی تُو اُس وقت، ان کے پاس تھا، جب وہ اس معاملہ میں باہمی جھگڑا کر رہے تھے۔" ۲

"تو پجاریوں کے پاس نہیں تھا"...... یہ تحریفِ مفہوم، محض اپنی سخنسازی کے لیے ہے۔ پرویز صاحب کے اس تحریفی ترجمہ کے مقابلہ میں، اِسی آیت کا، اُن ہی کے قلم سے کیا ہوا، وُہ صحیح ترجمہ بھی ایک نظر دیکھ لیجئے، جو اِس سے قبل، معارف القرآن، جلد سوم، صفحہ ۴۸۸ کے حوالہ سے پیش کیا جا چکا ہے، تا کہ یہ واضح ہو جائے، کہ "مفکرِ قرآن" صاحب کے صحرائے دماغ میں گمان وخیال کے اٹھنے والے ہر بگولے کے ساتھ، کس طرح مفہومِ آیات بھی بدل جایا کرتا تھا۔

بڑے میاں، سو بڑے میاں، چھوٹے میاں سبحان اللہ:

عربی زبان کا ایک شعر ہے:

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۷۹

۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۷۹

اذا کان رب البیت بالطبل ضاربا

فلا تلم الاولاد فیه علی الرقص

(یعنی جب صاحب خانہ ہی طبلے کی تھاپ پر اُتر آئے، تو پھر اُس کی اولاد، اگر ناچنے اور تھرکنے لگ جائے، تو انہیں چنداں ملامت نہ کیجئے)

''بڑے میاں'' نے تو صرف اتنا ہی کیا کہ ''کفالت'' کو (Inverted Commas) میں رکھ کر، معروف معنٰی کی بجائے، اُس میں ایک ''خاص معنٰی'' پیدا کر دیا، لیکن ''چھوٹے میاں'' نے اس سے آگے بڑھ کر، بڑی دیدہ دلیری کے ساتھ، ''کفیل'' کا معنٰی ہی ''شوہر'' قرار دے ڈالا۔

''ان میں سے ہر ایک، مریم کا سرپرست اور کفیل، اور دوسرے لفظوں میں شوہر بننا چاہتا تھا۔'' [1]

ایک اور مقام پر، یہی ''چھوٹے میاں'' پھر لکھتے ہیں:

''جب حضرت مریم جوان ہوئیں تو یہ متولی قرعہ اندازی کرنے لگے کہ کون مریم کا کفیل یعنی شوہر ہوگا۔'' [2]

یہ ہے منکرین حدیث کی، ''قرآن کی قرآن سے تفسیر'' کا انداز، جس میں امانت و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر، قرآنی تعلیمات میں اس طرح تحریف کی جاتی ہے کہ نہ اصول وقواعدِ زبان کا خیال رکھا جاتا ہے، اور نہ سیاق وسباق اور لغوی مدلولات کا۔ لیکن دعویٰ اس کے باوجود یہ ہے کہ ''ہم تصریف آیات کے ذریعہ، تفسیرِ قرآن کرتے ہیں''۔ اب آیتِ زیرِ بحث کے دونوں تراجمِ پرویز کو سامنے رکھ کر، قارئین خود سوچ لیں کہ یہاں تصریفِ آیات سے کام لیا گیا ہے، یا تحریفِ آیات سے۔

پھر کفیل بمعنی شوہر، دنیا جہان کی کسی کتابِ لغت میں موجود نہیں ہے، اور تو اور، خود پرویز صاحب کی لغات القرآن میں بھی یہ معنٰی نہیں پایا جاتا، لیکن قرآنی الفاظ کے ان خود

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۵۶ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۵

ساختہ معانی کے ساتھ، منکرین حدیث، یہ دعاوی کرتے ہوئے بھی نہیں تھکتے کہ:

"قرآن کریم کے سمجھنے کے لیے دو اصولی تقاضے بنیادی ہیں، یعنی محاورۂ عرب اور تصریفِ آیات۔ قرآن کریم نے خود تصریح کی ہے کہ وہ عربوں کی زبان میں نازل ہوا ہے، لہٰذا اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم اور متعین کیا جائے کہ زمانۂ نزولِ قرآن کے عرب، اس کے الفاظ کا مفہوم کیا لیتے تھے۔"[1]

ایک اور مقام پر، اسی دعویٰ کو ان الفاظ میں دُہرایا گیا ہے:

"یہ عربی مبین کی کتاب ہے، اس لیے اسے اسی صورت میں سمجھا جا سکتا ہے، جب معلوم ہو کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں، اہل عرب ان الفاظ کا کیا مفہوم لیتے تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔"[2]

حرام ہے جو کسی منکر حدیث نے کفیل بمعنی شوہر کی کوئی سند پیش کی ہو، یا دورِ نزولِ قرآن کے عربوں میں، اس "محاورۂ عرب" کے مستعمل ہونے کی دلیل پیش کی ہو۔ یہ معنوی تحریف اور لغوی انحراف، صرف اور صرف اس محرک کے تحت ہے کہ معجزات کو، تو بہر حال، تسلیم نہیں کرنا ہے، لہٰذا، اس روش پر چلتے ہوئے، قواعدِ زبان کو پس پشت ڈالتے ہوئے، سیاق و سباقِ آیات سے نظریں چُراتے ہوئے، "محاورۂ عرب" کا ڈھنڈورا پیٹتے ہوئے، اور تصریف آیات کا ڈھونگ رچاتے ہوئے، جس قرآنی لفظ میں، جس معنیٰ کو گھسیڑنا مطلوب ہو، اسے "نظریہ ضرورت" کے تحت گھسیڑ ڈالا جائے۔

قصۂ ثالثہ

ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام

جملہ معترضہ کے طور پر واقع، آیت (۳/۴۲) کے بعد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے ذکر کی ابتداء ہوتی ہے۔

---

[1] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۷۴ء، صفحہ ۱۷ [2] طلوع اسلام، دسمبر ۱۹۷۸ء، صفحہ ۴۴

آیت ۳/۴۵:

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ

''جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے، جس کا نام مسیح عیسی بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں صاحب وجاہت اور یکے از مقربین (بارگاہِ الٰہی) ہوگا۔''

اس آیت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے صفاتی اور ذاتی نام کے علاوہ، ان کی چند اور خوبیوں کا تذکرہ بھی ہے۔تاہم مندرجہ ذیل امور قابل لحاظ ہیں:

(۱) اسالیب قرآن میں سے ایک اسلوب یہ بھی ہے کہ وہ بعض اوقات، جمع کا لفظ بول کر، اس سے واحد اور واحد کا کلمہ بول کر، اس سے جمع کا صیغہ مراد لیتا ہے۔ آیت زیر بحث میں اگرچہ ملائکہ جمع کا لفظ ہے، لیکن قرآن کریم کے ایک دوسرے مقام کی روشنی میں، اس سے مراد، روح امین، حضرت جبرائیل علیہ السلام ہیں۔

(۲) کلمۃ منه سے مراد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔جیسا کہ سورۃ النساء میں مذکور ہے:

اِنَّمَا الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَ كَلِمَتُهٗ اَلْقٰهَآ اِلٰى مَرْيَمَ وَرُوْحٌ مِّنْهُ (النساء –)

''بیشک مسیح ابن مریم، اللہ کے رسول، اور اس کے کلمہ ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے مریم کی طرف القا کیا، اور اس کی طرف سے روح ہیں۔''

اس کلمۃ اللّٰہ (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) کی عظمت وعلو مرتبت کا یہ عالم ہے کہ ان کی پیدائش سے قبل، اللہ تعالیٰ نے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو پیدا فرما کر، اُن کا مصدق بنایا۔

حضرت عیسیٰ ہی کلمۃ اللہ کیوں؟:

چونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے ہوئی، اور یہی کلمہ، اُن کی پیدائش میں اصلی اور بنیادی بلکہ غالب عامل کی حیثیت رکھتا ہے، کیونکہ اسبابِ متعارفہ میں سے، یہاں ایک سبب (باپ) موجود نہیں ہے، اس لیے انہیں کلمۃ اللہ کہا گیا۔ اور یوں یہ ولادت، اعجازی خصوصیت کی حامل قرار پاتی ہے، جو منکرین حدیث کو ناقابل قبول ہے۔ چنانچہ وہ، اِس موقف کی تردید میں، یہ لکھتے ہیں کہ:

> ''ہر بیٹا، اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے پاس سے ہی آتا ہے، بلکہ ہر چیز، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے وجود میں آتی ہے، لہٰذا مفسرین کا یہ کہنا، جن میں طاہر سورتی بھی شامل ہیں کہ عیسےٰ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، اس لیے کلمة منه استعمال کیا گیا ہے، ایک بودا استدلال ہے۔'' [1]

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر ''ہر بیٹا، اللہ تعالیٰ کے حکم اور اس کے پاس سے ہی آتا ہے، بلکہ ہر چیز، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے وجود میں آتی ہے۔'' تو پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے خاص طور پر کلمة اللّٰه، كلمة منه اور روح منه جیسے الفاظ کیوں استعمال کیے گئے ہیں؟ کیا ہر انسانی مخلوق، بلکہ کائنات کی ہر چیز میں، عیسیٰ علیہ السلام شامل نہیں ہیں؟ اگر وہ شامل ہیں، تو ان کے لیے الگ یہ الفاظ کیوں آئے ہیں؟ پھر اگر واقعی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، عام لوگوں کی طرح، ماں باپ ہی کے ملاپ کا نتیجہ تھی، تو پھر کیا وجہ ہے کہ ہر شخص کو كلمة اللّٰه، كلمة منه اور روح منه نہیں کہا جاتا، اور یہ الفاظ، صرف اور صرف، حضرت عیسیٰ ہی کے لیے بولے جاتے ہیں؟

جملہ منکرین حدیث بالعموم اور جناب پرویز صاحب بالخصوص، لاف زنی کرتے ہوئے، خود کو اعلم الناس بالقرآن قرار دیا کرتے ہیں، اور باقی سب کو اپنے مقابلہ میں ہیچ و کمتر سمجھا کرتے ہیں۔ اسی زعم میں مبتلا ہو کر، ''صاحبِ کتاب'' یہ فرماتے ہیں کہ......

''ہر بیٹا، اللہ تعالیٰ کے حکم اور اُس کے پاس سے ہی آتا ہے''......اور اس پر کوئی قرآنی دلیل

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی ص ۲۱

پیش نہیں کرتے۔ اور اس کے ساتھ وہ یہ فرماتے ہیں کہ...... بلکہ ہر چیز، اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُنْ سے وجود میں آتی ہے۔ لیکن یہ کہتے ہوئے، وہ، یہ بھول جاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام، کوئی چیز یا شئے نہیں تھے بلکہ ایک شخصیت تھے۔ اور قرآن نے سرگزشتِ عیسیٰ کے تذکرہ کے دوران جہاں بھی کلمہ کُنْ کا ذکر کیا ہے، وہاں ''شے'' کا ذکر نہیں کیا ہے، مثلاً سورہ آلِ عمران میں، اُن کی ولادت کے ضمن میں، قرآن، یہ الفاظ استعمال کرتا ہے:

اِذَا قَضٰی اَمْراً فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنَ (اٰل عمران —)

''وہ جب کسی امر کو طے کر لیتا ہے، تو اُسے فرماتا ہے کہ ''ہوجا'' اور وہ (امر) ہوجاتا ہے۔''

اسی طرح سورہ مریم میں بھی ولادتِ مسیح کے ذکر میں، ''شے'' کا تذکرہ نہیں ہے۔

مَا کَانَ لِلّٰہِ اَنْ یَّتَّخِذَ مِنْ وَلَدٍ سُبْحَانَہٗ اِذَا قَضٰی اَمْراً فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (مریم — ۳۵)

''اللہ کا یہ کام نہیں کہ کسی کو بیٹا بنالے۔ وہ پاک ذات ہے۔ وہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے، تو کہتا ہے کہ ''ہوجا''، اور بس وہ ہوجاتا ہے۔''

لیکن ''شے'' یا کسی چیز کا تذکرہ وہاں موجود ہے، جہاں ولادتِ عیسیٰ کا ذکر، سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

اِنَّمَا قَوْلُنَا لِشَیْءٍ اِذَا اَرَدْنَاہُ اَنْ نَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْن......

(النحل — ۴۰)

''جب ہم کسی چیز (کے پیدا کرنے) کا ارادہ کر لیتے ہیں، تو بس اس سے ہمارا اتنا ہی کہنا ہوتا ہے کہ ''ہوجا''، تب وہ ہوجاتی ہے۔''

اِنَّمَا اَمْرُہٗ اِذَا اَرَادَ شَیْئًا اَنْ یَّقُوْلَ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ......(یٰسین — ۸۲)

''وہ تو بس جب کسی چیز کے پیدا کرنے کا ارادہ کرتا ہے، تو اُس کو کہہ دیتا ہے کہ ''ہوجا'' اور وہ ہوجاتی ہے۔''

بے سوچے سمجھے، جس آیت کو جہاں چاہا، وہاں چسپاں کر دینا، منکرینِ حدیث کا عام شیوہ ہے۔

(۳) عیسیٰ ابن مریم کے الفاظ سے، قرآن مجید، ایک طرف، اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مبنی برحق حیثیت بیان کر رہا ہے، تو دوسری طرف، وہ، یہود و نصاریٰ کی ہرزہ گوئیوں کی تردید بھی کر رہا ہے، جو انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختیار کر رکھی تھیں۔ چنانچہ، انہیں ''فرزندِ مریم'' کہتے ہوئے، قرآن کریم نے یہ حقیقت واضح کر ڈالی کہ وہ، خود تو بشر تھے ہی، فرزند بھی کسی دیوی، دیوتا یا مافوق البشر ہستی کے نہ تھے، وہ محض عورت ذات کے پیٹ سے پیدا ہوئے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ کے ضمن میں، مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کا یہ اقتباس بھی نذرِ قارئین کر دیا جائے:-

> اِس آیت میں، حضرت عیسیٰؑ کو ''ابن مریم'' کہہ کر، قرآن نے ان لوگوں کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے، جو نہایت کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰؑ، کسی باپ کے بیٹے تھے، تو آخر قرآن کو مسیح ابن مریم کہنے کی بجائے، اُن کے باپ کی طرف، ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیح ابن یوسف کہہ سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟ [۱]

مولانا اصلاحی مرحوم کے اقتباس کے آخر میں، جو سوال اٹھایا گیا ہے، اس کا جواب، منکرینِ حدیث نے بایں الفاظ پیش کیا ہے:-

> ''جہاں تک قرآن مجید کا، حضرت عیسیٰ کو عیسیٰؑ ابن مریم کہنے کا تعلق ہے، تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسی کنیت سے مشہور و معروف تھے۔'' [۲]

یہ جواب، ''صاحبِ کتاب'' کی بلا سوچے سمجھے بول دینے کی عادت کا کرشمہ ہے۔

---

۱ تفسیر تدبر قرآن، جلد ۲، صفحہ ۹۳ ۲ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۷

آیتِ زیرِ بحث میں، حضرت عیسیٰؑ کو "ابن مریم" اس وقت کہا جا رہا ہے، جب اُن کی پیدائش سے پہلے، حضرت مریم کو بشارتِ فرزندی دی جا رہی ہے، اور وہ بھی اس حالت میں، کہ بقولِ مریم، انہیں کسی مرد نے چھوا تک نہیں، وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَر اب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ، اپنی ولادت سے قبل ہی، "اسی کنیت سے مشہور و معروف تھے"؟

ممکن ہے کہ یہاں منکرین حدیث کی طرف سے یہ سخن سازی کی جائے، کہ اللہ تعالیٰ، عالم الغیب ہے، اُس نے یہاں بشارتِ فرزند دیتے ہوئے، یہ پیشگی خبر دیدی کہ وہ، ابن مریم کی "کنیت" سے مشہور و معروف ہوں گے۔ لیکن یہ سخنسازی بھی دو وجوہ سے قطعی لغو بلکہ باطل ہے۔

اولاً، یہ کہ "ابن مریم" کو قرآن کریم، کنیت کے طور پر نہیں، بلکہ اُن کے نسبی نام کے طور پر پیش کرتا ہے، اِسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ

ثانیاً، یہ کہ اُن کے نام مسیح اور عیسیٰ ابن مریم بیان کرنے والا خدا، خود یہ حکم دیتا ہے اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَائِهِمْ "تم انہیں، اُن کے باپوں کی طرف منسوب کرو" اگر واقعتاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی باپ تھا، تو اللہ تعالیٰ کو، اُنہیں، اُن کے باپ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہئے تھا، نہ کہ ماں کی طرف۔ اب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خود، اپنے قولی اصول کی عملاً خلاف ورزی کیا کرتا ہے؟

اور سنیئے، منکرین معجزات کہتے ہیں کہ اگر انہیں، عیسیٰ بن یوسف کہہ دیا جاتا، تو اس میں ایک خطرہ تھا، وہ کیا؟ ملاحظہ فرمائیے:-

"اگر عیسیٰ ابن یوسف کہا جاتا، تو لوگ، انہیں صاحب انجیل کی بجائے، کوئی اور عیسیٰ سمجھتے۔" [1]

اب ذرا غور فرمائیے، کہ آیا یہ کوئی عالمانہ دلیل ہے، یا جاہلانہ ڈھکوسلہ۔ "اگر واقعی (بقول منکرینِ حدیث) حضرت عیسیٰ کا باپ تھا، اور پھر اس کے بعد، حضرت عیسیٰؑ کو اپنے

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۱۰

باپ کی طرف منسوب کرنے کی "غلطی" اللہ تعالیٰ کر بیٹھتا، تو لوگ، انہیں صاحبِ انجیل نہ سمجھتے، بلکہ کوئی اور صاحب گمان کر بیٹھتے، چنانچہ لوگوں کو اس اشتباہ سے محفوظ رکھنے کے لیے، قرآن کریم کو مصلحتاً، عیسیٰ ابن یوسف کہنے کی بجائے، عیسیٰ ابن مریم کہنا پڑا۔

پاپوش میں لگائی کرن آفتاب کی
جو بات کی، خدا کی قسم، لاجواب کی

(۴) وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی وجاہت کے سلسلہ میں، مندرجہ ذیل پہلوؤں کو واضح فرمایا ہے:

"وجیہ کے لفظ سے اس سرداری کی شان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے، جس کا ذکر اوپر حضرت یحییٰ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیحؑ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی، لیکن اس کم سنی کے باوجود، ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہہ اور فریسی، سردار، کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے............

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ، سیدنا مسیح، بن باپ کے پیدا ہوئے، اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، لیکن سیدنا مسیح چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن سے پیدا ہوئے تھے، اس لیے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روزِ اول سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں رہی......"

''اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن، ان کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی دی جاتی ہے، لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم، اس سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ، اپنے رسولوں کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے، اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔'' [1]

آیت کے ساتھ منکرین حدیث کا سلوک:

اِس آیت کی توضیح و تشریح کے بعد، اب ذرا ایک نظر، اُس سلوک پر بھی ڈال لیجیے، جو منکرینِ حدیث نے اس آیت کے ساتھ روا رکھا ہے۔

اس آیت میں واقع الفاظ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيحُ کا ترجمہ، سب سے پہلے پرویز صاحب نے معارف القرآن میں بایں الفاظ پیش کیا۔

''اے مریم! اللہ اپنے کلام کے ذریعہ (ایک لڑکے کی) بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح عیسیٰ ہوگا۔'' [2]

اس کے بعد یہی ترجمہ، شعلہ مستور کے صفحہ ۳۴ پر، ایک ایسے ایڈیشن میں کیا گیا، جو اگرچہ میرے پاس نہیں ہے، لیکن مولانا طاہر سورتیؒ کے پاس موجود تھا، اور ہمارے ''تنقید نگار'' صاحب کو بھی، اُس ایڈیشن میں، اس ترجمہ کی موجودگی سے انکار نہیں ہے۔

پھر اسی قطعۂ آیت کا ایک اور ترجمہ، لغات القرآن کے حوالے سے، ان الفاظ میں ہمارے سامنے آتا ہے:

---

[1] تدبر قرآن، جلد۲، صفحہ ۹۲ تا صفحہ ۹۳ [2] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۴۹۰

"اے مریم! خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے۔" [۱]

اس کے بعد، مفہوم القرآن میں بھی، تقریباً ان ہی الفاظ میں یہی مفہوم پیش کیا گیا ہے:-

"خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوش خبری دیتا ہے۔" [۲]

اس ترجمہ (یا مفہوم) پر تنقید کرتے ہوئے، مولانا طاہر سورتیؒ صاحب فرماتے ہیں:

"واضح رہے کہ خوشخبری، خود بات ہوتی ہے۔ "ایک بات کی خوش خبری دینا" عامیانہ انداز کلام ہے۔ اسے اگر اپنی حد تک محدود رکھا جاتا، اور اللہ سے منسوب نہ کیا جاتا تو مناسب تھا۔ اگرچہ ذرا توجہ فرمائی جاتی تو اس کا صحیح ترجمہ بھی کیا جا سکتا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے شعلۂ مستور صفحہ ۱۱ پر، حضرت یحییٰ کے بارے میں، اسی مصدقا بکلمة من اللہ کا ترجمہ، پرویز صاحب کرتے ہیں "خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا۔" یعنی یہاں کلمہ کے معنیٰ بات یا کلام نہیں بلکہ "خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور" کے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ وہ کون سا ہونے والا ظہور تھا جس کی تصدیق حضرت یحییٰ فرما رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ ہیں۔ بات صاف ہو جاتی کہ بکلمة منه یا بکلمة من اللہ سے مراد، حضرت عیسیٰ ہی ہیں۔" [۳]

رہا وہ ترجمہ، جو اوپر، معارف القرآن اور شعلۂ مستور کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے، تو اس پر تنقید کرتے ہوئے، مولانا طاہر سورتیؒ صاحب فرماتے ہیں:-

"پرویز صاحب نے شعلۂ مستور صفحہ ۳۴ پر یبشرك بکلمة کے معنیٰ "تجھے اپنے کلام کے ذریعہ، ایک لڑکے کی بشارت دیتا ہے" کیے ہیں، جو قرآنی استعمال اور لغوی استعمال کے لحاظ سے بالکل غلط ہیں۔ دراصل بَشَّرَ کے

---

[۱] لغات القرآن، جلد ۳، صفحہ ۱۴۵۴   [۲] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۹

[۳] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۲۱

بعد، ب کے صلہ سے، خود اُس چیز کو بتایا جاتا ہے جس کی خوشخبری دی جاتی ہے، نہ کہ جس کے ذریعہ خوشخبری دی جاتی ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں بطور طنز ہے فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ''انہیں دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجیے'' (۳۱/۷) اسی طرح قرآن مجید میں ہے فَبَشَّرْنَاهُ بِغُلَامٍ ہم نے اسے ایک لڑکے کی خوشخبری دی (۱۰۰/۳۷)۔ یہاں بھی اس کا یہ ترجمہ غلط ہے کہ ہم نے ایک لڑکے کے ذریعہ خوشخبری دی۔ گویا بَشَّرَ کے بعد ''ب'' ذریعہ کے لیے نہیں، بلکہ بمعنٰی ''کی'' استعمال ہوتا ہے۔ یہی اس ب کے صحیح معنٰی ہیں۔ خود اسی کتاب شعلۂ مستور کے صفحہ ۱۰ پر، پرویز صاحب نے اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى کے معنٰی کیے ہیں ''خدا تمہیں یحیٰی کی (یعنی ایک لڑکے کی، جو پیدا ہوگا، اور اس کا نام یحیٰی رکھا جائے) بشارت دیتا ہے۔'' یعنی یہاں پرویز صاحب نے اس ب کے معنٰی ''کی'' کیے ہیں، جو درست ہیں۔'' [1]

پرویز صاحب کے غلط اور عامیانہ تراجم پر، مولانا طاہر سورتی صاحب کی اس مدلل اور جاندار تنقید کا جواب، ''صاحبِ کتاب''، اس طرح دیتے ہیں کہ وہ نہ تو ب کے ''ذریعہ'' کے معنوں میں استعمال کی قرآنی سند پیش کرتے ہیں، اور نہ جناب طاہر سورتی صاحب کی پیش کردہ آیات سے استدلال کی تردید ہی کرتے ہیں۔ لیکن پرویز صاحب کی موافقت اور طاہر سورتی صاحب کی مخالفت میں، جو حربہ استعمال کرتے ہیں، وہ ملاحظہ فرمائیے:

''جہاں تک پرویز صاحب کے ترجمہ ''تجھے اپنے کلام کے ذریعہ، ایک لڑکے کی بشارت دیتا ہے'' کا تعلق ہے جسے طاہر سورتی مرحوم نے، قرآنی اور لغوی استعمال کے لحاظ سے بالکل غلط قرار دیا ہے، تو آیت میں لڑکے کا ہم معنٰی کوئی لفظ موجود نہیں ......'' [2]

---

[1] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۲۳ [2] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۲۱

اس تارِ عنکبوت سے بھی کمزور جواب پر، اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ:

لڑتے ہیں اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

اگر "صاحبِ کتاب"، یہ انتہائی لچر اور لغو جواب دینے سے پہلے، (قرآنی آیت کا نہ سہی) پرویز صاحب کے مفہوم القرآن ہی کا مطالعہ کر لیتے تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ خود پرویز صاحب نے بھی کلمہ سے مراد فرزند ہی سمجھا ہے، ورنہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر "آیت میں لڑکے کا ہم معنٰی کوئی لفظ موجود نہیں ہے" تو پھر "مفکرِ قرآن" کو یہ کیسے پتہ چل گیا کہ کلمہ سے مراد، بالیقین لڑکا ہی ہے، کیونکہ وہ مفہوم آیت یوں پیش کرتے ہیں:-

"خدا تمہیں اپنی طرف سے ایک بات کی خوشخبری دیتا ہے یعنی ایک بیٹے کی، جس کا نام مسیح اور عیسیٰؑ ابن مریم ہوگا۔"[1]

اور پھر اس سے بھی آگے بڑھ کر، خود حضرت مریمؑ نے بھی، (باوجودیکہ "آیت میں لڑکے کا ہم معنٰی کوئی لفظ موجود نہیں ہے") کلمہ سے مراد بیٹا ہی سمجھا، اور اسی بنیاد پر، حیرت و استعجاب کے عالم میں، بارگاہِ رب العزت میں عرض کیا کہ "میرے ہاں بیٹا کیسے ہوگا جبکہ مجھے کسی مرد نے چھوا تک نہیں" (اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ) معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پہنچ کر، "صاحبِ کتاب" کو یہ خیال آ جاتا ہے کہ اگر "اگر آیت میں لڑکے کا ہم معنٰی کوئی لفظ موجود نہیں ہے" تو آخر، حضرت مریمؑ اس سے مراد لڑکا کیوں سمجھ لیتی ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی، ان کا ذہن پریشان ہو جاتا ہے، اور پھر وہ اپنے جملے کے ساتھ، "لیکن" کا جوڑ لگا کر، یوں سخن سازی کرتے ہیں:-

"لیکن حضرت مریم نے درست طور پر كلمة منه سے ولد (بطریق متعارف، اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کیا جانے والا لڑکا) سمجھا۔"[2]

"صاحبِ کتاب" نے حضرت مریم کی سلامتیٔ فکر اور صحتِ فہم کا اعتراف کیا بھی، تو اس حقیقت میں اپنے خود ساختہ، الحاقی اور اضافی الفاظ کا پھانہ ٹھونک کر۔ گویا منکرین

---

[1] مفہوم القرآن، صفحہ ۱۲۹ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۱

حدیث کی بکری، دودھ دیتی بھی ہے، تو مینگنیاں ڈال کر۔

بھلا کوئی ان سے پوچھے کہ اگر ''بطریقِ متعارف، ہی اللہ کی طرف سے انہیں بیٹا عطا کیا جانا تھا''، تو انہیں حیرت و استعجاب کے ساتھ، یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ''پروردگار! مجھے فرزند کیسے ہوگا جبکہ میں نہ تو بدکار رہی ہوں اور نہ مجھے کسی مرد نے چھوا ہے؟'' لیکن یہ باتیں تو وہ لوگ سوچ سکتے ہیں، جو قرآن کے پیچھے چلنا چاہتے ہیں اور کتاب اللہ سے ہدایت کے طلبگار ہیں، رہے وہ لوگ، جو قرآن کو اپنے پیچھے چلانا چاہتے ہیں، اور خدا کی کتاب کو خود ہدایت دینا چاہتے ہیں، تو وہ ایسی باتیں کیوں سوچیں؟

اس کے بعد، اگلی آیت ملاحظہ فرمایئے جس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی کچھ اور خصوصیات کا ذکر ہے۔

آیت ۴۶:

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ

''وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی باتیں کرے گا اور ادھیڑ عمر میں بھی، اور وہ صالحین (کے زمرے) میں سے ہوگا۔''

اس آیت کی تفسیر میں صاحبِ تدبر قرآن نے یہ فرمایا:

''سیدنا مسیح کا گہوارے میں باتیں کرنا، حضرت مریم کی پاکدامنی کے اظہار کے لیے، اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا، اس معجزے کی بشارت بچے کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی، حضرت مریم کو اس لیے دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنی ایک نشانی کے ظہور کے لیے، اُن کو واسطہ بنایا ہے تو ان کی ناموس کو اعداء کی بدزبانیوں سے بچانے کے لیے بھی، اس نے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ کسی تہمت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اپنی ایک مومنہ وقانتہ بندی کو ساری خدائی کی تہمتوں کا ہدف بنا دے اور اس کی مدافعت میں کوئی ایسی

زبان نہ کھولے جو سب کی زبان بند کر دے۔'' [۱]

قدرے آگے چل کر، وہ، پھر تحریر فرماتے ہیں:

''گہوارے میں کلام کے ساتھ، ان کے کہولت کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کے گہوارے کی بات، بچوں کی سی نہیں ہوگی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن و سال کی دانائی ہوگی، اس لیے کہ یہ بات من جانب اللہ ہوگی۔''

آخر میں وَمِنَ الصَّالِحِينَ فرما کر، یہ واضح کر دیا کہ وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے، یعنی ان تمام کمالات و اوصاف کے باوجود، یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی درجہ حاصل ہو جائے، وہ بس اللہ کے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔'' [۲]

علاوہ ازیں، گہوارہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کی صبیانی حالت کا اور پھر ان کی کہولت کی عمر کا تذکرہ بھی، اُن کے بارے میں عقیدۂ الوہیت کی تردید کرتا ہے، کیونکہ صبیانی حالت سے درجہ بدرجہ نشو ونما اور تغیر و تبدل کے مراحل میں سے گزر کر، سنِ کہولت کو پہنچنا، الوہیت کے قطعی منافی ہے۔

آیت ۳/۴۶ اور منکرین معجزات:

آیت کا سیدھا سادا اور صاف شفاف ترجمہ، جو خود ساختہ الفاظ کی بھرمار سے پاک ہو، منکرینِ معجزات کے لیے، ہمیشہ باعثِ الجھن ہوا کرتا ہے، اس لیے وہ قدم قدم پر، ایسی آیات کو مسخ و تحریف کا نشانہ بناتے ہیں، اور بعض اوقات تو ایسی لطیف فنکاری کا مظاہرہ کیا جاتا ہے کہ سرسری نظر سے مطالعہ کرنے والے قاری کو یہ محسوس تک نہیں ہوتا کہ ترجمہ و مفہوم میں کیا کاریگری کی گئی ہے۔ چنانچہ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً کا ترجمہ، سب سے پہلے، پرویز صاحب نے ان الفاظ میں پیش کیا۔

---

[۱] تدبر قرآن، جلد۲، صفحہ۹۳ [۲] تدبر قرآن، جلد۲، صفحہ۹۴

''بچپنے میں اور بڑی عمر میں کلام کرے گا۔'' [۱]

پھر شعلۂ مستور کے ایک ایڈیشن میں بھی بالکل یہی ترجمہ درج کیا گیا، اس پر جناب طاہر سورتی صاحب نے بایں الفاظ تنقید کی:

یہ مھد اور کھل کا غلط اور غیر دیانتدارانہ ترجمہ ہے۔ عربی میں پرویز صاحب کی اس اردو کا ترجمہ اس طرح ہوگا وَیکلم فی الصغر والکبر. اور پھر اس ترجمہ میں ایک اور تحت الشعور عقیدہ کی بناء پر، جناب پرویز صاحب نے الناس کا ترجمہ ہی اڑا دیا جس کے معنٰی لوگ ہیں۔ دراصل ایسی عمر میں، جس میں بچے پالنے میں رہتے ہیں، بچوں سے نہیں بلکہ لوگوں سے سنجیدہ قسم کی باتیں کرنا، ایک قابلِ غور بات ہے، اور پرویز صاحب کے ذہن میں ایسا ہونا خلافِ عقل ہے، لہٰذا، ایسے مواقع پر وہ قرآن مجید کی تاویل ہی نہیں بلکہ الفاظ کے غلط معنٰی بھی کر دیتے ہیں۔ اتنا ہی نہیں، وہ پورے لفظ کو غائب ہی کر دیتے ہیں۔ چونکہ ہمارا موضوع نہ کلام ہے، نہ مھد و کہل، لہٰذا، ہم یہاں اسی اشارہ پر اکتفاء کرتے ہیں۔'' [۲]

''صاحبِ کتاب''، مدافعتِ پرویز کا دم بھرتے ہوئے، مولانا طاہر سورتی صاحب کی تردید میں، یہ فرماتے ہیں:

سوال یہ ہے کہ بچہ پالنے میں ہو، تو کیا وہ اس کا بچپن نہیں ہوتا؟ تفسیر خازن نے ویکلم الناس فی المھد کا مفہوم وَیکلم الناس صغیرا (وہ لوگوں سے بچپن میں باتیں کرے گا) لکھا ہے، اور تفسیر مدارک التنزیل وحقائق التاویل نے ویکلم الناس طفلا لکھا ہے، اس کا معنٰی بھی وہی ہے، جو ویکلم الناس صغیرا کا ہے۔ کہل کا ''بڑی عمر میں'' ترجمہ بھی غلط نہیں۔ ادھیڑ عمر، بڑی عمر ہی ہوتی ہے۔ بچپن میں لوگوں سے باتیں کرنے کا مطلب

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۰ [۲] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۲۵

یہی ہے کہ ذہین ہوگا، اچھی اور بامعنٰی باتیں کرے گا۔ اور کھلا (بڑی عمر میں) ''لوگوں سے باتیں کرے گا'' کا مفہوم یہی ہے کہ دعوت اور رسالت کی باتیں کرے گا، کیونکہ صاحب کتاب اور نبی ہوگا۔ اگر پرویز صاحب نے الناس کا ترجمہ نہیں کیا تو اسے سہو پر محمول کیا جا سکتا ہے۔ [1]

منکرین حدیث کی یہ عام عادت ہے کہ وہ عربی کے قطعی المفہوم الفاظ کا ترجمہ، اردو کے ایسے الفاظ سے کرتے ہیں، جو مبہم یا اضافی و نسبتی مفہوم رکھتے ہیں۔ ہر بڑے کے مقابلہ میں، ہر چھوٹا صغیر ہے، اور ہر چھوٹے کے مقابلہ میں ہر بڑا، کبیر ہے۔ ان اضافی مفاہیم کے لحاظ سے، عمروں کے تناسب سے وابستہ کرتے ہوئے، صغیر اور کبیر کے الفاظ کو، یہ لوگ، مغالطہ آفرینی کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ اسی طرح ایک لفظ ''بچپن'' ہے، جسے وابستگانِ طلوع اسلام ''فِي الْمَهْدِ'' کا ترجمہ قرار دیا کرتے ہیں۔ حالانکہ اس لفظ کا اطلاق، حالتِ پیدائش سے لے کر، مسیں بھیگنے کی عمر تک (یا کم از کم لڑکپن کی عمر تک) کی جملہ درمیانی حالتوں میں سے ہر حالت پر ہوتا ہے۔ مثلاً ایک نوزائیدہ بچہ (ولید) کی حالت بھی، ''حالتِ بچپن'' ہوتی ہے، پیدائش کے بعد، سات دن کی عمر تک کا بچہ (صدیغ) بھی، ''حالتِ بچپن'' ہی میں ہوتا ہے۔ شیر خوار بچہ (صَبِیّ) بھی، ''حالتِ بچپن'' ہی میں شمار ہوتا ہے۔ جس بچے کے دانت گرنے کے بعد، دوبارہ نکل آئیں، وہ بچہ بھی (مثغر یا متغر ہونے کے باوجود) ''حالتِ بچپن'' ہی کا فرد شمار ہوتا ہے، جس بچے کا دودھ چھوٹ جائے، وہ بچہ بھی ''حالتِ بچپن'' ہی میں قرار پاتا ہے۔ دودھ چھوٹنے کے بعد، جب اس کا بدن، قدرے سخت ہو جاتا ہے اور اس کے اعضاء کا ڈھیلا پن زائل ہو جاتا ہے، تو ایسا بچہ (جحوش) بھی ''حالتِ بچپن'' ہی میں سمجھا جاتا ہے۔ جب وہ سیدھا ہو کر چلنے سے قبل، رینگنے اور گھسٹنے کی حالت میں ہوتا ہے، تو وہ (دارج) بھی، ''حالتِ بچپن'' ہی میں گردانا جاتا ہے۔ جب اس کی لمبائی (یا قد و قامت) پانچ بالشت تک پہنچ جائے تب بھی وہ (خماسی) ''حالت

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۳

بچپن'' ہی میں شمار ہوتا ہے۔ جب وہ لڑکھڑانے کی عمر کو پہنچتا ہے، تب بھی وہ ''حالتِ بچپن'' ہی کا ایک فرد کہلاتا ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ مکتب و مدرسہ میں جانے کی عمر کو پالیتا ہے، تب بھی اسے ''حالتِ بچپن'' ہی میں شمار کیا جاتا ہے، بلکہ پرائمری جماعتوں میں سے، وہ جس فصل میں بھی ہو، اُسے ''حالتِ بچپن'' ہی میں قرار دیا جاتا ہے، اس عمر میں کوئی شک نہیں کہ عادتاً اور معمولاً بچے خوب باتیں کیا کرتے ہیں۔ اب ذرا سوچیے، کہ پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی یا پانچویں جماعت میں پڑھنے والے بچے کی باتوں پر ''تکلمِ فی المهد'' کا اطلاق ہوسکتا ہے؟ یا پھر سکول جانے والے بچے کو فِي المهد صبيا کہا جا سکتا ہے؟ کیا بچے جب پنگھوڑے میں پڑے ہوں، تو وہی زمانہ، عادتاً ''لوگوں سے باتیں کرنے'' کا زمانہ ہوا کرتا ہے؟ حقیقت یہ ہے کہ ''تکلمِ فی المهد'' کے معجزہ کو، ایک عام واقعہ قرار دینے کے لیے، ''فی المهد'' کا ترجمہ ''بچپن'' کیا جاتا ہے۔ اور یہ معنوی تحریف، صرف اور صرف انکار معجزات کی راہ ہموار کرنے کے لیے کی جاتی ہے، اور پھر اسی چالبازی کی بناء پر، جس کے تحت یہ غلط ترجمہ کیا جاتا ہے، یہ سوال داغا جاتا ہے کہ...... ''جب بچہ پالنے میں ہو، تو کیا وہ اس کا بچپن نہیں ہوتا''...... یقیناً پالنے میں پڑا ہوا بچہ بھی، ''حالت بچپن'' ہی میں ہوتا ہے، اور سکول جانے والی عمر کا بچہ بھی ''حالت بچپن'' ہی میں ہوتا ہے، لیکن منکرینِ معجزات، اپنے ذہنی تحفظات کے پیشِ نظر، يكلم الناس فى المهد کا ترجمہ ''گود یا گہوارے، یا پالنے یا پنگھوڑے میں، لوگوں سے کلام کرنے والا بچہ'' کرنے کی بجائے، ''بچپن میں باتیں کرنے والا بچہ'' قرار دیتے ہیں، اور پھر اپنی قرآن فہمی اور ہمہ دانی کے زعم میں، معجزۂ تکلمِ فی المهد کا انکار کرنے کے لیے، ہر بچہ کی یہ خوبی بیان کرتے ہیں کہ:

''ذہین بچے چھوٹی عمر میں، اچھی اور بامعنی باتیں کیا کرتے ہیں۔'' [1]

اور ساتھ ہی، یہ لوگ، یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ وہ، قرآن کی تفسیر، قرآن ہی سے کرتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا کے الفاظ استعمال کر کے، بچپن کی

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۲

صرف وہ حالت مراد لی ہے، جو دودھ چھوٹنے سے قبل (شیر خوارگی) کی حالت ہوتی ہے، کیونکہ صَبِیٌّ کے یہی معنیٰ ہیں۔خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

''الصَبِیُّ، وہ بچہ جس کا دودھ نہ چھڑایا گیا ہو......'' [1]

لیکن پرویز صاحب الصَبِیُّ کا یہ درست اور صحیح معنیٰ لکھنے کے بعد، پھر اپنے تحت الشعور عقیدہ کی رعایت کرتے ہوئے، یہ غلط بات بھی، اس کے متصل ساتھ ہی درج کر دیتے ہیں:

''یا جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو۔'' [2]

حالانکہ ''جو ابھی بالغ نہ ہوا ہو، یا قریب البلوغ ہو'' اسے صغر سنی کے اعتبار سے، اگر کوئی نام دیا بھی جا سکتا ہے، تو وہ طفل کا نام ہو سکتا ہے، جیسا کہ قرآن میں آیا ہے وَإِذَا بَلَغَ الْاَطْفَالُ مِنكُمُ الْحُلُمَ (جب بچے حالتِ بلوغ کو پہنچنے لگیں تو......)۔ تاہم ایسی عمر کے فرد کے لیے، عربی زبان میں مراھق اور یافع کے الفاظ بھی مستعمل ہیں۔

اسی طرح ''بڑی عمر'' میں، (جسے منکرین معجزات کھلا کا ترجمہ قرار دیتے ہیں) ادھیڑ عمری، بڑھاپے اور شیخوختِ فانیہ کی تینوں حالتیں شامل ہیں، جبکہ قرآن کریم نے کھلا کا لفظ استعمال کر کے، (مذکورہ تینوں حالتوں میں سے) ادھیڑ عمری کی صرف پہلی حالت مراد لی ہے۔ لیکن منکرین حدیث اور فتنۂ انکارِ معجزات کے علمبردار، قرآن کے قطعی المفہوم لفظ (کھل) کا معنیٰ و مفہوم، ''بڑی عمر'' کے مرکب توصیفی سے کرتے ہیں، جو کثیر الجہات معانی کا حامل ہے، اور جس میں ادھیڑ عمری، بڑھاپا اور شیخوخت فانیہ کی تینوں حالتیں داخل ہیں۔

رہا، خازن و مدارک التنزیل کے حوالہ سے فِي الْمَهْدِ کا ترجمہ، جو صغیر کے لفظ سے کیا گیا ہے، تو وہ سرسری انداز میں، اُس دور میں کیا گیا تھا، جب ان کے سامنے، منکرینِ معجزات کی یہ استدلالی موشگافیاں نہیں تھیں، ورنہ وہ ''صغر سنی'' اور ''بچپن'' کی حالتوں میں سے، ہر حالت کی وضاحت اُسی طرح کر دیتے، جیسی وضاحت ہم نے کی ہے،

---

[1] + [2] لغات القرآن، جلد۳، صفحہ۱۰۰۷

اور جو منکرین معجزات کی مخصوص ذہنی افتاد کے پیشِ نظر، دورِ حاضر کا ایک ناگزیر تقاضا قرار پا گئی ہے۔

الغرض، یہ منکرینِ حدیث اور فتنۂ انکارِ معجزات کے علمبردار لوگ، قرآنی آیات کے تراجم میں، اپنے تحت الشعور عقائد کے تحت، یا تو مبہم اور غیر واضح الفاظ استعمال کرتے ہیں، یا پھر بین القوسین، اپنے خود ساختہ الفاظ کا اضافہ کرتے ہیں، اور ''صاحبِ کتاب'' یہ دونوں حربے اپناتے ہوئے، مفہومِ آیت کو بایں الفاظ پیش کرتے ہیں:

اس موقع پر فرشتوں نے، انہیں، اللہ کے حکم، ارادہ اور وعدہ سے پیدا ہونے والے بیٹے کی خوش خبری دی، جس کا نام مسیح عیسٰی بن مریم ہوگا (یعنی اللہ کی ایک خادمہ کا بیٹا ہوگا)، جو دنیا اور آخرت میں آبرومند اور یکے از مقربین ہوگا۔ بچپن میں لوگوں سے (ذہین ہونے کی وجہ سے، اپنی سمجھ کے مطابق، نیکی کی) باتیں کرے گا، اور بڑی عمر میں (نبی بنائے جانے اور کتاب دیئے جانے کی وجہ سے، دعوت و رسالت کی) باتیں کرے گا، اور صالحین میں سے ہوگا۔'' [1]

اس مقام پر، بین القوسین بےمحل الفاظ کا استعمال، اور پھر **فی المھد** کا ترجمہ ''بچپن'' اور **کَھْل** کا معنٰی ''بڑی عمر'' کرنا، جس نیت و مقصد کے تحت واقع ہوا ہے، اسے بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔

آیت ۳/۴۷:

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّ لَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ

''(مریم نے) کہا ''میرے پروردگار! میرے ہاں بیٹا کیسے پیدا ہوگا جبکہ مجھے کسی فردِ بشر نے چھوا تک نہیں؟'' فرمایا ''اسی طرح، اللہ جسے چاہتا ہے، پیدا کر دیتا ہے، جب وہ کسی معاملہ کو طے کر لیتا ہے، تو وہ صرف یہ کہتا ہے، ''ہو جا'' اور وہ ہو جاتا ہے۔''

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۱

اس آیت میں، حضرت مریم، اسی طرح حیرت و استعجاب کا اظہار کرتی ہیں جس طرح حضرت زکریاؑ نے کیا تھا۔ یہاں بھی خلقِ ولد کے ظاہری حالات و اسباب نا مساعد ہیں، اور وہاں بھی کچھ ایسی ہی صورتحال تھی، بلکہ یہاں صورت حال، کچھ زیادہ ہی خستہ اور پیچیدہ ہے، کیونکہ حضرت زکریاؑ کے معاملہ میں، پیدائشِ ولد کے لیے، ماں اور باپ دونوں ہی موجود تھے، اگرچہ ماں قطعی بانجھ اور باپ، از حد بوڑھا تھا، لیکن یہاں حضرت مریم کے سلسلہ میں، تو باپ موجود ہی نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ حضرت زکریاؑ کے قصہ میں، پیدائشِ ولد کے لیے، حالات کی عدمِ مساعدت میں، اللہ تعالیٰ نے كَذَالِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَايَشَاءُ کہہ کر، انہیں تسلی دی، اور یہاں، جبکہ باپ سرے سے موجود ہی نہیں ہے، كَذَالِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ ...... فرما کر، حضرت مریمؑ کے حیرت و استعجاب کا ازالہ کیا گیا۔ یہاں مولانا عبدالماجد دریابادی نے کیا ہی خوب حاشیہ لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں:

"رفعِ استبعاد کے لیے، حضرت مریم کو یہاں یاد دلایا جا رہا ہے کہ نظر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہئے کہ وہی فاعلِ حقیقی ہے، نہ کہ اسباب طبعی و ظاہری پر کہ ان کی حیثیت محض واسطہ اور ذریعہ کی ہے۔

كَذَالِكِ یعنی مسِ بشر کے بغیر ہی۔ يَخْلُقُ مَايَشَاءُ، ابھی چند ہی آیتیں قبل، ذکرِ زکریا علیہ السلام اور بڑھاپے میں ان کی اولاد کا آچکا ہے۔ وہاں اس موقع کے لیے جو آیت تھی، اس کے الفاظ تھے، كَذَالِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ. وہاں يَفْعَلُ اور یہاں يَخْلُقُ کا استعمال محض اتفاقی نہیں۔ مفسر محقق ابو حیان غرناطی نے خوب لکھا ہے کہ وہاں تو ولادت عام سنت الٰہی کے مطابق یعنی مرد و زن کے اتصال سے تھی، برخلاف اس کے، یہاں عام و جاری سنت الٰہی سے ہٹ کر، بغیر مرد و زن کے اتصال کے صرف عورت ہی سے ولادت کا تحقق کرانا ہے، اس لیے، یہاں لفظ يَخْلُقُ لایا گیا، جو حق تعالیٰ کی صفتِ ایجاد و اختراع پر دلالت کرتا ہے۔"[1]

---

[1] تفسیر ماجدی، صفحہ ۱۳۴

رہا اللہ تعالیٰ کا قولِ كُنْ اور اس کا نتیجہ فَيَكُوْن ، تو اس سے کیا مراد ہے؟ صاحبِ تفسیر ماجدی فرماتے ہیں:

''مراد صرف یہ کہ ارادۂ الٰہی ، اور اس کی تعمیل کے درمیان، کوئی شے حائل یا حاجب نہیں ہے۔'' ۱؎

تحریفِ مفہوم کے لیے، محرفینِ مفہومِ قرآن، یہاں كُنْ فَيَكُوْن والے قطعۂ آیت کے ترجمہ میں، اضافی الفاظ داخل کرتے ہوئے، تحریفِ مفہوم کرتے ہیں، اور لکھتے ہیں:

''یہ حکم، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''کن'' کہنا ہے۔ یعنی ''ہو جا''، اور جس کام کے لیے، یہ حکم کیا جاتا ہے وہ (اس کے قواعد کے مطابق) ہو جاتا ہے۔'' ۲؎

آگے چل کر، صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا ارادہ کرتا ہے، تو اسے کہتا ہے ہو جا، تب وہ کام (اس کے قواعد کے مطابق) ہو جاتا ہے۔'' ۳؎

آیت قرآن میں، فَيَكُوْن کے ساتھ ''اس کے قواعد کے مطابق'' ہونے کی کوئی شرط سرے سے موجود ہی نہیں ہے، قرآن کریم نے اس کو مطلق رکھا ہے، لیکن انکارِ سنت اور انکارِ معجزات کے علمبردار، خدا کے ان مطلق الفاظ کو، اپنی خود ساختہ شرائط سے محدود و مقید کرنے پر تل جاتے ہیں، اور یہ چاہتے ہیں کہ کتاب اللہ سے وہ مفہوم نہ نکلے، جو خود قرآن پیش کرنا چاہتا ہے، بلکہ صرف وہ مفہوم برآمد ہو، جسے وہ خود برآمد کرنا چاہتے ہیں، اور ایسی کارگزاریوں کے ساتھ ساتھ، وہ اس زعم باطل میں بھی مبتلا رہتے ہیں، اور اعلان بھی کرتے رہتے ہیں کہ وہ ''قرآن کی تفسیر، قرآن سے'' کرتے ہیں۔

اس کے بعد، حضرت عیسٰی علیہ السلام کے منصبِ رسالت اور معجزات کو پیش کرنے والی چند آیات ہیں۔ منصبِ رسالتِ عیسوی کو، اس لیے واضح کیا گیا کہ ان کی واقعی حیثیت

۱؎ تفسیر ماجدی، صفحہ ۱۳۴ ۲؎ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۰
۳؎ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۵

بیان کر کے، ایک طرف تو یہود کی غلط فہمیوں بلکہ افتراء پردازیوں کا ابطال کیا جائے، جو انہیں معاذ اللہ، ساحر اور شعبدہ باز قرار دیا کرتے تھے، اور دوسری طرف، نصرانیوں کی ان بیہودگیوں کی تردید کی جائے، جو اُنہیں، خدا یا فرزندِ خدا بنا بیٹھے تھے۔

☆............☆............☆

باب سوم

ولادتِ مسیح علیہ السلام سے وابستہ تین معجزانہ پہلو

(سورہ مریم کی روشنی میں)

اس کرہ ارض پر، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، جسقدر بھی رہے ہیں، ایک معجزانہ شان سے رہے ہیں، حتّٰی کہ ان کی پیدائش بھی، ایک معجزہ تھی، قرآن بیان کرتا ہے کہ:

وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ آيَةً وَّ آوَيْنٰهُمَا إِلٰى رَبْوَةٍ ذَاتِ قَرَارٍ مَّعِيْنٍ

(المؤمنون — ۵۰)

''اور ابن مریم اور اسکی ماں کو، ہم نے ایک نشان بنایا اور ان (دونوں) کو ایک سطح مرتفع پر رکھا، جو جائے قرار تھی اور جاری چشموں کی جگہ تھی۔''

اس آیت میں، اللہ تعالیٰ نے، نہ تو یہ فرمایا کہ...... ''ایک نشانی ابن مریم تھے اور ایک نشانی خود مریم''...... اور نہ ہی یہ فرمایا کہ...... ''ابن مریم اور مریم، دونوں کو دو نشانیاں بنایا''...... بلکہ فی الواقعہ فرمایا یہ ہے کہ...... ''دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے''...... اس کا مطلب، اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ...... ''مرد کی صحبت کے بغیر، مریم کا حاملہ ہونا، اور باپ کے بغیر، ابن مریم کا پیدا ہونا'' ہی وہ چیز ہے جو دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے۔

قرآن کریم، آپؑ کی پیدائش کو، اگرچہ چند مقامات پر پیش کرتا ہے، لیکن سب سے زیادہ تفصیل، سورہ مریم ہی میں ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا قَالَتْ إِنِّيْ أَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ إِنْ كُنْتَ تَقِيًّا قَالَ إِنَّمَا أَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِأَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا قَالَتْ أَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ

وَّلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ۝ قَالَ كَذٰلِكِ ۝ قَالَ رَبُّكِ
هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا
فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ
النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا فَنَادٰىهَا مِنْ
تَحْتِهَاۤ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْۤ اِلَيْكِ
بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسٰقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا ۝ فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ
عَيْنًا فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَدًا فَقُوْلِيْۤ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْمًا
فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ
جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا ۝ يٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا
كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي
الْمَهْدِ صَبِيًّا قَالَ اِنِّيْ عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتٰبَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَّجَعَلَنِيْ
مُبٰرَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا
وَّبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا ۝ وَالسَّلٰمُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ
وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ۝ ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ
الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (مریم — آیات ۱۶ تا ۳۴)

''(اے محمدؐ!) اس کتاب میں سے مریم کا حال بیان کر جبکہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر شرقی جانب گوشہ نشین ہو گئی تھیں، اور پردہ ڈال کر، ان سے چھپ بیٹھی تھی اس حالت میں، ہم نے ان کے پاس، اپنی روح (فرشتے) کو بھیجا اور وہ اسکے سامنے ایک پورے انسان کی شکل میں نمودار ہوا، مریم بول اٹھی ''تو اگر خدا ترس آدمی ہے تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔'' اس نے کہا، ''میں تو تیرے رب کا فرستادہ ہوں اور اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔'' مریم نے کہا ''مجھے لڑکا کیسے ہوگا جبکہ مجھے نہ کسی بشر نے چھوا

ہے اور نہ ہی میں بدکار ہوں'' فرشتے نے کہا، ''ایسا ہی ہوگا تیرا رب فرماتا ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے آسان ہے اور ہم یہ اسلیے کریں گے کہ اس لڑکے کو لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں اور اپنی طرف سے ایک رحمت، اور یہ کام ہو کر رہنا ہے''۔ مریم کو اس بچے کا حمل ٹھہر گیا اور وہ اس حمل کو لیے، ایک دور کے مقام پر چلی گئی۔ زچگی کی تکلیف نے اسے کھجور کے درخت کے نیچے پہنچا دیا، وہ کہنے لگی'' اے کاش! میں اس سے پہلے ہی مر جاتی اور میرا نام ونشان نہ رہتا'' فرشتے نے پائینتی سے اسکو پکار کر کہا'' غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے تو اس درخت کے تنے کو ہلا، تیرے اوپر تازہ کھجوریں ٹپک پڑیں گی پس تو کھا اور پی اور اپنی آنکھیں ٹھنڈی کر۔ پھر اگر کوئی آدمی تجھے نظر آئے تو اس سے کہدے کہ'' میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے اس لیے آج کسی سے نہ بولوں گی'' پھر وہ بچے کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم میں آئی، لوگ کہنے لگے'' یہ تو، تُو نے بڑا پاپ کر ڈالا، اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدکار تھی'' مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا۔ لوگوں نے کہا'' ہم اس سے کیا بات کریں جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے'' بچہ بول اُٹھا، ''میں اللہ کا بندہ ہوں اُس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں۔ اور نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا، سلام ہے مجھ پر جبکہ میں پیدا ہوا، اور جبکہ میں مروں اور جبکہ میں زندہ کر کے اٹھایا جاؤں، یہ ہے عیسیٰ ابن مریم، اور یہ ہے اسکے بارے میں سچی بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔''

یہ آیات اپنے مفہوم میں بالکل صاف، صریح اور واضح ہیں، اگر انسان پہلے سے کوئی ذہن نہ بنا چکا ہو، اور ترجمۂ قرآن میں، بین القوسین، خود ساختہ اضافوں سے پرہیز کیا

جائے، تو وہ حضرت عیسیٰؑ کی بے باپ ولادت کا قائل ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا، اس واقعہ میں درج ذیل امور خارقِ عادت اور معجزانہ پہلو لیے ہوئے ہیں:

(۱) فرشتے سے عیاناً ہم کلام ہونا

(۲) مریمؑ کا بغیر صحبتِ مرد کے حاملہ ہونا

(۳) نوزائیدہ بچے کا کلام کرنا

(الف) فرشتے سے عیاناً ہم کلام ہونا:

اس واقعہ میں، پہلی چیز، جو خلافِ عادت، وقوع پذیر ہوئی ہے، وہ انسانی شکل میں فرشتے کا نمودار ہونا ہے (فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيًّا) پھر مریمؑ جیسی عفیفہ و پاکدامن عورت کا، اسے دیکھتے ہی استعاذہ کرنا، اور فرشتے کا خدائی پیغام رساں ہونے کی حیثیت سے مریمؑ کو بشارتِ پسر دینا، اور اس کا اس بناء پر اظہارِ تعجب کرنا کہ اسے کیسے لڑکا پیدا ہوگا جبکہ نہ تو وہ شادی شدہ ہے کہ کسی مرد نے اسے چھوا ہو، اور نہ وہ کوئی بدکار خاتون ہے، بلکہ اس کے برعکس، وہ ایسی کنواری عورت ہے کہ جس کے قریب تک کوئی مرد نہیں پھٹکا ہے، پھر فرشتے کا اسے، اسی حالتِ دوشیزگی اور کنوارپن میں پاکباز بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے، یہ کہنا کہ یہ اللہ کے ہاں ایک طے شدہ امر ہے، اور یہ کہ نوزائیدہ بچے کو، اللہ تعالیٰ ایک نشانی بنانا چاہتا ہے، یہ سب کچھ یقیناً، نہ صرف یہ کہ خلافِ عادت اور خلافِ معمول ہے، بلکہ صریحاً خارقِ عادت امر ہے۔

(ب) مریمؑ کا بغیر صحبتِ مرد کے حاملہ ہونا:

پھر اس حالت میں (كَذَالِكَ)، بغیر اس کے کہ منکوحہ ہونے کی صورت میں کسی مرد نے، مریمؑ کو چھوا ہو، یا بغیر کسی ارتکابِ بدکاری کے، مریمؑ از خود حاملہ قرار پاتی ہے فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا اور جب حمل کو مزید چھپانا، ممکن نہیں رہ جاتا، تو وہ اپنے معتکف سے نکل کر، دور چلی جاتی ہے تاکہ اس حمل پر، وہ، لوگوں کی چہ میگوئیوں، لعن طعن اور ملامت و سرزنش سے محفوظ بھی رہے، اور اللہ کی مرضی پوری بھی ہو جائے، بچے کو جنم دے

کر، وہ، اپنی قوم میں آتی ہے تو لوگ، اس پر باتیں بنانے کے لیے ہجوم کر آتے ہیں، اور وہ چپ کا روزہ رکھے ہوئے، لوگوں سے ہم کلام ہونے کی بجائے، انہیں بیٹے کی طرف متوجہ کر دیتی ہے، وہ لوگ، اس پر متعجب ہو کر کہتے ہیں کہ ہم پنگھوڑے میں پڑے ہوئے، اس نوزائیدہ بچے سے کیسے ہمکلام ہوں جبکہ اس عمر میں بچے بولا نہیں کرتے؟

(ج) نوزائیدہ بچے کا کلام کرنا:

اب یہ نوزائیدہ بچہ، خود لوگوں سے کلام کرتا ہے، اور اس نوزائیدگی اور شیر خوارگی کی حالت میں، یہ گفتگو، اپنے اندر ایک ایسی نرالی شان رکھتی ہے، جسے بجا طور پر، ایک معجزہ قرار دیا گیا ہے، بچے اس حالت اور اس عمر میں کلام نہیں کیا کرتے، اس لیے یہ خارقِ عادت امر ہے، جو معجزہ کا جزوِ لازم ہے۔

''مفکر قرآن'' کا اعتراضِ فاسد:

لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، انکارِ معجزات کے ذہنی رجحانات کے تحت، مندرجہ بالا آیات کی، تاویل وتفسیر کے نام پر، ایسی تحریف کرتے ہیں کہ بقول اقبال، خدا و جبرائیل و مصطفیٰ بھی حیران رہ جاتے ہیں، چنانچہ آیات میں مذکور، خدائی معجزے پر، وہ یوں، زبانِ اعتراض، دراز کرتے ہیں:

> ''اگر یہ معجزہ تھا تو اسے بہرحال، اللہ تعالیٰ کا معجزہ قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن آپ کچھ وقت کے لیے، اپنے جذبات کو الگ رکھ کر سوچیں کہ اللہ تعالیٰ نے اس معجزہ کو دکھانے کے لیے جو طریق اختیار فرمایا، اس نے اس معصوم بچی (مریم) کو کن مشکلات میں پھنسا دیا، آپ سوچئے کہ اگر ایک نوجوان، ناکتخدا (غیر شادی شدہ) لڑکی کو حمل قرار پا جائے، اور اسطرح، اس کے ہاں لڑکا بھی پیدا ہو جائے، تو معاشرہ میں اس کی حالت کیا ہوگی؟ کیا وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل رہے گی؟ کیا وہ اپنے گھر والوں کے ہاں جا سکے گی؟ کیا وہ معاشرے کا سامنا کر سکے گی؟ سوچئے کہ اُسکی زندگی کس قدر اجیرن ہو جائے گی، کہا

جائے گا کہ اس میں حضرت مریم کا کوئی قصور نہیں تھا، ایسا اللہ تعالیٰ نے کر دیا تھا، لیکن ایسا کہتے وقت، اس پر غور کیجئے کہ کیا حضرت مریم کے پاس، اس کا کوئی ثبوت تھا کہ اس حمل میں ان کا کوئی قصور نہیں، ایسا خدا نے کر دیا ہے، کیا وہ اسے کسی صورت بھی ثابت کر سکتی تھیں؟ وہ تو ایک طرف، کیا حضرت عیسیٰ بھی کسی طرح یہ ثابت کر سکتے تھے کہ ان کی والدہ، اس باب میں بیگناہ ہیں اور ان کا حمل، خدا کی طرف سے تھا، اگر انہوں نے اس کا دعویٰ بھی کیا تھا - جو نہیں کیا تھا - تو سوال دعویٰ کرنے کا نہیں، سوال تو اس دعویٰ کی صداقت کے لیے ثبوت پہنچانے کا تھا، ایسا ثبوت، جس سے معاشرہ مطمئن ہو جائے، کہ حضرت مریم واقعی بے گناہ ہیں، ان کا حمل، خدا کی طرف سے تھا۔'' [۱]

جائزہ اعتراض:

''مفکر قرآن'' کا خیال یہ تھا کہ، اللہ تعالیٰ کو، یہ معجزہ دکھانے کے ساتھ، کوئی ایسا ثبوت بھی فراہم کر دینا چاہئے تھا، جس سے وہ اپنے حمل کو خدا کی طرف سے، قرار دے سکتیں، لیکن انہوں نے یہ نہیں سوچا کہ اگر منکرین، ایسا ثبوت پا کر بھی، اپنے انکار پر مصر رہتے تو پھر کیا ہوتا؟ کیا پیغمبروں نے اثباتِ حق میں کوئی کسر چھوڑ رکھی تھی کہ نہ ماننے والے پھر بھی اپنے انکار وجحود پر قائم رہے؟ کیا ہر دور کے کفار، واضح دلائل اور ٹھوس ثبوت پا کر بھی، محض تعصّبات کا شکار ہو کر، انکارِ حق پر کمر بستہ نہیں رہے؟ کیا قومِ ثمود کے سرکش و نافرمان لوگ، ناقۃ اللہ کی صورت میں، منہ مانگی نشانی پا کر بھی، اپنی روشِ کفر پر برقرار نہیں رہے؟ کیا بنی اسرائیل اور بالخصوص، یہود، اپنے پیغمبروں سے، مطالبۂ معجزات کو پا لینے کے بعد بھی، اپنے انبیاء و رسل کو موت کے گھاٹ نہیں اتارتے رہے ہیں؟ کیا فرعون اور اس کے درباری، حضرت موسیٰؑ کے صریح معجزات کو دیکھ کر بھی کفر پر مصر نہیں رہے؟ پھر یہاں کوئی ''اطمینان بخش ثبوت'' دے بھی دیا جاتا، تو اس سے کیا فرق پڑتا؟

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۷۳

اور ایسا ثبوت بھی موجود تھا:

حقیقت یہ ہے کہ اس واقعہ میں...... "ایسا ثبوت، جس سے معاشرہ مطمئن ہو جائے کہ حضرت مریمؑ واقعی بیگناہ تھیں، ان کا حمل، خدا کی طرف سے تھا"...... فی الواقعہ موجود ہے، اس قطعی ثبوت کا بندوبست کرتے ہوئے ہی، اللہ تعالیٰ نے، حضرت مریم کو قوم کی طرف واپس ہوتے ہوئے، یہ کہا تھا کہ...... "اگر تجھے کوئی آدمی نظر آئے، تو اس سے کہہ دیں کہ میں نے رحمان کے لیے روزے کی نذر مانی ہے، اس لیے میں آج کسی سے نہیں بولوں گی......" اور خود بولنے کی بجائے، اس نے نوزائیدہ بچے کی طرف اشارہ کر دیا، بچہ بولا، اور شیر خوار بچے کا یہ تکلم ہی معجزہ بن کر، مریمؑ کی براءت کا منہ بولتا ثبوت، قوم کو فراہم کر دیتا ہے، پھر ماننے والوں نے، اسی گفتگو کی بناء پر، حضرت عیسیٰؑ کو ابتداءِ عمر ہی سے غیر معمولی شخصیت قرار دیا، لیکن نہ ماننے والے، اُس دور سے لیکر، آج تک منکر ہی رہے ہیں۔

اگر "مفکر قرآن" صاحب، اپنی سابقہ تحریروں کو اسی طرح فراموش کر بیٹھے ہیں، جس طرح ان کے ہم نام غلام احمد مرزا (قادیانی)، اپنی عقیدہ ختم نبوت پر مشتمل تحریروں کو، اپنے دعوائے نبوت کے بعد فراموش کر بیٹھے تھے، تو ہم، ان کے اس اعتراض کا جواب، خود، اُنہی کی ایک قدیم عبارت سے پیش کیے دیتے ہیں:

> "اب ذرا تصور میں لائیے، اس الم انگیز واقعہ کو، کہ قوم کے بڑے بوڑھے، خانقاہ کے عمائد و اراکین، اس طرح بپھرے ہوئے درندوں کی طرح، چاروں طرف سے امنڈ پڑے ہیں اور ان کے درمیان، حضرت مریم ساکت و صامت کھڑی ہیں، ہر طرف سے طعن و تشنیع کی بوچھاڑ ہو رہی ہے، لیکن وجہِ تشنیع، وہ واقعہ ہے، جو اللہ کی مشیئت کے ماتحت، اس کے حکم کے مطابق، ایک طے شدہ فیصلہ (اَمْرًا مَّقْضِيًّا) کو پورا کرنے کے لیے عمل میں آیا ہے، حضرت مریم جانتی تھیں کہ وہ بے خطا ہیں، لیکن ان کے پاس کونسا ثبوت تھا، جسے وہ اپنی بریّت میں پیش کر دیتیں، وہ ہزار کہتیں کہ مجھے اس برگزیدہ مولود کے لیے فرشتوں نے

بشارتیں دی تھیں .... لیکن اسے کون باور کرتا؟ وہ جھٹ کہہ دیتے کہ یہ محض باتیں بنا رہی ہے، اس لیے معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کر رہا تھا، آپ یہ سب کچھ سن رہی تھیں لیکن خاموش تھیں، خاموش، اس لیے تھیں کہ آپ سے، اس سے پہلے، کہہ دیا گیا تھا کہ ایسا وقت آجائے تو اپنے روزے کے متعلق اشارہ کر دینا، لہٰذا آپ خاموش کھڑی تھیں، اب وقت تھا کہ حضرت مریم کے طرزِ عمل کے متعلق، ایک ایسی شہادت پیش کی جاتی جس کے بعد، اس باب میں کسی اور دلیل کی ضرورت باقی نہ رہتی، اور یہ شہادت، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ ان معترضین پر، یہ حقیقت منکشف کر دی جاتی کہ یہ بچہ کوئی عام بچہ نہیں بلکہ خصوصیاتِ عظمٰی کا حامل ہے، چنانچہ فَاَشَارَتْ اِلَیْهِ (۱۹/۲۹) ''اس پر مریم نے بچے کی طرف اشارہ کیا۔'' اس پر انہوں نے ایک قہقہہ لگایا اور کہا کہ یہ کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے، بجائے اس کے کہ اس کا کوئی جواب دو، ہمیں کہہ رہی ہو کہ اس بچے سے پوچھیں قَالُوْا کَیْفَ نُکَلِّمُ مَنْ کَانَ فِی الْمَهْدِ صَبِیًّا (۱۹/۲۹) انہوں نے کہا'' بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے''، اس پر کیا ہوا؟ وہ بچہ بول اٹھا قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ .... فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ (۳۰ تا ۱۹/۳۴) [1]

اسی تکلم فی المھد پر حاشیہ لکھتے ہوئے فرماتے ہیں۔

تکلم فی المھد کے متعلق بہت سی تاویلیں کی جاتی ہیں تا کہ کسی طرح یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ واقعہ، حضرت عیسٰیؑ کی جوانی (بلکہ نبوت) کے زمانے کا ہے، لیکن قرآنی انداز بیان، اس بات میں، ان تاویلات کا متحمل نہیں ہوتا، اس لیے یہ واقعہ معجزہ کے ضمن سے تعلق رکھتا ہے۔ [2]

---

[1] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۵۵۴ [2] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۵۵۶

بدلے ہوئے ذہن کا اثر ترجمہ آیات پر:

لیکن آج ''مفکر قرآن'' اسی واقعہ کو معجزہ کے ضمن سے خارج کرنے کے لیے، رکیک تاویلات پر اتر آئے ہیں، اور ٹھیک وہی موقف، بالکل اُنہی تاویلات کے ساتھ اختیار فرما رہے ہیں، جنکی وہ کل تردید کیا کرتے تھے، اور جنکے متعلق، وہ یہ کہا کرتے تھے کہ...... ''قرآنی اندازِ بیان، اِن تاویلات کا متحمل نہیں ہوتا''...... آج وہ اپنے بدلے ہوئے موقف کی حمایت میں دور کی کوڑی لاتے ہیں، آیات کا سادہ ترجمہ کرنے کی بجائے، ''مفہوم'' بیان کرنے کا...... اور وہ بھی مجازی معنٰی کی آڑ میں...... پیچیدہ راستہ اختیار کرتے ہیں، اپنے ذہن میں، پہلے سے جمائے ہوئے تصورات کے مطابق قرآنی آیات کے مفہوم کو ڈھالنے کے لیے، ایک لمبا چوڑا مقدمۂ تمہید اٹھاتے ہیں، اور پھر مطالبِ آیات کو، اس کے چاک پر گھماتے ہوئے، جیسی شکل میں چاہتے ہیں، ڈھالتے چلے جاتے ہیں۔ اب ذرا ملاحظہ فرمایئے، سورۂ مریم کی ان آیات کی تفسیرِ جدید، جو ابتداءً مع ترجمہ پیش کی جا چکی ہیں، ''مفکر قرآن'' صاحب فرماتے ہیں۔

> وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِانْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۹)
>
> ''اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن مجید) میں، لوگوں سے مریم کی داستان بیان کر............ اس کا آغاز، اس وقت سے کر، جب وہ ہیکل چھوڑ کر (اپنے گاؤں- ناصرہ- چلی گئی تھی جو) وہاں سے جانب شرق واقع تھا۔'' [1]

''مفکر قرآن'' نے اس آیت کا مفہوم صریحاً غلط بیان کیا ہے۔

• داستانِ مریم کا آغاز، اس وقت سے کیا گیا ہے، جبکہ وہ ہیکل چھوڑ کر، اپنے گاؤں، ناصرہ، چلی گئی تھیں، حالانکہ آیت میں مذکور یہ ہے کہ جب وہ، اپنے اہل خانہ سے الگ ہو کر، بیت المقدس میں، جانب شرقی میں، معتکف ہو چکی تھیں، اور اعتکاف کرنے والوں کے عام طریقہ کے مطابق، انہوں نے پردہ تان لیا تھا جیسا کہ اگلی آیت فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۳

حِجَابًا کے الفاظ سے ظاہر ہے، نیز ''مفکر قرآن'' کا یہ مفہوم، اس اعتبار سے بھی غلط ہے کہ ناصرہ، بیت المقدس کے شمال میں ہے (نہ کہ مشرق میں)، پھر یہ بھی کہ ناصرہ چلے جانے کی صورت میں تو وہ آبادی کے تمام لوگوں سے انتباذ اختیار کر لیتیں جبکہ آیت میں صرف اہل خانہ ہی سے انتباد کا ذکر ہے، (اِذِ انۡتَبَذَتۡ مِنۡ اَهۡلِهَا مَكَانًا شَرۡقِيًّا) اور اہل خانہ سے مریم کی یہ علیحدگی بھی، ماں کی آرزوؤں کے مطابق، نذر ہیکل ہونے کی صورت میں تھی۔

اولین بناء فاسد:

اب چونکہ، اہل خانہ سے الگ ہوکر، بیت المقدس میں، اپنی ماں کی نذر کے مطابق، معتکف (نذرِ ہیکل) ہونے کی بجائے، ہیکل چھوڑ کر ناصرہ چلے جانے کی صورت میں، اساسِ واقعہ کی پہلی اینٹ ہی غلط رکھی گئی ہے، اس لیے اگلی جملہ آیات کے مفاہیم کو ردّے پر ردّا چڑھاتے ہوئے، غلط سمت دی گئی ہے، اور ہر آیت کے مفہوم و مراد کو، اپنے اسی خود ساختہ پسِ منظر کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی گئی ہے، چنانچہ اب فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا (۱۹/۱۷) کا مطلب یہ نہیں رہا کہ ہیکل چھوڑ کر، بیت المقدس ہی میں، مشرقی جانب پردہ تان کر، مریم، معتکف ہو بیٹھیں، بلکہ مفہومِ آیت یہ قرار پایا کہ:

> ''خانقاہ کی زندگی ترک کرنے اور اس پر لوگوں کی طعن و تشنیع سے، اس کے دل پر ایسا اثر ہوا کہ وہ معاشرہ سے الگ تھلگ رہنے لگی۔ فَاتَّخَذَتۡ مِنۡ دُوۡنِهِمۡ حِجَابًا'' [۱]

حالانکہ یہاں مِنۡ دُوۡنِهِمۡ میں واقع ضمیر هم، افراد معاشرہ کی طرف نہیں بلکہ اَهۡلِهَا کی طرف لوٹتی ہے، جس کا ذکر، اس سے پہلی آیت میں متصل واقع ہے۔ اب ابتداء ہی میں رکھی جانے والی بنیاد کی اس ٹیڑھی اینٹ پر، اگلی آیت کی آڑ میں، اگلا ردّا یوں چڑھاتے ہیں۔

فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَيۡهَا رُوۡحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۷)

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۳

عام طور پر ان الفاظ کے معنٰی کیے جاتے ہیں:

"پھر بھیجا ہم نے، اس کے پاس اپنا فرشتہ، پھر بنکر آیا، اس کے آگے پورا آدمی"
لیکن جیسا کہ ہم نے آیات (۴۴،۴۵/۳) کی تشریح کرتے ہوئے، لکھا ہے کہ قرآن کریم کی رو سے یہ نظریہ صحیح نہیں کہ ملائکہ انسانی شکل میں سامنے آتے ہیں۔ ۱

روحنا اور رویتِ ملائکہ:

یہ نظریہ کہ ملائکہ، انسانوں کو نظر نہیں آ سکتے، "مفکر قرآن" نے آیات (۴۴،۴۵/۳) کے تحت نہیں، بلکہ آیت (۴۱/۳) کے تحت بیان کرتے ہوئے، یہ لکھا ہے۔

سورۂ توبہ میں کہا گیا ہے کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے۔ (۲۵/۹، ۴۰/۹)" ۲

واقعی، ملائکہ، اپنی اصلی حالت میں بالعموم نظر نہیں آیا کرتے، لیکن بعض مخصوص حالات میں، جبکہ وہ انسانی پیکر میں نمودار ہوں تو ان کے مرئی و مشاہد ہونے میں کوئی استبعاد نہیں پایا جاتا، نیز یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ کسی ایک موقع پر ملائکہ کا نظر نہ آنا، اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ "ملائکہ مستقل طور پر، (خواہ وہ انسانی روپ ہی میں کیوں نہ نمودار ہوں) نظر نہیں آیا کرتے"، سورۃ التوبہ کی جن دو آیات کا حوالہ دیا گیا ہے، ان میں قطعاً یہ مذکور نہیں کہ ملائکہ نظر نہیں آیا کرتے، بلکہ صرف یہ مذکور ہے کہ "ان مواقع پر، تمہیں، اللہ کے لشکر، نظر نہیں آئے"، چنانچہ آیت (۲۵/۹) کے الفاظ ہیں وَاَنْزَلَ جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا "اس نے ایسے لشکر اتارے جو تمہیں نظر نہیں آئے۔" اور آیت (۴۰/۹) کے الفاظ ہیں وَاَيَّدَهٗ بِجُنُوْدٍ لَّمْ تَرَوْهَا "اللہ نے اس (نبیؐ) کی تائید، ایسے لشکروں سے کی، جو تمہیں نظر نہیں آئے"۔ اب، "تمہیں نظر نہیں آئے" کے الفاظ کو بدل کر "نظر نہیں آیا کرتے" کے الفاظ میں ڈھال لینا، ایک "مفکرانہ چابکدستی" کے سوا اور کچھ نہیں۔ پھر ان آیات (۲۵/۹، ۴۰/۹) میں ملائکہ کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے، وہاں جنود کا ذکر ہے، بغیر کسی دلیل و قرینے کے، اسے خواہ مخواہ ملائکہ کے مفہوم میں خاص کر لینا، حقیقت رسی کی نہیں بلکہ مطلب برآری

---

۱ تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۳ تا صفحہ ۱۰۴ ۲ تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۸۱

کی کوشش ہے، ملائکہ کے علاوہ بھی، اللہ تعالیٰ کے اتنے لشکر ہیں کہ انہیں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ وَمَا يَعْلَمُ جُنُودَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ کے تحت، سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں اور کیا ہی خوب فرماتے ہیں کہ:

"یعنی اللہ تعالیٰ نے، اپنی اس کائنات میں کیسی کیسی اور کتنی مخلوقات پیدا کر رکھی ہیں، اور کیا کیا طاقتیں ان کو بخشی ہیں اور ان سے کیا کیا وہ کام لے رہا ہے، ان باتوں کو، ایک اللہ کے سوا، کوئی بھی نہیں جانتا ہے، ایک چھوٹے سے کرۂ زمین پر رہنے والا انسان، اپنی محدود نظر سے، اپنے گرد و پیش کی چھوٹی سی دنیا کو دیکھ کر، اگر اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائے کہ خدا کی خدائی میں بس وہی کچھ ہے جو اسے اپنے حواس یا آلات کی مدد سے محسوس ہوتا ہے تو اسکی اپنی ہی نادانی ہے ورنہ یہ خدائی کا کارخانہ اتنا وسیع و عظیم ہے کہ اسکی ایک چیز کا بھی پورا علم حاصل کرنا، انسان کے بس میں نہیں ہے کجا یہ کہ اسکی ساری وسعتوں کا تصور، اسکے چھوٹے سے دماغ میں سما سکے۔" [1]

یہ درست ہے کہ فرشتے بالعموم نظر نہیں آیا کرتے، لیکن بعض مواقع پر، جبکہ انسانی پیکر میں مشہود ہو کر آئیں، ان کا نظر آنا عقلاً مستبعد بھی نہیں ہے، خود "مفکر قرآن" نے ایک مقام پر فرستادگانِ لوطؑ کو، بین القوسین وضاحت کے ذریعہ، فرشتے قرار دیا ہے۔

فَلَمَّا جَاءَ اٰلَ لُوطِ نِ الْمُرْسَلُونَ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنكَرُونَ ....

(۶۱–۶۲/۱۵)

"پھر جب ایسا ہوا کہ یہ بھیجے ہوئے (فرشتے) خاندانِ لوط کے پاس پہنچے، تو انہوں نے کہا کہ "تم لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہو۔" [2]

اس سے آگے، آیت (۲۹/۳۳) کا ترجمہ، بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

قَالُوا لَا تَخَفْ وَلَا تَحْزَنْ اِنَّا مُنَجُّوكَ وَاَهْلَكَ اِلَّا

---

[1] تفہیم القرآن، جلد ٦، صفحہ ۱۵۲ [2] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۹۴

"(ہمارے فرستادہ) فرشتوں نے کہا" (اے لوطؑ) تو کچھ خوف نہ کر، نہ کوئی غم، ہم تجھے اور تیرے متبعین کو (اس عذاب سے، جو ہم لیکر آئے ہیں) بچا دینے والے ہیں، البتہ ...." [۱]

الغرض، پرویز صاحب ہی کے ان تراجم کی روشنی میں، حضرت لوط علیہ السلام، نہ صرف یہ کہ فرشتوں کو دیکھ رہے ہیں بلکہ ان سے ہمکلام بھی ہو رہے ہیں، جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ خاص مواقع پر فرشتوں کا نظر آ جانا، عقلاً مستبعد نہیں ہے۔

اب "مفکرِ قرآن" کی یہاں "مفکرانہ چال" ملاحظہ فرمائیے۔

ان کی محولہ آیات (۹/۲۵ اور ۹/۴۰) میں صرف یہ مذکور ہے کہ...... "تم نے ان لشکروں (جنود) کو نہیں دیکھا، جو اللہ نے حنین کے موقع پر نازل کیے"...... یا "جن لشکروں (جنود) سے، اللہ تعالیٰ نے، غار حراء کے موقع پر، پیغمبر آخر الزمان کی تائید کی"...... لیکن "مفکرِ قرآن" نے اول، تو بغیر کسی قرینے کے، جنود (لشکروں) سے مراد، فرشتے لیے، اور ثانیاً، ان خصوصی مواقع پر، ماضی کے ان صیغوں سے، لَمْ تَرَوْهَا (تم نے نہیں دیکھے) سے یہ مستقل قاعدہ کلیہ بنا لیا کہ "فرشتے نظر آیا ہی نہیں کرتے"...... اب اس بناءِ فاسد پر، ایک اور فاسد کا ردّا چڑھاتے ہوئے، "مفکرِ قرآن" فرماتے ہیں کہ:

"قرآنِ کریم نے بالتصریح کہا ہے کہ ملائکہ، انسانوں کو نظر نہیں آ سکتے، لہٰذا قرآن میں اس حقیقت کے پیشِ نظر یہ کہنا صحیح نہیں کہ حضرت جبریل، بشکلِ انسانی، حضرت مریم کے سامنے آئے تھے۔" [۲]

یاد رکھیے کہ یہ ساری تمہیدی پیش بندی فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا کے اس صحیح اور متفق علیہ مفہوم کی تردید کے لیے کی جا رہی ہے جسے سلف سے لیکر خلف تک جمہور علماء پیش کرتے رہے ہیں، اور ساتھ ہی یہ مقصد بھی پیشِ نظر ہے کہ اس مفہومِ باطل کی راہ ہموار کی جائے، جسکی آخری منزل، انکارِ معجزات ہے...... بہر حال، آگے چل کر، وہ فرماتے ہیں، کہ:

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۹۴ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۱۰۴

''بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ واقعہ، حضرت مریمؑ کے خواب کا ہے، میں بھی کبھی اسی خیال کا تھا، لیکن قرآن پاک میں مزید غور اور تحقیق سے کچھ اور بات سامنے آئی۔'' [1]

''مفکر قرآن'' صاحب کو ''مزید غور اور تحقیق'' سے کیا کچھ سمجھ آیا؟ اس کے لیے وہ پھر بناءِ فاسد علی الفاسد ہی کی ٹیکنیک اختیار کرتے ہیں، یعنی پہلے ایک قرآنی واقعہ کو، اپنے خودساختہ الفاظ کے اضافہ سے ایک خاص مفہوم عطا کرتے ہیں اور پھر اسی غلط مفہوم کی بنیاد پر، ایک اور غلط نظریہ پیدا کرتے ہیں...... ملاحظہ فرمایئے ''مزید غور اور تحقیق'' کا نتیجہ، جو فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا میں واقع، لفظ روح کی وضاحت کرتے ہوئے پیش کیا گیا ہے۔

''روح کے معنٰی وحی کے بھی ہیں (دیکھیئے لغات القرآن)، اور جب خدا کا رسول، وحیٔ خداوندی کی رو سے حاصل شدہ کسی حکم کو دوسروں تک پہنچاتا ہے، تو اسے بھی، ان لوگوں کی طرف، وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے، جیسے خدا نے، اپنے کسی رسول کی وساطت سے حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف، حکم بھیجا کہ بچے کو دریا میں بہادے، تو اسے اَوْحَيْنَا اِلٰی اُمِّ مُوْسٰی (۲۸/۷) کہا گیا۔'' [2]

تعمیر بناء فاسد اور دو فاش غلطیاں:

اس تمہیدی پیش بندی میں، ''مفکر قرآن'' نے دو فاش غلطیاں کی ہیں۔

اولاً ...... یہ کہ...... ''جب خدا کا رسولؐ، وحیٔ خداوندی کی روٗ سے حاصل شدہ کسی حکم کو، دوسروں تک پہنچاتا ہے، تو اسے بھی ان لوگوں کی طرف وحی سے تعبیر کیا جاتا ہے'' ...... یہ قطعی غلط ہے، وحی شدہ حکم کو، دوسروں تک پہنچانا، وحی نہیں کہلاتا، بلکہ تبلیغ کہلاتا ہے، ساری عمر قرآن کے تحقیقی مطالعہ میں صرف کرنے والے ''مفکر قرآن'' کی نگاہوں سے شاید وہ آیت اوجھل ہی رہی، جس میں خود، رسولؐ کو بھی وحی شدہ حکم کو، لوگوں تک پہنچا دینے کا حکم دیتے ہوئے، اسے ''وحی'' کی بجائے ''تبلیغ'' کہا گیا ہے۔

---

[1] + [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۶

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ (المائده – ٦٧)

''اے رسول! جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے، اسے لوگوں تک پہنچا دے، اگر تو ایسا نہیں کرے گا تو پھر تُو نے خدا کا پیغام نہیں پہنچایا۔''

اگر ''مفکر قرآن'' کی بات درست ہوتی تو قرآن یہ کہتا کہ...... ''اے رسولؐ! جو کچھ تیری طرف نازل کیا گیا ہے، تو اُسے لوگوں تک وحی کر دے اگر تو نے ایسا نہ کیا و پھر تُو نے خدا کے پیغام کی وحی نہیں کی۔''

ثانیاً ...... یہ کہ، ام موسیٰ کے جس واقعہ کو مثال میں پیش کیا گیا ہے، اس میں...... ''اپنے کسی رسول کی وساطت سے''...... کے الفاظ، خود ساختہ اضافہ ہیں، تا کہ اپنے مزعومہ معانی کو ''ثابت'' کیا جا سکے، حالانکہ وحی کے معنیٰ ہیں ''مخفی طور پر یا چپکے چپکے خبر دینا۔'' یہ خفیہ اعلام، بصورت خواب بھی ممکن ہے جیسا کہ بذریعہ خواب، حضرت ابراہیمؑ کو ذبحِ پسر کا حکم دیا گیا، اور ''دل میں بات ڈال دینے'' کی صورت میں بھی ہو سکتا ہے، ''خفیہ اطلاع دینے'' کے معنیٰ کو، خود پرویز صاحب نے بھی، ابو اسحاق کے حوالہ سے بایں الفاظ تسلیم کیا ہے۔

''ابو اسحاق نے بھی کہا ہے کہ وحی کے اصل معنی اِعْلَامٌ فِيْ خِفَآءٍ ہیں۔''[1]

لغات القرآن میں ام موسیٰ کی وحی کو بھی زیر بحث لایا گیا ہے، لیکن اس میں...... ''اپنے کسی رسول کی وساطت''...... کا قطعاً ذکر نہیں ہے، ملاحظہ فرمائیے۔

''قرآن کریم میں حضرت موسیٰؑ کی والدہ کے متعلق ہے کہ اَوْحَيْنَا اِلٰٓى اُمِّ مُوْسٰٓى (۲۸/۷، ۲۰/۳۸) ''ہم نے ام موسیٰؑ کی طرف وحی کی'' کہ اس بچے کو دودھ پلا، اور جب تجھے اس کے متعلق، کوئی خطرہ لاحق ہو، تو اسے صندوق میں ڈال کر دریا میں بہا دینا'' جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے کہ وحی، ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو کسی کی طرف بھیجی جائے، اور اس طرح اسے اس کا علم کرا دیا

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۹۵

جائے، یا اسکی طرف حکم بھیجا جائے، خواہ اسکی کیفیت یا طریق کچھ ہی ہو۔" [1]

لیکن لغات القرآن کے بعد، جب تفسیر قرآن کا موقع آیا، تو "مفکر قرآن" کو "مزید غور اور تحقیق" کے نتیجہ میں خود ساختہ اضافہ کرتے ہوئے، یہ کہنا پڑا کہ "...... جیسے خدا نے، اپنے کسی رسول کی وساطت سے، حضرت موسیٰ کی والدہ کی طرف حکم بھیجا کہ بچے کو دریا میں بہادے تو اسے اَوْحَیْنَا اِلٰی اُمِّ مُوسٰی کہا گیا"۔

یہ ہے "مفکر قرآن" کی لغوی تحقیقات کا ایک نمونہ۔ ان کی لغات القرآن، اسی قسم کی لغوی تحریفات کا پلندہ ہے، جسے وہ اپنی لغوی تحقیقات کی "کوہ کنی اور خارہ شگافی" سے تعبیر کیا کرتے تھے۔

ارسلنا الیھا روحنا:

بہر حال، "مفکر قرآن" اپنی اس تمہیدی پیش بندی کے بعد، اب فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا کا وہ مفہوم پیش کرتے ہیں، جو ان کے "مزید غور اور تحقیق" کا نتیجہ ہے۔

"ان تصریحات کی روشنی میں اَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا کے معنٰی ہوں گے......

"خدا نے حضرت زکریاؑ کی وساطت سے، حضرت مریم کی طرف پیغام بھیجا"

...... حضرت زکریاؑ نے یہ پیغام اس شخص کی معرفت بھیجا، جسے انہوں نے حضرت مریم کے ساتھ نکاح کے لیے منتخب اور آمادہ کیا تھا (یعنی اناجیل کے بیان کی رو سے یوسف نجار) بَشَرًا سَوِیًّا سے یہی نوجوان مراد ہے۔ اب رہا لفظ تمثّل، سو لغت کی رو سے، اسکے معنٰی "داستان زدن" یعنی بات کرنے کے بھی آتے ہیں۔" [2]

سبحان اللہ! یک نہ شد، دو شد! اللہ نے اپنا پیغام "زکریاؑ کی وساطت" سے بھیجا، اور پھر آگے زکریا نے خود پیغام لیجانے کی بجائے، یوسف نجار کے ذریعہ بھیجا، حالانکہ آیت میں صرف رُوْحَنَا کا لفظ ہے، جو بہر حال، ایک ہی ہستی پر دلالت کرتا ہے، قرآن میں،

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۶۹۵ [2] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۱۰۶

اس مقام پر، نہ تو زکریاؑ ہی کی طرف پیغام رسانی کا ذکر ہے اور نہ ہی یوسف نجار کی معرفت ارسالِ پیغام کا ذکر ہے، آخر یہ خودساختہ اضافے کیوں؟

خالی جگہ پر کرو — ''لطیف انداز تفسیر'':

اس کا جواب ''مفکرِ قرآن'' صاحب، ''عذرِ گناہ بدتر از گناہ'' کے مصداق، ان الفاظ میں دیتے ہیں۔

> قرآن کریم، کسی واقعہ کی تمام کڑیاں بالترتیب خود ہی بیان نہیں کر دیتا، ان کے درمیان (Gaps) چھوڑ دیتا ہے کہ ہم اپنے فہم و بصیرت سے پُر کر لیں، اسے (Fill in the blanks) کا طریق کہتے ہیں، جو ادبی نقطۂ نگاہ سے بڑا لطیف انداز بیان ہوتا ہے۔ [1]

اور ''مفکرِ قرآن'' یہ (Fill in the blanks) کرتے بھی ہیں، تو سابقہ تحریف شدہ کتب کی رو سے، (یعنی اناجیل کے بیان کی رو سے یوسف نجار) کہ ''بَشَرًا سَوِيًّا سے یہی نوجوان مراد ہے۔''

اب ایک شخص، اناجیل جیسی مسخ و تحریف اور تغیر و تبدل کا شکار کتب سے بے نیاز ہو کر فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا کا ترجمہ...... ''پس ہم نے، اس کے پاس اپنی روح (یعنی فرشتے) کو بھیجا'' فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ''وہ بھلے چنگے انسان کی شکل میں نمودار ہوا''...... کے الفاظ میں کرتا ہے، تو وہ شخص، بڑا بد ذوق ہے جو نہ تو اس آیت میں خلا (Gaps) کا قائل ہے، اور نہ ہی وہ ترجمہ و تفسیرِ قرآن میں وہ طریقہ اختیار کرتا ہے جو ''خالی جگہ پُر کرو'' کا طریقہ کہلاتا ہے، اور جو ادبی نقطۂ نگاہ سے ''بڑا لطیف اندازِ بیان'' ہوتا ہے، لیکن، اس کے برعکس، جو شخص یہ کہتا ہے کہ آیت (۱۹/۱۷) میں خلا (Gaps) موجود ہیں، جنہیں (Fill in the blanks) کے طریق پر یوں پُر کیا جائے گا کہ...... ''خدا نے حضرت زکریاؑ کی وساطت سے، حضرت مریم کی طرف پیغام بھیجا، حضرت زکریاؑ نے یہ پیغام، (حضرت مریم

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۶

کے پاس خود لیجانے کی بجائے)، اس شخص کی معرفت بھیجا جسے انہوں نے حضرت مریم کے ساتھ نکاح کرنے کے لیے منتخب اور آمادہ کیا تھا، (یعنی اناجیل کے بیان کی رو سے یوسف نجار)......تو وہ گویا ترجمہ وتفسیرِ قرآن میں ''بڑا لطیف اندازِ بیان'' اختیار کرتا ہے، اور باقی سب لوگ ''کثیف انداز بیان'' اپناتے ہیں۔

اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ، وہ قرآن کی تفسیر، قرآن ہی سے کرنے کا دعویٰ کرتا ہے، لیکن ''قرآنی خلاء'' کو پُر کرنے کے لیے سہارا اناجیل سے لیتا ہے۔

خیر آگے بڑھیے، آیت (۱۹/۱۷) کا معنی، ابھی تشنۂ وضاحت ہے، جسے ''لہٰذا......'' کے ذریعہ مکمل کیا جاتا ہے۔

''لہٰذا، آیت (۱۹/۱۷) کے معنی یہ ہوں گے کہ حضرت مریم، ان پریشانیوں میں افسردہ خاطر رہتی تھیں کہ حضرت زکریاؑ نے ان کی طرف، خدا کا پیغام دے کر، ایک نوجوان کو بھیجا، اس اجنبی نوجوان کو دیکھ کر حضرت مریم نے کہا قَالَتْ اِنِّي اَعُوذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا......''[۱]

لیکن، فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيّاً میں واقع لفظ تَمَثَّلَ کا معنیٰ ''داستان زدن یعنی بات کرنا'' مفکر قرآن نے، جو بیان کیا ہے، وہ تو کہیں ترجمہ ومفہوم میں راہ پا ہی نہیں سکا، آخر یہ کیوں؟ کیا یہ لفظ ''زوائدِ قرآن'' میں سے ہے؟

ماشاءاللہ! کیا ہی ''لطیف اندازِ تفسیر'' ہے کہ آیت میں، جو (Gaps) ظاہر کیے گئے ہیں، انہیں تو اناجیل کی رو سے پُر کردیا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' نے، تمثل کے معنیٰ ''داستان زدن'' کا جو خلا (Gap) خود پیدا کیا ہے، اسے آخر کون پُر کرے گا؟

جو آگ لگائی تھی تم نے، اُسکو تو بجھایا اشکوں نے
جو اشکوں نے بھڑکائی ہے، اُس آگ کو ٹھنڈا کون کرے

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۳، صفحہ ۱۰۶

تمثّل کا صحیح معنی و مفہوم:

رہا لفظ تَمَثّل، تو اس کا اصل معنی ''صورت پکڑنا'' یا ''شکل اختیار کرنا'' ہے، خود پرویز صاحب نے، لغات القرآن میں، اسی معنٰی کو اختیار کیا ہے، ملاحظہ فرمایئے درج ذیل اقتباس۔

''سورہ مریم میں، جہاں ہے فَاَرْسَلْنَا اِلَیْھَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَھَا بَشَراً سَوِیًّا (۱۹/۱۷) تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ حضرت مریم کی نگاہ میں، ایک متوازن انسان کی شکل میں سامنے آیا۔'' [1]

رہا تَمَثَّل کا معنی، ''بات کرنا'' یا ''بیان کرنا'' تو یہ صرف، اسی صورت میں ہے جبکہ تمثّل کے ساتھ کوئی قرینہ پایا جائے، جیسے تَمَثَّلَ الحَدِیْثَ یا تَمَثَّلَ بِالحَدِیْثِ جبکہ آیت میں نہ صرف یہ کہ ایسا کوئی قرینہ نہیں ہے، بلکہ الٹا تَمَثَّلَ لَھَا بَشَراً سَوِیًّا کا قرینہ، اسے ''شکل اختیار کرنے'' کے معنٰی میں خاص کر دیتا ہے۔

داستان مریمؑ کی اگلی کڑی:

اب یہ ''داستان'' آگے بڑھتی ہے جس میں ''زدن'' کا کام، ''مفکر قرآن'' خود، مگر بایں الفاظ انجام دیتے ہیں۔

''اس اجنبی نوجوان کو دیکھ کر حضرت مریم نے کہا قَالَت اِنی اعوذ بالرحمن منك ان کنت تقیاً (۱۹/۱۸) ''اگر تو خدا کے قانون کا احترام کرتا ہے، تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آجانا چاہتی ہوں''، اس نوجوان نے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں قال انما انا رسولُ ربك لَاَھَبَ لَكِ غلاما زکیًّا (۱۹/۱۹) ''میں تیرے رب کی طرف سے ایک پیغام لیکر آیا ہوں، یہاں لفظ ''رب'' سے مراد، اللہ تعالیٰ بھی ہوسکتا ہے، اور اگر اس کے لغوی معنوں میں ''پرورش کرنے والا'' (مربّی) لیا جائے، تو اس سے مراد

---

[1] لغات القرآن، صفحہ ۱۵۲۲

حضرت زکریاؑ ہوں گے، میں سمجھتا ہوں کہ یہ مفہوم زیادہ قرینِ قیاس ہے۔'' [۱]

قرآن سے ''مفکرِ قرآن'' کا سلوک:

غور فرمائیے کہ قرآن کریم کو کس طرح چیستاں بنا کر پیش کیا جا رہا ہے، گویا یہ حقائق کی نہیں بلکہ پہیلیوں کی کتاب ہے، الفاظ کو ان کے اصل مفہوم و معنٰی سے پھیر دینا، ''لطیف اندازِ بیان'' ہے، اور خدائی کلام کی توضیح و تشریح میں، حدود الفاظ کو ملحوظ رکھنا، گویا ''کثیف اندازِ بیان'' ہے، صحیح اور درست ترجمہ کو ''عام طور پر کیا جانے والا لفظی ترجمہ'' یا ''مروجہ ترجمہ'' کہہ کر، استخفاف کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اور قرآنی الفاظ کی لغوی اور لفظی پابندیوں سے بے نیاز ہو کر تشریح و تفصیل کرنے کو، نیز الفاظ کی مسرفانہ بھرمار کے ساتھ، خود ساختہ افکار و تصورات کے پیش کرنے کو، ''مفہوم القرآن'' قرار دیا جاتا ہے، اور پھر اسکے ساتھ ہی، قرآن کے بارے میں، یہ بلند بانگ دعویٰ بھی کیا جاتا ہے کہ

> مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِنْ شَيْءٍ (۶/۳۸) یہی نہیں کہ یہ مکمل کتاب ہے، نہایت واضح بھی ہے، اس میں کوئی ابہام نہیں۔'' [۲]

پھر اس واضح، مکمل اور غیر مبہم کتاب کی تشریح و توضیح اور تفصیل و تفسیر، اناجیل کی روشنی میں کی جاتی ہے، جن کا محرّف ہونا، اور خود ساختۂ بشر ہونا، خود ''مفکرِ قرآن'' بھی تسلیم کرتے ہیں۔

> ''اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ توراۃ اور انجیل وغیرہ، کتب سابقہ میں تحریف ہو چکی ہے، اس لیے ان میں بیان کردہ واقعات صحت پر مبنی نہیں، صحیح واقعات وہ ہیں جو قرآن میں بیان کیے گئے ہیں۔'' [۳]

یقیناً، قرآن ہی کے واقعات درست ہیں، لیکن ''مفکرِ قرآن'' صاحب، قرآن کی درستگی اور صحت کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں اور پھر سابقہ کتب محرفہ کی بنیاد پر، قرآن کی تشریح

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۱۰۶ — [۲] طلوع اسلام، جولائی ۱۹۸۱ء، صفحہ ۲۱

[۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۸۴

بھی کرتے ہیں، اور کچھ واقعات، وہ بیان کرتے ہیں جو قرآن میں قطعاً نہیں ہیں، (بلکہ شاید کتب محرفہ میں بھی نہیں ہیں) انہیں ''مفکر قرآن'' خود اپنی خلاقیٔ دماغ سے پیش کرتے ہیں، آخر، اسی زیر بحث معاملہ میں، (۱) اللہ تعالیٰ کا حضرت زکریاؑ کو مریمؑ کے لیے پیغام دینا، اور (۲) پھر ان کی طرف سے یہ پیغام، یوسف نجار کے ذریعہ مریمؑ کو پہنچانا، اور (۳) یوسف نجار کو مریمؑ سے شادی کے لیے آمادہ کرنا، وغیرہ، کس قرآن میں مذکور ہے؟

خلوتِ گاہ مریمؑ میں آنے والا کون؟:

اگر مریمؑ کے سامنے آنے والا، خود مریم ہی کا منگیتر تھا، جسے وہ خود جانتی تھیں کہ سیرت و کردار کے لحاظ سے کیسا آدمی ہے، تو پھر اسے یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ''اگر تو متقی شخص ہے تو میں تجھ سے خدائے رحمٰن کی پناہ میں آنا چاہتی ہوں۔'' اور اگر وہ بُرا آدمی سمجھتیں تو اول تو اسکی منگنی ہی، اس سے نہ ہوتی، اور دوسرے، اسکے سامنے آ جانے پر، شک کے انداز میں یہ نہ کہتیں کہ اِنۡ کُنۡتَ تقیًا (اگر تو صاحب تقویٰ ہے تو......)، بلکہ پورے حتم و یقین کے ساتھ، اُسی طرح خدا سے استعاذہ کرتیں، جس طرح حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بُرا شخص جانتے ہوئے، پورے وثوق و تیقن کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی پناہ میں آنا چاہا تھا۔

اِنِّی عُذۡتُ بِرَبِّی وَ رَبِّکُمۡ مِنۡ کُلِّ مُتَکَبِّرٍ لَّا یُؤۡمِنُ بِیَوۡمِ الۡحِسَابِ

(المومن — ۲۷)

''میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ پکڑتا ہوں، ہر متکبر شخص سے، جو یوم آخرت پر ایمان نہیں رکھتا۔''

لیکن اگر مریمؑ، اسے ایک نیک اور پارسا فرد کی حیثیت سے جانتی ہوتیں، تب بھی وہ یہ کہہ کر شک وشبہ کا اظہار نہ کرتیں کہ اِنۡ کُنۡتَ تَقِیًّا (اگر تو صاحب تقویٰ ہے تو......) اس سے واضح ہے کہ مریم کے سامنے کوئی ایسا شخص نمودار ہوا تھا جسے وہ قطعاً نہیں جانتی تھیں، اور فَاَرۡسَلۡنَاۤ اِلَیۡهَا رُوۡحَنَا میں روح سے مراد فی الواقعہ فرشتہ ہی ہے جو انسانی روپ میں، مریم کے سامنے ظاہر ہوا تھا، جیسا کہ کبھی خود پرویز صاحب نے بھی لکھا تھا:

''حضرت مریم علیہ السلام کے متعلق بھی یہ آیا ہے کہ فرشتہ ان کے سامنے متمثل ہو کر آیا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُونِهِمْ حِجَابًا فَأَرْسَلْنَا إِلَيْهَا رُوحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۹/۱۷) ''پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پس ہم نے اسکی طرف اپنا فرشتہ بھیجا اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا۔'' [۱]

آگے چل کر، ''مفکر قرآن'' کو یاد آ جاتا ہے کہ تمثّل کا معنٰی ''داستان زدن'' تو مفہوم آیت میں آ ہی نہیں سکا، تو وہ اسکی یوں تلافی کرتے ہیں۔

''اس سے پہلے فَتَمَثَّلَ کے لفظ نے اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ اس نوجوان نے ساری بات بڑی تفصیل سے بیان کر دی تھی اور اس کا ملخّص یہ تھا کہ مشیتِ خداوندی یہی چاہتی ہے قَالَتْ أَنَّى يَكُونُ لِي غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ وَلَمْ أَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰) جیسا کہ آیت (۳/۴۰) کے تحت بیان کیا جا چکا ہے، حضرت مریمؑ نے کہا کہ ''میں نے نہ شادی کی ہے اور نہ ہی میں (معاذ اللہ) حرامکاری کی مرتکب ہوئی ہوں تو میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟ قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ (۱۹/۲۱) اس نے کہا کہ ایسا کچھ خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق ہوگا۔ [۲]

چند قابل غور باتیں:

چھوڑ یئے اس بات کو کہ ترتیب واقعات میں، تمثّل بمعنی ''داستان زدن'' کی کڑی کہیں راست بیٹھتی بھی ہے یا نہیں؟ اور فی الحال اسے بھی نظر انداز کیجئے کہ اس کڑی کو جبراً کہیں نصب کر دینے کی صورت میں، واقعات کی ترتیب میں کہاں تک ابتری واقع ہوتی ہے؟ سوچنے اور غور و فکر کے لائق بات تو یہ ہے کہ:

(۱)...... بچے کی خوشخبری پا کر، کنواری مریم خوش ہونے کی بجائے گھبرا اٹھتی ہے، اور

[۱] معارف القرآن، جلد۲، حاشیہ بر صفحہ ۱۷۴ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۶ تا صفحہ ۱۰۷

اظہارِ تشویش و حیرت کرتے ہوئے یہ کہتی ہے کہ "نہ آج تک مجھے کسی بشر نے چھوا اور نہ ہی میں بدکار عورت ہوں، تو ایسی حالت میں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟ جواباً خدا کی طرف سے فرشتہ کہتا ہے کہ کَذَالِكِ "اسی طرح" یعنی اسی حالت میں، کہ نہ تجھے کسی بشر نے چھوا، اور نہ ہی تو نے ارتکاب بدکاری کیا، اب یہ مفہوم چونکہ صریح طور خارقِ عادت امر ہے، اس لیے اس سے گریز کی خاطر، کَذَالِكِ کا مفہوم، یہ، تراشا گیا ہے کہ..... "ایسا کچھ خدا کے قانونِ تخلیق کے مطابق ہوگا"......جس کا تقاضا یہ ہے کہ مریم، ہیکل کی زندگی ترک کر کے، ازدواجی زندگی میں داخل ہو، چنانچہ اس تقاضا کو پورا کرنے کے لیے وہ فرماتے ہیں کہ:

"حضرت مریم کے دل سے ضوابط خانقاہیت سے سرکشی برتنے کے عواقب کا خیال دور ہوگیا، ان کی شادی، اس شخص سے ہوگئی، فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهِ مَكَانًا قَصِيًّا (۱۹/۲۲) مریم کو ہونے والے بچے کا حمل قرار پا گیا، لیکن چونکہ اس معاشرہ میں طعن و تشنیع نے ابھی تک ان کا پیچھا نہ چھوڑا تھا، انہوں نے مناسب سمجھا کہ وہ اس گاؤں سے کہیں دور چلے جائیں، تاکہ بچے کی ولادت، کسی ایسی جگہ ہو، جہاں اُن کی جان پہچان کا کوئی نہ ہو۔" [1]

اگر یہی بات تھی کہ حضرت مریم کے ہاں، معمول کے معروف اور فطری طریقہ سے بچہ پیدا ہونے والا تھا، جس طرح دنیا میں، عورتوں کے ہاں ہوا کرتا ہے، اور اگر حضرت عیسیٰ ؑ کی پیدائش فی الواقعہ، اسی طرح ہوئی ہوتی، تو قرآن کا یہ سارا بیان (جو فرشتے اور مریم کی باہمی گفتگو کو بھی محیط ہے) قطعی مہمل ٹھہرتا ہے، جو سورہ مریم، سورہ ال عمران اور دیگر مقامات پر، ولادت مسیح کے ضمن میں بیان کیا گیا ہے۔

(۲)......پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ اسلام کو اِلٰہ و ابن اللہ، صرف اسی وجہ سے تو سمجھا تھا کہ ان کی پیدائش غیر فطری طور پر، بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور یہود نے حضرت مریم ؑ پر الزام بھی اسی وجہ سے لگایا تھا کہ ایک غیر شادی شدہ

---

[1] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۷

خاتون (مریم) کے ہاں، بچہ پیدا ہوا تھا، اگر یہ سرے سے کوئی واقعہ ہی نہ تھا، تب ان دونوں گروہوں کے خیالات کی تردید میں، بس اتنا کہہ دینا کافی تھا، کہ...... ''تم لوگ غلط کہتے ہو، مریم ایک شادی شدہ خاتون ہے، فلاں شخص، اس کا شوہر تھا، اور اسی کے نطفہ سے سے عیسیٰؑ پیدا ہوئے تھے''...... یہ مختصر سی دوٹوک بات کرنیکی بجائے، آخر اتنی لمبی تمہیدیں اٹھانے، اور پیچ در پیچ بات کرنے، اور صاف صاف مسیح ابن فلاں کہنے کی بجائے، مسیح ابن مریم کہنے کی آخر کیا ضرورت تھی، جس سے بات سلجھنے کی بجائے الجھ جائے، پس وہ لوگ، جو قرآن کو کلام اللہ مانتے ہیں، اور پھر مسیح علیہ السلام کے متعلق یہ بھی ثابت کرنیکی کوشش کرتے ہیں کہ ان کی ولادت، حسب معمول، ماں اور باپ کے اتصال سے ہوئی تھی، وہ دراصل ثابت یہ کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ، اظہار مافی الضمیر اور بیانِ مدعا کی، اتنی قدرت بھی نہیں رکھتے ہیں، جتنی خود یہ حضرات رکھتے ہیں۔

(۳) ...... علاوہ ازیں، ایک اور بات بھی قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ اگر، فی الواقعہ، عیسیٰ کی پیدائش، زوجین میں صنفی مواصلت ہی کا نتیجہ تھی، تو آخر وضع حمل کے وقت، گھر چھوڑ کر جانے کی کیا ضرورت تھی؟ کیا فطری پیدائش کے موقع پر، عورتیں، اسی طرح، گھر چھوڑ کر بیابان میں جا کر، بچے کو جنم دیا کرتی ہیں؟ اس سوال کا جواب، ''مفکر قرآن'' نے یہ دیا ہے کہ چونکہ رسم خانقاہیت میں، کسی منذورہ (نذر شدہ خاتون) کا نکاح ہو نہیں سکتا تھا، اس لیے نکاح کے بعد، انہیں احبار و رہبان کے طعن و تشنیع اور لعنت ملامت کا خوف تھا، لیکن، یہ سخنسازی بوجوہ، لغو، مہمل بلکہ باطل ہے۔

اولاً ...... اس لیے کہ خود، ''مفکر قرآن'' کے اپنے قول کے مطابق، مریم نے جونہی ارادۂ نکاح کے پیشِ نظر، رسم خانقاہیت کو توڑ ڈالا، تو اسی وقت، اللہ تعالیٰ نے، خود ان کے متوقع خوف، اور احبار و رہبان کی لعنت ملامت کے عواقب کا خدشہ ختم کر ڈالا تھا اور وہ ذہنی طور پر بالکل مطمئن اور آسودہ حال ہو چکی تھیں، جیسا کہ ان کی مندرجہ ذیل عبارت سے ظاہر ہے۔

''چنانچہ رفتہ رفتہ وہ موانع دور ہو گئے، ادھر مریم کے دل میں رسم خانقاہیت کی غلط رسم کی خلاف ورزی کا خوف دور ہو گیا، ادھر ایک شخص، ہیکل کے احبار و رہبان کی تنبیہ وتخویف کے باوجود، مریم کے ساتھ شادی کرنے پر رضا مند ہو گیا۔'' [۱]

ظاہر ہے کہ جب احبار و رہبان کی طرف سے لعنت ملامت کا یہ خوف ہی نہ رہا تھا تو پھر، وضع حمل کے لیے گھربار چھوڑنے کا باعث، اسکے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ مریم، ایک ایسے بچے کو جنم دینے کے لیے گھر سے نکل رہی تھیں، جس کا حمل بغیر صنفی مواصلت کے، قرار پایا تھا، نیز، اسکے علاوہ، یہ امر بھی، اس کا مؤید ہے کہ اگر وہ، رسم خانقاہیت ہی کی خلاف ورزی کے باعث، اجنبی ماحول میں پناہ لینا چاہتیں، تو ہیکل سے نکلتے ہی (جب اس نے خانقاہیت کو خیر باد کہا تھا، تو اسی وقت)، وہ گھر چھوڑ کر چلی جاتیں، کجا یہ کہ وہاں کچھ عرصہ تک ٹھہرے رہتیں، نکاح کرتیں، حمل قرار پاتا، اور پھر وضع حمل کے وقت وہ اجنبی ماحول میں پناہ لینے کے لیے گھر سے نکلتیں۔

ثانیاً......اس لیے کہ رسم خانقاہیت میں، اگرچہ عام طور پر منذورات، شادی نہیں کرتی تھیں، لیکن اگر وہ ایسا کرنا چاہتیں، تو پھر خانقاہیت کا کوئی ضابطہ، رکاوٹ بھی نہیں بنتا تھا، خود پرویز صاحب نے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ

''عام طور پر، ان عورتوں کی شادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، اگرچہ بعض اوقات ایسا کر بھی لیا جاتا تھا۔'' [۲]

ولادت پسر پر اعتراضات کی بوچھاڑ کیسی؟:

حقیقت یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی معجزانہ پیدائش سے انکار کی روش نے، قدم قدم پر، سوالات کا لامتناہی سلسلہ پیدا کر دیا ہے، سوال یہ ہے کہ اگر مریمؑ نے واقعی، ازدواجی زندگی

---

[۱] مفہوم القرآن، آیت (۱۹/۲۲)، صفحہ ۶۸۹

[۲] انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن ایتھکس، جلد ۳، صفحہ ۴۹۷ بحوالہ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۷۵

میں، داخل ہو کر، فطری اور معروف طریقہ سے، بچے کو جنم دیا تھا، تو پھر ولادتِ عیسیٰ کے بعد، جب وہ اسے اٹھائے ہوئے قوم کے پاس آئی تھیں، تو قوم نے کیوں اسے سرزنش کرتے ہوئے، یہ کہا تھا کہ:

قَالُوا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا ۝ يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا (مریم – ۲۷، ۲۸)

''لوگ کہنے لگے ''اے مریم! تو نے بڑا پاپ کر ڈالا، اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ ہی کوئی بُرا آدمی تھا، اور نہ تیری ماں ہی کوئی بدکار عورت تھی۔''

باپ کے ''بُرا نہ ہونے'' کے بالمقابل، ماں کے ''بدکار نہ ہونے'' کا بیان، اس امر کی دلیل ہے کہ اعتراض کا ہدف، مریم کی عفت و عصمت سے متعلق ہے نہ کہ، رسم خانقاہیت کی خلاف ورزی کے متعلق۔ لیکن ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اس سوال کا جواب پیش کرنے کے لیے پھر انحراف کی راہ اپناتے ہیں، جسکی بناء پر، ان کے نزدیک، لوگوں کے اعتراض وطعن کی اصل وجہ، کنواری مریم کے بیٹا جن دینے کا عمل نہیں ہے، بلکہ قوانینِ ہیکل کی خلاف ورزی کر کے، متاہل زندگی گزارنے کا عمل ہے، چنانچہ وہ، ان آیات کا مفہوم، ایک خود ساختہ، تمہیدی اقتباس کے بعد، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

(۲۷)...... چنانچہ وہ لوگ مریم سے کہتے کہ تم نے پہلے خود بھی عجیب وغریب حرکت کی اور اسکے بعد، اسی قسم کا انوکھا بیٹا لیکر آ گئیں۔

(۲۸) وہ اس سے کہتے کہ ''اے اخت ہارون! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا، نہ ہی تیری ماں نے کبھی ہیکل کے قوانین وضوابط سے سرکشی کی تھی۔'' [۱]

گویا، قوم کے معترضین کا مریم کو لعن طعن کرنا، اس لیے نہیں تھا کہ اس نے تا کتخدا ہونے کے باوجود، بچے کو جنم دیا تھا بلکہ اس لیے تھا کہ اس نے ہیکل کے قوانین کی خلاف ورزی کی تھی، حالانکہ شادی کرنے میں، قوانینِ ہیکل، رکاوٹ نہ تھے، شادی نہ کرنے کی

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۶۹۰ تا صفحہ ۶۹۱

روایت ہوتو ہو۔ مگر قانونی طور پر، ایسا کرنا، قوانینِ ہیکل کی مخالفت ہرگز نہ تھی، کیونکہ ''بعض اوقات، ایسا کربھی لیا جاتا تھا''، اور جب دور ماضی میں ایسا کرنے پر، کبھی ہنگامہ برپا نہیں ہوا، تو اب اس ہنگامہ آرائی کا جواز کیا؟ کیسا؟ اور کیونکر؟ اس سے بھی واضح ہے کہ قوم کی طرف سے یہ ہنگامہ آرائی اوراعتراضات کی بوچھاڑ، لعنت ملامت کی یلغار کا سبب، قوانینِ ہیکل کی مخالفت نہ تھی، بلکہ کنواری مریم کے بچہ جن دینے کا عمل تھا۔

لفظ بغیاً اور ''مفکر قرآن'':

''مفکر قرآن'' کی طرف سے بغیاً کا یہ معنٰی کہ ''قوانینِ ہیکل سے سرکشی برتنے والا'' پیش کیا جانا، قطعی طور پر غلط ہے، اس کا معنٰی، فی الواقع ''زنا کار''، یا ''بدکاری کرنے والا'' ہی ہے، کسی اورنوعیت کا گناہ کرنا، اس لفظ کے مفہوم میں شامل نہیں ہے، خود پرویز صاحب نے لغات القرآن میں یہ لکھا ہے:

> ''بَغَتِ الْمَرْءَ ةُ بِغَاءً ا : عورت اپنی حدود عفت سے بڑھ گئی اور زنا کی مرتکب ہوگئی، بَغِيٌّ اور بَغُوٌّ زنا کار، عورت کو کہتے ہیں۔'' [۱]

لیکن لغات القرآن کے اگلے ہی صفحہ پر، وہ اپنی اس تحقیق سے پھر جاتے ہیں، اور اسی بَغِيٌّ کے لفظ کے بارے میں، ایک اور معنٰی گھڑ ڈالتے ہیں۔

> ''سورہ نور میں البغاء کا لفظ ''زنا کاری'' کے لیے آیا ہے (۲۴/۳۳)، لیکن سورہ مریم میں بَغِيّاً کا لفظ ''حدود شکن'' کے لیے (۲۰ /۱۹) آیا ہے، خاص طور پر زنا کار کے لیے نہیں، یعنی حضرت مریم نے کہا کہ میں ہیکل میں (Nun) کی زندگی بسر کر رہی ہوں اور (Nun) کے متعلق، ''قانون شریعت'' یہ ہے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں، میں نے اس قانون کو نہیں توڑا، واضح رہے کہ ہیکل کے احبار و رہبان، حضرت مریم کے خلاف، یہ الزام عائد کرتے تھے، کہ اس نے ہیکل سے نکل کر متاہل زندگی اختیار کر لی ہے، اور یہ چیز

---

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۳۳۵

شریعتِ خانقاہیت کے خلاف ہے، اس لیے انہوں نے کہا تھا کہ تیری ماں تو ان حدود شریعت کو نہیں توڑتی تھی (۱۹/۲۸)، تو نے حدود شکنی کیسے اختیار کر لی؟'' [۱]

جب کوئی آدمی حقیقت کو نہ ماننا چاہتا ہو، اور حقیقت واقعہ کو پس پشت ڈال کر، خود بات بنانے کا عادی ہو، تو اپنی اس سخن سازی کے دوران، خواہ وہ کتنا ہی چوکنا اور بیدار مغز ہو کر، تسویلِ نفس سے کام لے، بہر حال، اسکی اس کاروائی میں، کوئی نہ کوئی جھول یا خلاء یا کوئی اور عیب واقع ہو کر رہتا ہے، جو اسکی سخنسازی کی قلعی کھول دیتا ہے۔

اب یہاں تو ''مفکر قرآن'' نے یہ فرمایا کہ...... ''(Nun) کے متعلق، قانونِ شریعت یہ ہے کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کریں'' ...... لیکن، اس سے پہلے، وہ، انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس کے حوالہ سے یہ بیان کر چکے ہیں کہ...... ''عام طور پر ان عورتوں کی شادی کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا، اگرچہ بعض اوقات ایسا کر بھی لیا جاتا تھا'' ...... لہٰذا، شادی نہ کرنا، کوئی قانونِ شریعت نہ تھا، بیش از بیش اسے صرف روایت کا درجہ حاصل تھا، اور روایت بھی ایسی، جسکی کبھی مخالفت بھی کر لی جاتی تھی، معلوم ہوتا ہے کہ خود ''مفکر قرآن'' نے اپنے موقف کی اس کمزوری اور تضاد کو محسوس کیا، پھر ایک دوسری سخنسازی کے ذریعہ، خالصتاً تسویلِ نفس سے کام لیتے ہوئے، اسے یوں رفع کرنے کی کوشش کی۔

''شروع میں ہیکل کا ضابطہ یہ تھا کہ راہبات، زمانہ قبل از بلوغ تک، ہیکل میں رہتی تھیں، پھر اس میں یہ ترمیم کی گئی کہ انہیں ساری عمر، راہبہ کی حیثیت سے رہنا ہوگا، عام حالات میں، انہیں تجرد کی زندگی بسر کرنی ہوتی تھی، لیکن بعض خاص حالات میں، ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ، ان کی شادی ہو سکتی تھی، وہ نہ تو ان پجاریوں کی جماعت سے باہر کسی سے شادی کر سکتی تھیں، اور نہ ہی ہیکل چھوڑ کر جا سکتی تھیں، اس ضابطہ کی خلاف ورزی، شرعی جرم کا

---

[۱] لغات القرآن، صفحہ ۳۳۶

ارتکاب قرار پاتا تھا، ان کی شریعت، کسی راہبہ کی پجاریوں سے باہر، کسی مرد سے شادی کو جائز نکاح قرار نہیں دیتی تھی۔‘‘ [۱]

اب اس سخن سازی سے ’’مفکر قرآن‘‘ نے دو فائدے اٹھائے۔

اولاً...... یہ کہ گویا، اس سے انہوں نے اپنے تضاد کو رفع کر ڈالا۔

ثانیاً...... یہ کہ، ایک ایسا پسِ منظر بھی گھڑ ڈالا، جس میں بَغِیًا کا معنٰی ’’حدود شکن‘‘ مراد لینے کی گنجائش نکالی جا سکے۔

علاوہ ازیں، دنیا جہان کی کوئی سی کتاب لغت، اٹھا لیجئے، بَغِیٌّ کا معنٰی ’’زنا کار‘‘ ہی کے لیے مخصوص ہوگا، ’’مفکر قرآن‘‘ محض، اپنی بات بنانے کے لیے، یہ لغوی انحراف اختیار کر رہے ہیں، سورہ مریم میں، جہاں بھی بَغِیًا کا لفظ آیا ہے، وہ فی الواقعہ، ’’زنا کار‘‘ ہی کے معنٰی میں آیا ہے، (نہ کہ ہیکل کے قوانین وضوابط کے توڑنے والے کے معنٰی میں)۔ پھر یہ حدود شکنی ہے بھی نہیں، کیونکہ (Nuns) کا متاہل زندگی اختیار کرنا، خلافِ ضابطہ تھا ہی نہیں، کیونکہ خود ان کے ہاں، ’’بعض اوقات ایسا کر بھی لیا جاتا تھا‘‘۔

مزید برآں، اگر یہاں فی الواقعہ، ’’حدود شکن‘‘ ہی کا معنٰی مراد ہوتا، تو لفظ بَغِیًا کی بجائے، بَاغِیَۃٌ ہوتا جیسا کہ فِئَۃٌ بَاغِیَۃٌ کی ترکیب میں واقع ہے۔

حیرت کی بات یہ ہے کہ لغات القرآن لکھتے وقت، تو ’’مفکر قرآن‘‘ نے یہ طے کر دیا کہ سورہ مریم میں بَغِیًا کا لفظ ’’حدود شکن‘‘ کے معنٰی میں آیا ہے، لیکن ایک مدت کے بعد، جب تفسیر مطالب الفرقان لکھی، تو اس میں، اس لفظ کا پھر وہی سابق معنٰی، پیش کیا گیا۔

’’یہاں مَسِّ بَشَر، بَغِیًا کے مقابلہ میں آیا ہے، بَغِیًا سے مراد، ناجائز اختلاط ہے۔‘‘ [۲]

سورہ مریم کی دو ہی آیات میں، بَغِیًا کا لفظ آیا ہے، (آیت ۲۰، اور آیت ۲۸ میں) دونوں جگہ، اس کا معنٰی بدکار اور زنا کار ہی ہے، حتیٰ کہ خود، پرویز صاحب نے بھی درج ذیل

---

[۱] تفسیر مطالب القرآن، ج ۴، صفحہ ۷۶ [۲] تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۴، صفحہ ۹۸

اقتباسات میں، اس لفظ کے اسی معنٰی کو اختیار کیا ہے۔

(۱)..... قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا (۱۹/۲۰)

''مریم بولی'' یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں اور نہ میں بدچلن ہوں۔'' [۱]

(۲)..... يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا (۱۹/۲۸)

''اے ہارون کی بہن! نہ تیرا باپ بُرا آدمی تھا اور نہ تیری ماں بدکردار تھی (تو یہ کیا کر بیٹھی)۔'' [۲]

(۳)..... ''یعنی حضرت مریمؑ نے کہا کہ میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوسکتا ہے جبکہ صورت یہ ہے کہ میرا نکاح بھی نہیں ہوا، اور میں (معاذ اللہ!) حرام کاری کی مرتکب بھی نہیں ہوئی۔'' [۳]

(۴)..... ''حضرت مریم نے کہا کہ میں نے نہ شادی کی ہے اور نہ ہی حرامکاری کی (معاذ اللہ) مرتکب ہوئی ہوں تو میرے ہاں بچہ کیسے ہوگا؟'' [۴]

مریمؑ، اعتراضات کی بوچھاڑ میں:

قوم کی طرف سے اس لعنت ملامت، اور فضیحت آمیز گفتگو کے جواب میں، مریمؑ بیچاری کیا کرتی؟ وہ انہیں کیا جواب دیتی؟ پھر اگر طعن و تشنیع کی اس تلخ فضاء میں، وہ اپنی صفائی پیش کرتی بھی، تو کیا قوم کے بڑے اور بالخصوص معترض حضرات، اسے قبول کر لیتے؟ اللہ تعالیٰ نے اسی صورتحال سے نپٹنے کے لیے، مریمؑ کو اس سے پہلے ہی، یہ ہدایت فرما دی تھی کہ:

---

[۱] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۵۴۹، ۵۵۱
[۲] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۵۵۳
[۳] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۹۹
[۴] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۱۰۷

فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَداً فَقُولِي اِنِّي نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوماً فَلَنْ
اُكَلِّمَ الْيَومَ اِنْسِيًّا (مریم — ۲۶)

''پھر اگر کوئی آدمی، تجھے نظر آئے، تو اس سے کہہ دے کہ میں نے رحمان کے لیے روزہ کی نذر مانی ہے، اس لیے آج میں، کسی سے نہ بولوں گی۔''

اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت میں، مریم کے لیے تسلی اور اطمینان ہے کہ ''بچے کے معاملہ میں، اے مریم، تجھے بولنے کی ضرورت نہیں، اسکی پیدائش پر، جو کوئی بھی معترض ہو، اس کا جواب، اب ہمارے ذمہ ہے، تیرے لیے، اشارۃً، یہ بتلا دینا ہی کافی ہے کہ میں نے رحمان کے لیے چپ کا روزہ رکھا ہوا ہے۔''

مریم کے یہ الفاظ، اور اللہ تعالیٰ کی اس صورتحال میں، یہ ہدایت، اس امر کو واضح کر دیتے ہیں کہ حضرت مریم کو اصل پریشانی کیا تھی؟ کنواری ہو کر، اسکا بیٹے کو جنم دینا؟ یا رسمِ خانقاہیت کو توڑنا؟ اگر دوسری بات ہوتی تو لوگوں کا یہ ہجوم، اعتراضات، اور طعن و تشنیع کی اس بوچھاڑ کے ساتھ، اُس پر اُس وقت حملہ آور ہوتا، جب وہ ہیکل چھوڑ کر نکلی تھی یا بقولِ پرویز، رسمِ خانقاہیت کی خلاف ورزی، جس روز، اُس سے صادر ہوئی تھی، اب کیا یہ عجیب بات نہیں کہ وہ آج مریم پر اس واقعہ کے ضمن میں لعن طعن کرنے کے لیے چڑھ دوڑے ہیں، جس کا وقوع، کم از کم ایک ڈیڑھ سال قبل ہوا تھا؟

علاوہ ازیں، یہاں یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں، پہلوٹی کا بچہ، اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو، تو اسے چُپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے؟

الغرض! اللہ تعالیٰ کی اس ہدایت کے بعد ہی مریم، اپنی قوم کے پاس، بچے کو لیکر آئی تھیں۔ فَاَتَتْ بِهٖ قَومَهَا تَحْمِلُهٗ (۱۹/۲۷) قَومَهَا کے الفاظ بھی یہ صراحت کرتے ہیں کہ وہ ولادتِ پسر کے بعد، اپنی قوم ہی کی طرف آئی تھیں، اگر وہ شادی شدہ ہوتیں، تو اول تو بچے کی معروف فطری طریقہ پر، ولادت کے موقع پر، وہ گھر سے ہی نہ نکلتیں، اور اگر نکلی ہی

تھیں، تو پھر شوہر کی قوم کے ہاں جاتیں، نہ کہ خود اپنی قوم کے پاس۔ (بلکہ قوم کی لعنت ملامت اور طعن و تشنیع سے بچنے کے لیے، وہ اسی اجنبی ماحول ہی میں ٹھہری رہتیں، جس میں وہ بقول پرویز، احبار و رہبان کی ڈانٹ ڈپٹ اور زجر و توبیخ سے محفوظ رہنے کے لیے، گئی تھیں، تاکہ وہ اطمینان سے بچے کو جنم دے سکتیں) بہر حال، اجنبی ماحول کو چھوڑ کر، شوہر کے گھر اور سسرال کے افراد میں، مریم کا نہ جانا، اور اپنی قوم ہی کی طرف، لوٹ کے آنا، خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ غیر شادی شدہ تھیں، اس لیے بچہ جننے کے بعد، لامحالہ، انہیں اپنی ہی قوم کی طرف لوٹنا تھا۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُه کے الفاظ، یہ حقیقت بھی واضح کر دیتے ہیں کہ وہ خود، بچے کو اٹھائے ہوئے آئی تھیں، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ بچہ، ابھی عمر کے اپنے حصہ کو نہ پہنچا تھا کہ وہ خود چل کر آ سکتا، یا یہ کہ وہ سوار ہو کر آتا، جیسا کہ بعض جاہلوں نے، آیت لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ سے غلط استدلال کرتے ہوئے کہا ہے۔

گہوارے میں گفتگو:

اس کے بعد، مریم کے ساتھ، طعن و تشنیع اور زجر و ملامت کا وہ واقعہ پیش آتا ہے، جس کے دوران، اللہ تعالیٰ نے، مریم کو مہر بلب رہنے کی تاکید کی تھی، اس نے کیا کیا؟

فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا

(مریم — ۲۹)

''مریم نے بچے کی طرف اشارہ کر دیا، لوگوں نے کہا ''ہم اُس سے کیا بات کریں، جو گہوارے میں پڑا ہوا ایک بچہ ہے۔''

قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے، اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ ''ہم اس سے کیا بات کریں جو ابھی کل کا بچہ ہے'' یعنی ان کے نزدیک، حضرت عیسیٰؑ کی یہ گفتگو، ان کی جوانی کے زمانے میں ہوئی، اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ ''بھلا اس بچے سے ہم کیا بات کریں، جو کل ہمارے سامنے، گہوارے میں پڑا ہوا تھا'' مگر جو شخص بھی،

موقع ومحل اور سیاق وسباق پر کچھ بھی غور کرے گا، وہ یہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے، جو اعترافِ معجزہ سے بچنے کے لیے کی گئی ہے، اور نہیں، تو ان تاویل سازوں نے یہی سوچا ہوتا کہ وہ لوگ، جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے آئے تھے، وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی، نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں، سورہ آل عمران کی آیت ۴۶، اور سورۂ مائدہ کی آیت ۱۱۰، دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام، جوانی میں نہیں بلکہ گھوارے میں، نوزائیدہ بچے کی حیثیت ہی سے کیا تھا، پہلی آیت میں، فرشتہ، حضرت مریمؑ کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے، یہ کہتا ہے کہ:

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (آل عمران – ۴۶)

''وہ لوگوں سے گھوارے میں (پڑا ہوا) بھی بات کریگا اور ادھیڑ عمر میں بھی۔''

اور دوسری آیت میں، اللہ تعالیٰ، خود حضرت عیسیٰؑ سے مخاطب ہوکر فرماتا ہے کہ

وَتُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا (المائدہ – ۱۱۰)

''اور تُو گھوارے میں (پڑا ہوا) لوگوں سے باتیں کرتا تھا، اور ادھیڑ عمر میں بھی۔''

چنانچہ قرآن کریم، اُن کی گھوارے کی گفتگو کو یوں نقل کرتا ہے۔

قَالَ إِنِّي عَبْدُ اللَّهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ وَأَوْصَانِي بِالصَّلَاةِ وَالزَّكَاةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُ وَيَوْمَ أَمُوتُ وَيَوْمَ أُبْعَثُ حَيًّا (مریم – ۳۰ تا ۳۳)

''بچہ بول اٹھا'' میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا، اور بابرکت کیا جہاں بھی میں رہوں، اور نماز وزکوٰۃ کی پابندی کا حکم دیا، جب تک میں زندہ رہوں اور اپنی والدہ کا حق ادا کرنے والا بنایا اور مجھے جبار اور شقی نہیں بنایا، سلام ہے مجھ پر، جبکہ میں پیدا ہوا، اور جبکہ میں مروں، اور جبکہ زندہ کرکے

اٹھایا جاؤں۔''

یہ ہے وہ ''نشانی'' جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں، بنی اسرائیل کے سامنے پیش کی گئی، اور جس کے متعلق، اللہ تعالیٰ نے پیشگی اعلان فرمایا کہ وَلِنَجْعَلَهُ آيَةً لِلنَّاسِ (تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دیں)۔ اللہ تعالیٰ، بنی اسرائیل کو، ان کی مسلسل بدکرداری پر عبرتناک سزا دینے سے پہلے، اتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے، اس نے یہ تدبیر فرمائی، کہ بنی ہارون کی ایک ایسی عابدہ وزاہدہ بیٹی کو، جو بیت المقدس میں معتکف اور حضرت زکریاؑ کے زیرِ کفالت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا، تاکہ جب وہ بچہ کو لیے ہوئے آئے، تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے، اور لوگوں کی توجہات یکلخت، اس پر مرکوز ہو جائیں، پھر اس تدبیر کے نتیجہ میں، جب ایک ہجوم، حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا، تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر، نبوت کے منصب پر سرفراز ہو، تو قوم میں ہزاروں آدمی، اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اسکی شخصیت میں، وہ، اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں، اس پر بھی جب یہ قوم، اسکی نبوت کا انکار کرے اور اسکی پیروی کرنے کی بجائے، الٹا اسے مجرم بنا کر، صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے، تو پھر اسکو ایسی عبرتناک سزا دیجائے، جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔

الغرض، سورہ مریم میں مذکور، حضرت مریمؑ کا پورا واقعہ، اگر منکرینِ معجزات کے اپنے ترجمۂ آیات میں بھی پڑھا جائے (بشرطیکہ ان میں اضافی اور الحاقی الفاظ کو الگ کر دیا جائے) تو عیسیٰ علیہ السلام کی خارقِ عادت اور معجزانہ پیدائش میں کوئی شک نہیں رہ جاتا، لیکن جو لوگ، قرآن کا نام لیکر، اپنے ہی نظریات وتصورات کی پیروی کرنے والے ہوں، انہیں قدم قدم پر، قرآن کے الفاظ سے برسرِ پیکار ہونا پڑتا ہے، جس سے قرآنی آیات کی تحریفات کا سلسلہ جنم لیتا ہے، ''مفسرِ قرآن'' کی تاویلات کے نام پر یہ تحریفات، دراصل، ان کی اسی ذہنی کیفیت پر غماز ہیں۔

باب چہارم

ولادتِ یحییٰ اور ولادتِ عیسیٰ

(سورۃ مریم کی روشنی میں)

سورہ آل عمران میں، سب سے پہلے حضرت مریمؑ کی ولادت مذکور ہے، پھر اس کے بعد، حضرت یحییٰ، اور آخر میں حضرت عیسیٰ علیہما السلام کا ذکرِ ولادت ہے، لیکن سورہ مریمؑ میں، والدۂ عیسیٰؑ کی ولادت کا ذکر موجود نہیں ہے، صرف حضرت یحییٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام ہی کی ولادت کا ذکر پایا جاتا ہے۔

ذکرِ ولادتِ یحییٰ علیہ السّلام:

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی ولادت کا ذکر، آغازِ سورہ مریمؑ میں، بایں الفاظ کیا گیا ہے:

كٓهٰيٰعٓصٓ (۱) ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا (۲) اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا (۳) قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (۴) (مریمؑ ۱ — ۴)

''ک۔ ھا۔ یا۔ ع۔ص۔ یہ تیرے رب کی اُس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر کی جبکہ اس نے چپکے چپکے اپنے رب کو پکارا اور عرض کیا ''پروردگار! میری ہڈیاں کمزور پڑ گئی ہیں، اور میرا سر بڑھاپے سے بھڑک اٹھا ہے، اور میں تجھ سے دعا مانگ کر، اے میرے پروردگار! کبھی نامراد نہیں ہوا۔''

ان آیات میں، جو چپکے چپکے دعا مانگنے کا ذکر ہے، تو یہ اس لیے کہ شدید بڑھاپے میں، طلبِ فرزند کے لیے دعا کرتے ہوئے، وہ ایک حجاب سا محسوس کر رہے تھے، تولدِ پسر کے حوالہ سے، اگرچہ ظاہری حالات سازگار نہ تھے، لیکن وہ اپنے رب کی رحمت سے مایوس بھی نہیں تھے۔ تاہم ولادتِ فرزند میں، جو ظاہری رکاوٹ حائل ہے، اس کا ذکر، وہ ہڈیوں میں نقاہت اور شدید بڑھاپے کے باعث، سر کے بالوں کے سفید پڑ جانے کی صورت میں

کر رہے ہیں:

وَاِنِّی خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِن وَّرَآئِی وَکَانَتِ امْرَءَ تِیْ عَاقِرًا فَھَبْ لِی مِن لَّدُنْکَ وَلِیًّا یَرِثُنِی وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًا

(مریم ۵ - ۶)

''اور میں ، اپنے بعد، اپنے وارثوں سے خدشہ محسوس کرتا ہوں، اور میری بیوی بانجھ ہے، پس تو اپنی جناب سے مجھے وارث عطا فرما جو میری اور آل یعقوب کی میراث پائے، اور اسے، اے میرے پروردگار، پسندیدہ انسان بنا۔''

اس آیت میں، تین باتیں قابلِ غور ہیں۔

(۱)...... سب سے پہلی بات تو یہ کہ حضرت زکریاؑ نے یہاں ولادتِ فرزند میں حائل، اُس دوسری رکاوٹ کا ذکر فرمایا ہے جو ان کی بیوی کے بانجھ پن کے صورت میں موجود تھی، جبکہ پہلی رکاوٹ، جو خود ان کا شدید بڑھاپا تھا، اس سے قبل مذکور ہو چکی تھی۔ اور امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی تمنا کے بر آنے میں، اور ان کی بانجھ بیوی کی گود کے ہری ہونے میں، یہ دونوں موانع حائل تھے۔

(۲)...... دوسری بات یہ کہ، ظاہری اسباب کے فقدان کے باوجود، وہ رحمتِ خداوندی سے مایوس نہیں تھے، اور مِن لَّدُنْکَ کے الفاظ، اس حقیقت کو واضح کر دیتے ہیں کہ حضرت زکریاؑ کی نظر، اس عالم اسباب میں بھی، اسباب سے کہیں زیادہ، مسبب الاسباب ہستی پر ہے۔

(۳).... تیسری بات یہ کہ وہ اپنے بھائی بندوں سے خوف و خدشہ محسوس کر رہے تھے۔ یہ کس قسم کا خوف تھا؟ اس خدشہ کا باعث کیا تھا؟ ''صاحبِ کتاب''، ایک نئی نرالی انچ اختیار کرتے ہیں، اور یکے از ''دانشورانِ قرآن'' ہونے کی حیثیت سے، ''عقل و دانش'' کی روشنی میں، ایک ایسی بات کہتے ہیں، جو ایک طرف تو، قرآن کے بھی خلاف ہے، اور دوسری طرف نفس واقعہ کو بھی مسخ کر ڈالتی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''آل عمران کی آیت ۳۷، ۳۸ سے یہ واضح ہے کہ ہیکل میں، حضرت مریمؑ کے نگران، حضرت زکریاؑ تھے۔ انہوں نے جب کئی بار دیکھا کہ حضرت مریمؑ کو ان کی غیر حاضری میں کوئی نہ کوئی کھانے کی چیز پہنچائی جا رہی ہے، تو انہوں نے حضرت مریمؑ سے پوچھا کہ یہ کھانے کی چیزیں، انہیں کہاں سے ملتی ہیں؟ اس کے جواب میں، اس بھولی بھالی لڑکی نے بتایا کہ ''اللہ تعالیٰ سے''۔ اس پر حضرت زکریاؑ نے محسوس کیا کہ یہ کام بدنیت موالی کر رہے ہیں۔ وہ بوڑھے تھے اور اپنی کوئی اولاد نہ تھی، اس لیے ان شریر موالی کے خوف کے باعث، اللہ تعالیٰ سے بیٹے کی دعا کی۔'' [1]

کچھ سمجھا، آپ نے، کہ اس داستان سرائی کے نتائج کیا نکلتے ہیں؟

اولاً .... یہ کہ بدنیت موالی، (بقول ان کے) حضرت مریمؑ کو اشیاء خوردنی نہ پہنچاتے (حالانکہ ایسا کرنے کا کوئی ثبوت قرآن میں نہیں ہے)، تو نہ حضرت زکریاؑ کو کوئی خوف لاحق ہوتا، اور نہ وہ حصولِ فرزند کے لیے دعا کرتے۔ یعنی طلبِ فرزند کا محرک اور سبب، کوئی مثبت امر نہ تھا، بلکہ یہ منفی صورتِ حال تھی، جس سے نپٹنے کے لیے دعا مانگی گئی۔

ثانیاً ...... یہ کہ حضرت مریمؑ، اس قدر ''بھولی بھالی'' تھیں، اور انہیں اتنا بھی فہم و شعور، اور اتنی بھی عقل و دانش حاصل نہ تھی، جتنی ''مصنفِ کتاب'' کو حاصل ہے، اور وہ حضرت زکریاؑ کے دریافت کرنے پر بھی، حصولِ رزق کا صحیح ذریعہ نہ بتا سکیں۔

ثالثاً ...... یہ کہ ان ہی بدنیت موالی کی شرارت سے حفاظت کے لیے، حضرت زکریاؑ نے حصولِ پسر کی تمنا کی۔

اب ذرا غور فرمایئے کہ بدنیت موالی، حضرت مریمؑ کو اشیاء خوردنی پہنچانے کی ''شرارت'' آج کر رہے ہیں، اور آج ہی، فوری طور پر، ان کی شرارتوں سے محفوظ اور مصؤن رہنا مطلوب ہے۔ اس فوری ضرورت کے تحت، طلبِ فرزند کے لیے، جو دعا آج

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۱۷

کی جا رہی ہے، اس کی قبولیت کی صورت میں بطن مادر میں استقرار حمل کے بعد، جنین کی مختلف حالتوں میں سے گزرتے ہوئے، کب یہ بچہ معرضِ وجود میں آ کر، رضاعت، طفولیت، بچپن اور لڑکپن کی منازل میں سے گزرتا ہوا، اس قابل ہوگا کہ وہ ان ''بدنیت موالی کی شرارت'' کا سد باب کر سکے؟ لیکن حرام ہے جو یہ ''روشن خیال''، ''عقل و دانش کے علمبردار''، کبھی ٹھنڈے دل سے یہ سوچیں کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔

خوفِ موالی کا اصل سبب؟:

قرآنی آیت پر ایک غائر نگاہ ڈالنے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اپنے پسماندگان کے بارے میں، حضرت زکریاؑ کے خوف کا باعث کیا تھا؟ دعاءِ زکریاؑ میں وَاِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن وَّرَآئِي کو اُن کی اس تمنا کے بالمقابل رکھا گیا ہے کہ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ وَلِيًّا يَرِثُنِي وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوبَ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انہیں اپنے موالی سے جو خوف تھا، وہ حضرت مریمؑ کے ساتھ، موالی کی کسی بدنیتی یا شرارت کے حوالہ سے نہ تھا، بلکہ اس حوالہ سے تھا کہ ان کے بھائی بندوں کے لچھن اچھے نہ تھے، اور وہ اس قابل نہ تھے کہ انبیاءِ بنی اسرائیل کی میراثِ علم و ہدایت کے حامل بن پاتے، چنانچہ حضرت زکریاؑ، اُن کی ایسی بگڑی ہوئی حالت کے پیشِ نظر، ایسے فرزند اور وارث کے متمنی تھے جو وراثتِ انبیاء کا اہل ہو۔ جملہ علماءِ سلف و خلف نے خوفِ زکریاؑ کا باعث، اسی چیز کو قرار دیا ہے، حتی کہ پرویز صاحب بھی اسی کے قائل تھے۔ چنانچہ وہ، دورانِ درس یہ کہا کرتے تھے:

> ''میں بوڑھا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ اس لیے بظاہر، اب مجھے اولاد کا کوئی امکان دکھائی نہیں دیتا اور اولاد نہ ہونے کا غم اس لیے ہے کہ ہمارے جد امجد حضرت یعقوب علیہ السلام کی برکات اور خصوصیات، اس گھرانے میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی ہوئی مجھ تک پہنچی ہیں۔ میرے بھائی بندوں میں کوئی اس قابل نہیں جو ان کا اہل ہو سکے، اس لیے مجھے ڈر ہے کہ میرے بعد وہ انہیں ضائع کر دیں گے، اور یہ سلسلہ آگے نہیں چل سکے گا، اس لیے میری دعا یہ ہے

کہ تو اپنی جناب سے مجھے کوئی وارث عطا کر دے جو ان برکات و نعماء کا اہل بن سکے۔'' [1]

الغرض، ''صاحبِ کتاب''، نے یہاں جو نرالی اُپج اختیار کی ہے، وُہ، خود پرویز صاحب کو بھی قابلِ تسلیم نہیں ہے۔

آیات ۷:

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا

(مریمؑ ۷)

''اے زکریا! ہم تمہیں ایک ایسے لڑکے کی بشارت دیتے ہیں، جس کا نام یحییٰ ہوگا، اور ہم نے اس کا نام (اور مثیل و نظیر) بھی (کسی کو) نہیں بنایا۔''

حضرت زکریاؑ کو خدا کی طرف سے ولادت یحییٰ کی یہ بشارت، فرشتوں کے ذریعہ سے ملی، یہ وہ پیغمبر ہیں جن کا نام، ان کی پیدائش سے قبل ہی بارگاہِ ایزدی سے تجویز ہو چکا تھا، اور یہ نام بھی ایسا ہے کہ نہ تو، اس سے قبل، ان کے خاندان میں کسی کا یہ نام تھا، اور نہ ہی اپنی خوبیوں اور خصوصیات کے اعتبار سے، کوئی ان کا شبیہ و نظیر یا مثیل و ہمسر تھا۔

آیات ۸ تا ۹:

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّكَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا قَالَ كَذٰلِكَ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّقَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ تَكُ شَيْئًا (مریمؑ ۸ – ۹)

''کہا ''پروردگار! میرے ہاں لڑکا کیوں کر ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور مَیں خود بڑھاپے میں حد سے گزر چکا ہوں۔'' فرمایا ''اسی طرح (بیٹا ہوگا)۔ تیرے رب نے کہا کہ ایسا کرنا مجھ پر مشکل نہیں، جبکہ قبل ازیں، میں تجھے پیدا کر چکا ہوں، اور تیرا وجود تک نہ تھا۔''

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۵

پھر یہاں حضرت زکریاؑ، اپنی دونوں رکاوٹوں کا ذکر فرما رہے ہیں، جو پہلے بھی مذکور ہو چکی ہیں، یعنی خود ان کا انتہائی بڑھاپا، اور ان کی بیوی کا بانجھ پن۔ اور اب ساتھ ہی استعجاباً یہ سوال کہ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ ''میرے ہاں، لڑکا کیسے ہوگا؟'' جواباً ارشاد ہوتا ہے کَذٰلِکَ ''اسی طرح (اسی حالت میں) ہوگا۔'' یہاں کَذٰلِکَ بجائے خود، ایک پورے جملہ کا مفہوم لیے ہوئے ہے، اور لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں مَا یَشَآءُ کے وہ الفاظ موجود ہی نہیں ہیں، جن کی آڑ لے کر، ''مفکر قرآن'' صاحب، قانونِ مشیئت کی خود ساختہ اصطلاح کو اپناتے ہوئے، مسرفانہ الفاظ کے ساتھ عبارت آرائی کرتے ہوئے، اس واقعہ میں سے معجزانہ پہلو کو خارج کرنے پر تُل جایا کرتے تھے، اور پھر اسے ایک عام عادی واقعہ بنا ڈالتے تھے۔

پھر کَذٰلِکَ (یعنی اس طرح اور ان موانع کے باوجود بھی) بیٹے کے پیدا ہونے کے معاملے کو، اللہ کی قدرتِ کاملہ کے حوالے سے یوں بیان کیا گیا ہے کہ ''خدا کے لیے، ایسی حالت میں، جیسی (اے زکریاؑ) تُو نے بیان کی ہے، بیٹا پیدا کر دینا کون سا مشکل کام ہے۔'' اور پھر اس کی تائید و تقویت، اس واقعاتی دلیل سے کی گئی ہے کہ ''اے زکریاؑ! اس سے پہلے ہم تمہیں پیدا کر چکے ہیں حالانکہ تیرا وجود تک نہ تھا''۔

اب اگر، حضرت یحیٰیؑ کی پیدائش، ایک ایسا معمول کا عام واقعہ تھا، جس کے وقوع میں سرے سے کوئی موانع حائل ہی نہ تھے، تو اللہ تعالیٰ کو اپنی قدرت کاملہ کے ذکر کرنے کی، اور حضرت زکریاؑ کو، ان کی اپنی ذات سے واقعاتی دلیل فراہم کرنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟

آیات ۱۰:

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّیْٓ اٰیَةً ؕ قَالَ اٰیَتُکَ اَلَّا تُکَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَیَالٍ سَوِیًّا (مریمؑ ۱۰)

''عرض کیا ''پروردگار! میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دیجئے'' فرمایا ''نشانی یہ کہ تُو تین رات (دن) تک بھلا چنگا ہونے کے باوجود لوگوں سے بات چیت نہ کر

سکے گا۔‘‘

اگرچہ اس آیت پر، گذشتہ باب میں تفصیلی بحث کی جا چکی ہے، لیکن پھر بھی اعادہ و استحضار کے لیے، دو باتوں کی طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

اولاً ...... یہ کہ **اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ** کا ترجمہ، ’’مفکر قرآن‘‘ نے جہاں بھی کیا ہے، غلط ہی کیا ہے۔ وہ **اَلَّا تُكَلِّمَ** کو فعل نہی سمجھ کر، جہالتاً یا خیانتاً، غلط ترجمہ کرتے رہے ہیں، حالانکہ یہ فعل مضارع ہے (نہ کہ فعل نہی)۔

ثانیاً ...... یہ کہ اس آیت میں مذکور لفظ **سَوِيًّا** کو، سورۃ الانبیاء کی آیت ۹۹ سے ملا کر، ’’صاحبِ کتاب‘‘، غلط ترجمہ کرتے ہوئے، یہ ’’مفہوم‘‘ پیدا کرتے ہیں کہ حضرت زکریا علیہ السلام، جس بیماری کا شکار تھے، اُس سے انہیں شفایاب کر دیا گیا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

> ’’مذکورہ بالا دونوں آیتوں کے مطابق، حضرت زکریا تندرست بنا دیے گئے، اور ان کی بیوی کا بانجھ پن دور کر دیا گیا۔‘‘ [۱]

حالانکہ حضرت زکریا، نہ تو علیل و سقیم تھے، اور نہ ہی بیمار و مریض تھے، کہ وہ شفایاب کر دیے گئے۔ **سَوِيًّا** کے لفظ سے یہ مفہوم نکالنا کہ وہ، پہلے تندرست نہیں تھے، بعد میں تندرست بنا دیے گئے، اپنے باطل موقف کے لیے چور دروازے اختیار کرنے کے مترادف تھے، ورنہ زیرِ بحث آیت میں **سَوِيًّا** کا لفظ، بطورِ حال واقع ہو کر، یہ صحیح مفہوم پیدا کر رہا ہے کہ:

> ’’وہ تندرست ہوتے ہوئے، تین رات (دن) لوگوں سے کلام نہیں کریں گے۔‘‘ [۲]

آیات ۱۱:

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴ [۲] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۹

وَّعَشِيًّا (مریم ۱۱)

''پس وہ اپنی قوم کے روبرو حجرہ سے برآمد ہوئے، اور انہیں اشارہ کیا کہ (اللہ کی) تسبیح صبح و شام بیان کرتے رہیں۔''

سورہ آل عمران میں، خود حضرت زکریا علیہ السلام کو ذکر و تسبیح کا حکم دیا گیا تھا، اس آیت میں، عامۃ الناس کو بھی، یہی حکم دیا گیا، اور چونکہ لوگوں کو یہ حکم، رمز و اشارہ سے دیا گیا تھا، اس لیے اسے وحی کے لفظ سے تعبیر کیا گیا۔

آیات ۱۲ تا ۱۵:

يَا يَحْيٰى خُذِ الْكِتَابَ بِقُوَّةٍ وَّآتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا وَحَنَانًا مِّن لَّدُنَّا وَزَكٰوةً وَكَانَ تَقِيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا وَسَلَامٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا (مریم ۱۲ تا ۱۵)

''اے یحییٰ! کتاب الٰہی کو مضبوط تھام لو، ہم نے اسے بچپن ہی سے حکم سے نوازا، اور اپنی طرف سے اسے نرم دلی اور پاکیزگی عطا کی، اور وہ بڑا پرہیزگار اور اپنے ماں باپ کا حق شناس تھا، وہ نہ تو جبار تھا اور نہ ہی نافرمان۔ سلام اس پر جس دن وہ پیدا ہوا، اور جس روز مرے گا اور جس روز وہ زندہ کر کے اٹھایا جائے گا۔''

ان آیات میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کی چند صفات بیان کی گئی ہیں، جن میں سے دو صفات، خاص طور پر قابل غور ہیں۔

اولاً ...... یہ کہ وہ اپنے ماں باپ کے حق شناس تھے۔ بالخصوص اس صورت میں کہ ان کے والدین انتہائی بوڑھے تھے۔ اور عجز و بڑھاپے کی حالت میں، حق شناسی کا تقاضا، مزید شدت اختیار کر جاتا ہے، جیسا کہ خود قرآن نے بیان کیا ہے کہ...... ''اگر ماں باپ میں سے دونوں یا کوئی ایک بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جائے، تو انہیں اف تک نہ کہیئے، جھڑکیئے بھی نہیں، بلکہ ان کے حق میں یہ دعا کرتے رہیئے کہ پروردگار! ان پر رحم فرما، جیسا کہ میری کمسنی میں،

وہ (رحم کے ۔۔۔۔) میری پرورش کرتے رہے ہیں......''

ثانیاً ...... یہ کہ، اللہ تعالیٰ نے بچپن ہی میں، انہیں، علم و عرفان، فہم و فراست، اور قوتِ فیصلہ سے نواز رکھا تھا، جو ان کے گفتار و کردار سے واضح تھا۔ صغرسنی میں ایسی صفات سے متصف ہونا، یقیناً غیر معمولی بات ہے۔

تذکرۂ ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام

اب اگلی آیات میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت کا تذکرہ ہے، جس کی ابتداء یوں ہوتی ہے:

آیات ۱۶:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ إِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ أَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا

(مریمؑ ۱۶)

''اور اس کتاب (یعنی قرآن) میں سے، مریمؑ کا ذکر کیجیے، جبکہ وہ اپنے اہل خانہ سے الگ ہو کر، ایک شرقی مکان میں گئیں۔''

اس آیت میں، چند باتیں غور طلب ہیں۔

(۱) ......انتباذِ مریمؑ سے کیا مراد ہے؟ وہ کہاں سے الگ ہو کر، کس جگہ گئیں؟ کس مکان کو چھوڑا اور کسے اختیار کیا؟ اس ضمن میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ فرماتے ہیں:

''سورہ آل عمران میں بتایا گیا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ نے، اپنی مانی ہوئی نذر کے مطابق، ان کو بیت المقدس میں، عبادت کے لیے بٹھا دیا تھا۔ اور حضرت زکریاؑ نے ان کی حفاظت و کفالت، اپنے ذمہ لے لی تھی، وہاں یہ ذکر بھی گزر چکا ہے کہ حضرت مریمؑ، بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہو گئی تھیں۔ اب یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ وہ محراب، جس میں حضرت مریمؑ معتکف تھیں، بیت المقدس کے شرقی حصے میں واقع تھی اور انھوں نے معتکفین کے عام

طریقہ کے مطابق، ایک پردہ لٹکا کر، اپنے آپ کو دیکھنے والوں کی نگاہوں سے محفوظ کر لیا تھا۔ جن لوگوں نے محض بائیبل کی موافقت کی خاطر، مکانا شرقیا سے مراد، ناصرہ لیا ہے، انہوں نے غلطی کی ہے، کیونکہ ناصرہ، یروشلم کے شمال میں ہے، نہ کہ مشرق میں۔" [۱]

اس سے ظاہر ہے کہ مولانا مودودیؒ کے نزدیک، انتباذِ مریمؑ سے مراد، اہل خانہ سے الگ ہو کر، بیت المقدس کی ایک محراب میں معتکف ہونا ہے، لیکن پرویز صاحب، بائیبل کے اتباع میں، ناصرہ میں حضرت مریمؑ کا اقامت پذیر ہونا بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ وہ مفہومِ آیت ہی بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

"اور (اے پیغمبر!) کتاب میں مریمؑ کا معاملہ بیان کر، اُس وقت کا معاملہ، جب وہ ایک مکان میں، کہ پورب کی طرف تھا، اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہو گئی، پھر اس نے ان لوگوں سے پردہ کر لیا۔" [۲]

اسی مفہوم کو، اور زیادہ وضاحت کے ساتھ، شعلۂ مستور میں، بایں الفاظ پیش کیا گیا ہے:

"اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں لوگوں سے مریمؑ کا قصہ بیان کر اور سلسلۂ کلام کا آغاز، اس وقت سے کر، جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو چھوڑ کر (اپنے گاؤں ناصرہ میں) چلی گئی تھی، جو (وہاں سے) مشرق کی سمت میں واقع تھا۔" [۳]

اب رہے جناب "مصنفِ کتاب"، تو وہ بھی انتباذ مریمؑ سے مراد، گھر کی چاردیواری ہی میں، باقی افرادِ خانہ سے علیحدگی اختیار کرنا، ہی مراد لیتے ہیں، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

"المنجد نے اِنتبذ عن القوم کا معنی تنحّٰی (قوم سے الگ ہونا) لکھا ہے، لہٰذا آیت کا مفہوم یہ ہے کہ جب مریمؑ، اپنے گھر والوں سے گھر کے اندر ایسی جگہ

---

۱ تفہیم القرآن، جلد ۳، صفحہ ۶۲ ۲ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۱

۳ شعلۂ مستور، صفحہ ۱۰۹

الگ ہوئی، جہاں دھوپ میں بیٹھ سکے۔'' [1]

اس سے واضح ہے کہ پرویز صاحب اور ''صاحبِ کتاب'' کے نزدیک، انتباذ مریمؑ کا مفہوم، اس مفہوم کے بالکل برعکس ہے، جو مولانا مودودیؒ نے پیش فرمایا ہے۔ اسی اختلاف کی بناء پر، فارسلنا الیھا روحنا کا واقعہ، مودودیؒ صاحب کے نزدیک، بیت المقدس میں پیش آیا تھا، اور پرویز اور ''مصنفِ کتاب'' کے نزدیک، ناصرہ میں واقع، گھر میں۔ اگرچہ علمی طور پر، ہمارے نزدیک، مولانا مودودیؒ کا موقف قرینِ صواب ہے، لیکن ہم اس اختلاف کو نظر انداز کرتے ہوئے، آگے بڑھتے ہیں۔

(۲) ...... مِنْ اَھْلِھَا کے الفاظ سے، جناب طاہر سورتی صاحب نے بڑا خوبصورت اور جاندار استدلال کیا ہے، اس استدلال پر تفصیلی بحث تو آئندہ صفحات پر آ رہی ہے، لیکن یہاں اشارۃً، ہم جناب طاہر سورتی صاحب ہی کے الفاظ میں، توجہ دلانا کافی سمجھتے ہیں۔

> ''یہاں اھلھا کا لفظ غور طلب ہے، اس پر ہم اگلے صفحات میں تفصیلی بحث کریں گے، یہاں صرف اپنے ذہن میں اتنا رکھئے کہ ان کو بچہ اس وقت دیا گیا جب وہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو گئیں تھیں، اور ان سے حجاب اختیار کر چکی تھیں۔ اگر گھر والوں سے مراد، ان کا میکا ہے تو صاف ظاہر ہے کہ ابھی ان کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور از روئے قرآن، اس لفظ کا صحیح مفہوم یہی ہے۔ بفرضِ محال، اگر گھر والوں سے مراد، شوہر ہو، تب بھی یہ ثابت ہو رہا ہے کہ جب وہ اپنے شوہر سے حجاب اختیار کر چکی تھیں، اور ان سے دور چلی گئی تھیں، تب انہیں بچہ عطا کیا گیا۔ اگرچہ ہم موخر الذکر معنی کو غلط خیال کرتے ہیں، بہرحال، ہر دو صورت میں، بچہ، بغیر باپ کے ہی مل رہا ہے۔'' [2]

اس پر ''صاحبِ کتاب'' فرماتے ہیں:

''زیرِ بحث آیت میں، نہ تو دور جانے کا ذکر ہے، نہ حجاب کرنے یا حجاب اختیار

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۰ [2] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۲۹

کرنے پر دلالت کرنے والا لفظ، اور نہ اس وقت کسی بچہ دینے کی کوئی بات ہی کی گئی ہے۔ پھر بغیر باپ کے بچہ دینے کا ثبوت کہاں سے مل رہا ہے؟''[۱]

مولانا طاہر سورتی صاحب، اگر اس عبارت کو، زیر بحث آیت کے تحت درج کرنے کی بجائے، ذرا آگے چل کر درج فرما دیتے، تو ''صاحبِ کتاب'' کو یہ بیجا اعتراض پیدا نہ ہوتا۔ تاہم طاہر سورتی صاحب نے جو کچھ کہا ہے، اس کا ثبوت اگلی آیات میں موجود ہے۔ اب رہا لفظ اهل تو اس پر، آگے چل کر، بڑی جاندار بحث کی ہے۔

آیت ۱۷:

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (مریم ۱۷)

''پھر لوگوں سے، اُس (مریمؑ) نے پردہ کرلیا، پھر ہم نے اُن کے پاس'' اپنی روح'' کو بھیجا اور وہ ان کے سامنے بھلے چنگے انسان کے روپ میں ظاہر ہوا۔''

اس آیت میں یہ جو کہا گیا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے اُس (مریمؑ) کی طرف اپنی روح بھیجی'' تو اس میں ''روح'' سے کیا مراد ہے؟ علماء امت، خواہ وہ متقدمین میں سے ہوں یا متاخرین میں سے، اس سے مراد، حضرت جبریل علیہ السلام لیتے ہیں۔ کیونکہ خود قرآن میں، ان کے لیے، روح، روح الامین یا روح القدس کے الفاظ آئے ہیں، اور مولانا طاہر سورتی صاحب نے بھی ''روحنا'' سے مراد، خدائی فرشتہ ہی لیا ہے، جیسا کہ ان کے اُس تشریح و ترجمہ سے واضح ہے، جس پر ''صاحبِ کتاب'' نے بایں الفاظ اعتراض پیش کیا ہے:

''طاہر سورتی مرحوم کے ترجمہ و تشریح سے ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جسے مریمؑ کے پاس بھیجا تھا، وہ کوئی انسان نہیں تھا، بلکہ ایک موزوں قد و قامت کا فرشتہ تھا، اور انسانی روپ دھار کر، ان کے پاس پہنچا تھا، اور یہ مریمؑ کو ایک پاکباز لڑکا بخشنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔''[۲]

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۱ [۲] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۲

اس کے بعد، وہ، طاہر سورتی صاحب کے موقف کی تردید میں، ایک انتہائی پھُسپھُسی اور بودی دلیل، ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''فرشتہ اور انسان، ہم جنس نہیں، لہٰذا وہ کسی انسانی بچہ کا باپ نہیں بن سکتا۔''[1]

منکرین حدیث اور منکرینِ معجزات کی یہ ایک عام لیکن دائمی خصلت ہے کہ وہ حقائق کو مسخ کرتے ہیں اور امور باطلہ کا سہارا لیتے ہیں، اور ایسی باتیں وضع کر کے، علماء دین کی طرف منسوب کرتے ہیں، جو انہوں نے کہیں لکھی ہیں اور نہ ہی بیان کی ہیں۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کس عالم دین نے یہ کہا ہے کہ ''انسان اور فرشتہ، ہم جنس ہیں'' اور یہ کہ ''حضرت عیسیٰؑ، کسی فرشتے کے بیٹے ہیں'' جب ایسی بات، مولانا طاہر سورتیؒ سمیت، کسی عالم نے کہی ہی نہیں تو پھر یہ تردید کیسی؟ کیا لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنا بھی، کوئی ''قرآنی خدمت'' ہے؟

''صاحبِ کتاب''، ''روحنا'' سے مراد، یوسف نامی اُس شخص کو لیتے ہیں جسے حضرت عیسیٰؑ کا باپ قرار دینے کے لیے، ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہیں، اور جس کا قرآن میں سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''جس طرح، حضرت عیسیٰؑ، ایک انسان تھے، اسی طرح، ان کے والد، جنہیں زیر بحث آیت میں روحنا کہا گیا ہے، ایک انسان تھے، اور حضرت مریمؑ کے پاس آنے کے وقت، ایک تندرست انسان تھے۔''[2]

حالانکہ قرآن کریم نے کسی انسان کو بھی رُوْحَنَا کہنا، تو رہا ایک طرف، فقط روح تک نہیں کہا ہے، اور حضرت عیسیٰؑ، جن کی پیدائش، اس پہلو سے متنازعہ اور زیر بحث ہے، انہیں بھی قرآن کریم نے بن باپ پیدا ہونے کے بناء پر، روح منه کہا ہے، نہ کہ فقط روح۔ اب اسے ''قرآنی دلیل'' بنا کر پیش کرنا، تحریفِ آیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بعد ازیں، ''صاحبِ کتاب'' کی طرف سے، نحو کی ایک کتاب کے ذریعہ سے، جو سخن سازی کی گئی ہے،

---

[1] + [2] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۲

اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

''تَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کا معنیٰ سمجھانے کے لیے، ایک مثال بیان کی ہے، جو یہ ہے کہ جاء نی زید رجلا محسنا (زید میرے پاس اس حال میں آیا کہ وہ ایک احسان کرنے والا مرد تھا) یعنی زید پہلے بھی مرد تھا، اور جب میرے پاس آیا تو بھی مرد تھا، صرف اس فرق کے ساتھ، کہ وہ میرے پاس آیا تو وہ ایک احسان کرنے والا مرد تھا۔ اسی طرح وہ سعید (روح) جسے اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کے پاس بھیجا، پہلے بھی بشر تھا، جب مریمؑ کے پاس آیا تو وہ ایک تندرست بشر (انسان) تھا۔'' [1]

......''وہ (سعید) روح، جسے اللہ تعالیٰ نے مریمؑ کے پاس بھیجا، پہلے بھی بشر تھ'' ......اس کا ثبوت؟ حوالہ؟ کچھ نہیں، بس ''مستند ہے آپ کا فرمایا ہوا۔''

ہمارے پاس محولہ بالا کتاب نہیں ہے، اور نہ ہی ہمیں اس سیاق وسباق کا علم ہے جس میں یہ مثال بیان کی گئی ہے، لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ جَاءَ نِي زَيْدٌ رَجُلًا مُحْسِنًا کے جملہ میں ہر شخص جانتا ہے کہ زید، انسانی نام ہے، اور وہ اصلاً اور بالذات ایک بشر ہے، اس نے بشریت کا روپ نہیں دھارا ہے کہ وہ اصلاً کچھ اور ہو، مگر انسانی بھیس میں ظاہر ہوا ہو۔ لہٰذا، وہ اگر مردِ محسن کے طور پر آیا ہے، تو اس کا انسان اور بشر ہونا، احسان کنندہ ہونے یا نہ ہونے کی ہر دو صورتوں میں واضح ہے، لیکن تمثل لھا بشرا سویا کا تو معنی ہی یہ ہے کہ جس ''روح'' کو مریمؑ کی طرف بھیجا گیا ہے، وہ صحیح وسالم، انسانی شکل میں متشکل ہو کر آیا ہے، اور وہ اصلاً اور بالذات، انسان یا بشر نہیں ہے، اس نے صرف انسانی شکل وشباہت اختیار کی ہے، اور ایسا کرنے سے قبل، وہ (غیر انسان) فرشتہ ہی تھا۔

الغرض، تمثل لھا کے الفاظ کو نظر انداز کر کے، جَاءَ نِي زَيْدٌ ...... کے الفاظ کی آڑ لے کر، ''روح'' کو، انسان قرار دینا، بدترین تحریفِ آیت ہے۔

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۲

جہالت یا خیانت کا کرشمہ:

''صاحبِ کتاب''، آیت میں مذکور فرستادہ کے متعلق، یہ لکھتے ہیں:

''حافظ عنایت اللہ اثری، وزیر آبادی مرحوم، نے، جو جامع مسجد اہل حدیث گجرات میں خطیب تھے، اپنی کتاب ''عیونِ زمزم فی میلادِ عیسیٰ بن مریمؑ'' کے صفحہ ۲۰۳ پر، تفسیر کبیر اور تفسیر ابو سعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ فرستادہ یوسف نجار تھا۔'' [1]

حقیقت یہ ہے کہ اس فرستادہ کا ''یوسفِ نجار'' ہونا، نہ تو تفسیر کبیر ہی میں مذکور ہے، اور نہ ہی تفسیر ابی سعود میں۔ جو کچھ وہاں مذکور ہے، اُسے حافظ عنایت اللہ اثری نے، یا خود ''صاحبِ کتاب'' نے صحیح صورت میں پیش نہیں کیا۔ اس کی وجہ یا تو عربی زبان سے جہالت و بے خبری ہے، یا پھر دیدہ دانستہ تحریف ہے۔ ان دونوں تفاسیر میں ہرگز ہرگز یہ نہیں کہا گیا کہ...... ''یہ فرستادہ یوسف نجار تھا''...... بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ فرستادہ فرشتہ تھا، لیکن اسے یوسف نجار کی شکل و شباہت میں ارسال کیا گیا تھا۔ ملاحظہ فرمایئے، تفسیر الکبیر کا مندرجہ ذیل اقتباس:

(انما انا رسول ربك لا هب لك غلاماز كيا) ولا يليق ذالك الا بجبريل عليه السلام واختلفوا فى انه كيف ظهر لها (فالاول) انه ظهر لها على صورة شاب امرد حسن الوجه سوى الخلق (والثانى) انه ظهر لها على صورت ترب لها اسمه يوسف من خدم بيت المقدس وكل ذالك محتمل ولا دلالة فى اللفظ على التعيين ثم قال و انما تمثل لها فى سورة الانسان لتستانس بكلامه ولا تنفرعنه ولو ظهر لها فى صورة الملائكة لنفرت عنه ولم تقدر على استماع كلامه. [2]

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۴

[2] تفسیر الکبیر، جلد ، صفحہ ۱۹۶

''میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا عطا کروں۔'' یہ بات کہنا کسی کے لائق نہیں ماسوائے جبریل علیہ السلام کے۔ البتہ علماءِ تفسیر میں، اس امر میں اختلاف واقع ہوا ہے کہ جبریل، مریمؑ کے سامنے کس طرح ظاہر ہوا (اوّل) ایک گروہ کے نزدیک وہ فرشتہ، ایک نوجوان، بے ریش، خوبرو اور صحیح و متناسب قد و قامت میں مریمؑ کے ہاں نمودار ہوا۔ (ثانی) جبکہ دوسرے گروہ کے نزدیک، جبریل، مریمؑ کے پاس ایک ایسے ہم عمر کی شکل میں ظاہر ہوا، جس کا نام یوسف تھا، اور وہ بیت المقدس کے خدام میں سے تھا، اگرچہ الفاظ قرآنی میں دونوں کا احتمال ہے لیکن قرآنی عبارت میں کوئی ایسا لفظ نہیں جو کسی ایک احتمال کو متعین کرتا ہو۔ یہ قول بھی ہے کہ فرشتہ کو انسانی شکل میں اس لیے بھیجا گیا کہ مریمؑ، مانوس ہوکر، اس سے گفتگو کر سکے اور وہ بے زار نہ ہو، کیونکہ اگر فرستادہ، فرشتہ ہی کی شکل میں سامنے آتا، تو مریمؑ (ہوسکتا ہے کہ) اس سے بدک جاتی، اور اسے فرشتہ کی گفتگو سننے کا یارا نہ ہو پاتا۔

اس سے اندازہ لگا لیجئے کہ اصل بات کیا تھی، اور اسے اپنی بے علمی کے باعث یا بددیانتی کی بناء پر، کیا بنا کر پیش کیا گیا ہے، ٹھیک یہی بات، تفسیر ابی سعود میں بھی، تقریباً ان ہی الفاظ میں مذکور ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

فتمثل لها بشرا سويا سوى الخلق كامل البنيه لم يفقد من حسان نعوت الأدمية شيئا و قيل تمثل فى صورة ترب لها اسمه يوسف من خدم بيت المقدس و ذلك لتستانس بكلامه و فتلقى منه ما يلقى اليها من كلماته تعالٰى اذلو بَدَالَهَا على صورة الملكية لنفرت منه ولم تستطع مفاوضته۔ [1]

''فرشتہ، انسانی روپ میں آیا، جو ایسا مناسب بدن اور کامل ساخت رکھتا تھا

[1] تفسیر ابن سعود، جلد۳، صفحہ ۵۴۵

کہ اس میں انسانی خوبیوں میں سے کوئی خوبی بھی مفقود نہ تھی، اور یہ بھی کہا گیا کہ مریمؑ کے ہم عمر کے روپ میں آیا، اس کا نام یوسف تھا اور وہ خدام بیت المقدس میں سے تھا، تاکہ اس کے کلام سے مریمؑ مانوس ہو، اور کلماتِ خداوندی میں سے جو کچھ فرشتہ اسے القاء کرے وہ اسے پالے، کیونکہ اگر وہ فرشتہ ہی کی شکل میں ظاہر ہوتا، تو مریمؑ اس سے بدک جاتی، اور وہ باہمی گفتگو نہ کر پاتی۔

یہ ہے ''دانشورانِ قرآن'' کا علمی مسائل میں، معیارِ دیانت وامانت۔

آیت ۱۸:

قَالَتْ اِنِّیْۤ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِیًّا (مریمؑ ۱۸)

''مریم (یکا یک) بول اٹھی، ''اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے، تو میں تجھ سے رحمان کی پناہ مانگتی ہوں۔''

منکرینِ حدیث اور منکرینِ معجزات بیان کرتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کی خلوت گاہ میں آنے والا (جسے قرآن میں رُوْحَنا کہا گیا ہے)، انسانی صورت میں آنے والا کوئی فرشتہ نہ تھا، بلکہ مریم کا منگیتر یوسف تھا۔ قرآن کریم کے یہ ''دانشور''، ایسی بات، قرآن کی بنیاد پر نہیں کہتے ہیں، بلکہ بائیبل سے استفادہ کرتے ہوئے، اس طرح سخنسازی کرتے ہیں۔ حالانکہ حضرت مریمؑ کے یہ الفاظ کہ...... ''اگر تو کوئی خدا ترس آدمی ہے، تو ...... ''...... یہ ظاہر کرتے ہیں کہ ان کی خلوت گاہ میں گھس آنے والا، قطعی اجنبی تھا، جسے وہ اپنی تنہائی میں پاکر، گھبرا گئیں، اور اس سے مخاطب ہو کر یہ کہنے لگیں کہ ''اگر تُو کوئی خدا خوفی سے کام لینے والا آدمی ہے، تو میں تجھے خدا ہی کا واسطہ دے کر کہتی ہوں کہ تیرا یہاں کیا کام؟''

گھبراہٹ میں یہ اندازِ کلام بالکل ایسا ہی ہے جیسے ہر شریف اور پاکدامن خاتون، کسی اجنبی فرد کو، اپنی خلوت میں آتے دیکھ کر، قدرتاً اور ارتجالاً کہہ دیتی ہے۔ وہ کون سی عورت ہے جو اپنے منگیتر کو نہیں جانتی، یا اسے جانتے ہوئے، یوں دیدہ دانستہ مخاطب ہوتی ہے جیسے کسی اجنبی سے ایسے موقع پر فطرتاً مخاطب ہوا جاتا ہے؟

آیت ۱۹:

قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا (مریم ۱۹)

''اس (روح) نے کہا ''میں تو بس تمہارے پروردگار کا ایک ایلچی ہوں، تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ لڑکا دوں۔''

یہ وہ آیت ہے، جس کے مفہوم کی تغییر و تحریف کے لیے، ''صاحبِ کتاب'' کے قلم کی جولانیاں، قابلِ دید ہیں۔ وہ، قرآنی الفاظ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا کی تردید، بلکہ تغلیط کے لیے، فرماتے ہیں:

''اگر فرشتہ نے بچہ دیا، تو پھر وہ حضرت عیسیٰ کا باپ کیوں نہیں؟ کیا یہ کام، اس فرشتہ نے بغیر نکاح کے کیا تھا، اس لیے حضرت عیسیٰ بے باپ کے پیدا ہوئے۔'' [1]

یقیناً قرآن کے الفاظ یہی ہیں کہ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا یہ فی الواقع کلامِ خداوندی ہے، جو اللہ ہی کے ایماء پر فرشتہ کی زبان سے اسی طرح جاری ہوا ہے، جس طرح پورا قرآن، کلام اللہ ہونے کی حیثیت سے، جبریل کی زبان سے برآمد ہوا ہے، اسی لیے قرآن، اسے قولِ رسولِ ملک بھی کہتا ہے (انه لقول رسول کریم) یہاں زیرِ بحث آیت میں لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا کا کلامِ خداوندی، اس بشارت کی حیثیت سے بیان ہوا ہے، جو قولِ فرشتہ بنکر صادر ہوا ہے، لیکن اگر ''صاحبِ کتاب''، ''لڑکا عطا کرنے'' اور ''لڑکے کو جنم دینے'' میں جو فرق ہے، اُسے سمجھنے سے قاصر ہوں، تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔ موصوفِ محترم کی، یہ بے جا سخن سازی، محض اس لیے ہے کہ وہ ''فرزند عطا کرنے'' اور ''فرزند کو جنم دینے'' میں جو باہمی فرق پایا جاتا ہے، اسے یا تو وہ سمجھتے ہی نہیں ہیں، یا پھر وہ، دیدہ دانستہ، محض اپنے ذوقِ تحریف کی خاطر، ایسی سخن سازی فرمارہے ہیں۔

پھر موصوف کے یہ الفاظ کہ...... ''اگر فرشتہ نے جنم دیا تھا، تو پھر وہ حضرت عیسیٰ کا باپ

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۳

کیوں نہیں؟''...... یہ ظاہر کرتے ہیں کہ لِاَھَبَ کے معنٰی، ان کے نزدیک لِاَلِدَ ہے۔ اگر واقعی، وہ یہی سمجھتے ہیں تو پھر، تو اللہ تعالیٰ کو بھی، یَھَبُ لِمَن یَّشَآءُ اِنَاثًا وَّیَھَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّکُوْرَ، کی رو سے جملہ اناث وذکور کا باپ قرار دینا پڑے گا، چاہے وہ کتنی ہی قوت اور تاکید کے ساتھ یہ کہتا رہے کہ لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ.

یہ تحریفی سرگرمیاں، صاف ظاہر کرتی ہیں کہ ان لوگوں کا مقصد، قرآن کے نام پر، قرآن ہی کا تیاپانچہ کرنا ہے۔

اقتباسِ بالا کو جاری رکھتے ہوئے، ''صاحبِ کتاب'' فرماتے ہیں:

''حالانکہ بچہ، ماں باپ کے نکاح کے بغیر پیدا ہو، وہ حلال زادہ نہ سہی، مگر اس کا باپ بھی ہوتا ہے اور ماں بھی۔ کیا وہ فرشتہ، اللہ تعالیٰ نے، نعوذ باللہ، اس کام کے لیے بھیجا تھا، اور اسی لیے اس نے انسان کا روپ دھارا تھا۔'' [۱]

یہ تحریر، دوسروں کے موقف کو، جاننے بوجھنے کے بعد، اسے نظر انداز کر کے، اپنی ہی ہانکے چلے جانے کی عادت کا کرشمہ ہے۔

کسی بچہ کے پیدا ہونے کی چار ممکن صورتیں ہیں:

(۱)...... دائرۂ نکاح میں صحیح وسالم میاں بیوی میں جنسی عمل کے نتیجہ میں بچہ متولد ہو۔

(۲)...... دائرۂ نکاح سے باہر، فعلِ زنا کے نتیجہ میں بچہ پیدا ہو۔

(۳)...... دائرۂ نکاح میں، میاں بیوی کے ہاں، اس کے باوجود بچہ پیدا ہو کہ زوجین میں موانعاتِ پیدائش موجود ہوں۔

(۴)...... بلامسِ بشر، کسی خاتون کے معجزانہ طور پر حاملہ قرار پا جانے سے بچہ پیدا ہو۔

پہلی دو صورتیں، چونکہ منکرینِ معجزات اور قائلینِ معجزات کے درمیان متفق علیہ ہیں، لہٰذا وہ خارج از بحث ہیں۔

تیسری اور چوتھی صورت معجزات سے تعلق رکھتی ہیں۔ حضرت یحییٰؑ کی پیدائش میں

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۳

تیسری صورت اور حضرت عیسیٰؑ کی ولادت میں چوتھی صورت، پائی جاتی ہے۔ یہ دونوں (آخری) صورتیں، منکرینِ معجزات کے لیے، سوہانِ روح اور وجہِ پریشانی ہیں۔ اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ جس طرح بھی ممکن ہوں، ان کے انکار کی راہ ہموار کی جائے۔ یہ تحریفی چالبازیاں، صرف اسی مقصد کے پیشِ نظر ہیں۔

اب رہا ''صاحبِ کتاب'' کا یہ کہنا کہ...... ''وہ فرشتہ، اللہ تعالیٰ نے، نعوذ باللہ، اس کام کے لیے بھیجا تھا، اور اسی لیے اس نے انسان کا روپ دھارا تھا؟''......تو ہمارا جواب، از روئے قرآن یہی ہے کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے فرشتہ کو بھیجا تا کہ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا کے الفاظ میں نہ صرف یہ کہ اُسے خوشخبری سنائے، بلکہ وہ اس طرح انسانی روپ میں مریمؑ کے سامنے نمودار ہو کہ وہ خاتون، اس سے مکالمہ بھی کر سکے، اور ساتھ ہی بلا مسِ بشر، معجزانہ طور، وہ حاملہ قرار پائے۔ یقین نہ آئے، تو جناب پرویز صاحب ہی کا یہ ترجمۂ آیت ملاحظہ فرمائیے، جس میں، رُوْحَنَا سے مراد، خود انہوں نے فرشتہ ہی لیا تھا۔

> ''پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا، پھر ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا، اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا۔''[1]

سائنس اور بن باپ ولادت:

منکرین معجزات کے لٹریچر کا مطالعہ، اس حقیقت کو بے نقاب کر دیتا ہے کہ یہ لوگ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ، ولادت کا انکار، صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ان کے نزدیک، مرد و زن کے جنسی اختلاط کے بغیر، کسی عورت کا حاملہ ہونا، ناممکن بلکہ امر محال ہے، حالانکہ جس چیز کو یہ لوگ، قطعی ناممکن سمجھتے ہیں، آج کے دور میں، وہ چیز، اب اُسی علم (سائنس) کی رو سے ممکنات کے دائرہ میں آنی شروع ہو گئی ہے، جس کے بل بوتے پر، بغیر مسِ بشر، عورت میں وقوعِ حمل کا انکار کیا جاتا ہے۔ دورِ حاضر کے یہ وہ تعلیم یافتہ لوگ ہیں، جو مغربی نظریات کا دودھ پی پی کر پلے بڑھے ہیں، اور جو اپنی سائنس گزیدگی کے

[1] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۴۹۱

باعث، ایسی فکری اسیری اور ذہنی غلامی کا شکار ہو چکے ہیں کہ اب حیاتیاتی قوانین، ان کے نزدیک، ایسے اٹل ہیں کہ خود خدائے قدوس کی ذات بھی، ان قوانین کے سامنے، اُنہیں، بے بس، لاچار اور عاجز نظر آتی ہے۔

عصرِ حاضر میں، The Bible, The Qur'an, And Science نامی کتاب کا مصنف Maurice Bucaille، لکھتا ہے:

"The formation of Jesus in the maternal uterus occured in cicrumstances, which lay outside the laws of nature, common to all human beings. The ovule, produced by the mother's ovary, did not need to join with a spermatozoon, which should have come from his father to form the embryo, and hence a viable infant." ۱

”رحم مادر میں، یسوع کی وجود پذیری، ایسے حالات میں ہوئی، جو اُن قوانینِ فطرت کی حدود سے خارج ہیں جو تمام انسانوں کے لیے عام اور مشترک ہیں، ماں کے بیضہ دان میں پیدا ہونے والے بیضہ کو مرد کے مادہ منویہ سے ملاپ کی حاجت نہ ہوئی، جسے باپ کی طرف سے، اس لیے آنا چاہئے تھا کہ وہ جنین کی تشکیل کرتا، اور پھر زندہ بچہ بن جاتا۔

قدرے اور آگے چل کر، یہی مصنف، اپنی اسی کتاب میں لکھتا ہے:

"Mary was a virgin mother. She preserved her virginity and did not have any children apart from Jesus. Jesus is a biological exception." ۲

۱ The bible, the Quran and Science, Published by Alfalah Islamic Books, 7th Edition, Page 95

۲ The bible, the Quran and Science, Published by Alfalah Islamic Books, 7th Edition, Page 96

''مریم، کنواری ماں تھی، اس نے اپنے کنوار پن کو محفوظ و برقرار رکھا، اور یسوع کے علاوہ، اُس کے ہاں کوئی اور بچہ پیدا نہ ہوا، یسوع کا وجود، ایک حیاتیاتی استثناء ہے۔''

ولادتِ مسیح علیہ السلام کی توجیہ میں، یہی مصنف، جدید سائنس کی روشنی میں، جو کچھ کہتا ہے، وہ، اُن منکرینِ معجزات کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے، جنہیں سائنس کا ہیضہ لاحق ہو چکا ہے، اور وہ سائنسی بنیاد پر ہی یہ عقیدہ اپنائے بیٹھے ہیں کہ بغیر جنسی اختلاط کے نہ حمل قرار پا سکتا ہے، اور نہ ہی بچہ پیدا ہو سکتا ہے

"The plenomenon of the birth of a normal individual, without fertilizing action of the male, is called Parthenogenesis. In the animal kingdom, parthenogenesis can be observed under certain conditions. This is true for various insects, certain inverteberates and, very occasionally, a select breed of bird. By way of experiment, it has been possible, for example, in certain mammals (female rabbits), to obtain the beginnings of a development of the ovule into a embryo at an extremely redimantary stage without any intervention of spermatozoon." ؎

''ایک عام فرد کی پیدائش کا ایسا فطری مظہر، جو نر کے عملِ بار آوری کے بغیر واقع ہو، Parthenogenesis کہلاتا ہے، عالمِ حیوانات میں، بعض شرائط کے تحت، ایسے فطری مظہر کو دیکھا جا سکتا ہے، اور مختلف حشرات میں، اور کچھ ایسے جانوروں میں جن میں ریڑھ کی ہڈی نہیں ہوتی، اور گاہے گاہے پرندوں کی ایک خاص منتخب نسل میں، ایسے مظہرِ فطرت کا پایا جانا، امرِ حق ہے، تجرباتی طریقوں میں بھی اسے ممکن پایا گیا ہے، مثال کے طور پر کچھ دودھیل جانوروں میں (مادہ خرگوشوں میں) اس کا امکان ہے کہ اپنی انتہائی ابتدائی سطح پر، بغیر مادۂ

؎ The Bible, The Quran And Science, Page 96

منویہ کے، بیضۂ مادہ میں، آغازِ تشکیلِ جنین کی حالت کو حاصل کیا جا سکے۔"

اقتباسِ بالا میں، علم الحیات (Biology) کی ایک اصطلاح Parthenogenesis استعمال ہوئی ہے، جسے بغیر ترجمہ، جوں کا توں انگریزی میں لکھ دیا گیا ہے، اگرچہ اس کا مفہوم، ترجمۂ اقتباس سے واضح ہو جاتا ہے، لیکن پھر بھی توضیحِ مزید کی خاطر، لغت کی یہ عبارت پیشِ خدمت ہے۔

"PARTHENOGENESIS - Reproduction of organisms without conjuction of gametes of opposite sexes" ۱

"جانداروں کا، جنسِ مخالف کے مادۂ تولید کے تلازم کے بغیر، از سرِ نو پیدا ہونا۔"

اگرچہ اب تک مکمل Parthenogenesis کی کوئی مثال، خواہ وہ تجرباتی ہو یا فطری، معلوم نہیں ہو سکی، لیکن، بہرحال، انسان کی اب تک کی معلومات کا ذخیرہ، اُن معلومات کے مقابلہ میں انتہائی مختصر اور قلیل ہے، جو ابھی تک اس کی رسائی سے باہر ہیں۔ عین ممکن ہے کہ اس مظہرِ فطرت کی کوئی مکمل مثال، اس لامتناہی کائنات کے کسی گوشے میں موجود ہو، اور مستقبل میں، وہ، انسان کے علم و ادراک میں آ جائے، تاہم اگر ایسا نہ بھی ہو سکے تو اس کا لازماً یہی معنٰی نہیں ہے کہ وہ مثال، اپنا وجود ہی نہیں رکھتی، کیونکہ کسی چیز کا عدمِ علم، اُس چیز کے عدمِ وجود کو مستلزم نہیں ہوتا۔

ہمارے ملک میں پائے جانے والے مغرب کے اندھے مقلدین کی کورانہ تقلید کا یہ عالم ہے کہ وہ آنکھیں بند کیے، اُسی پامال راستے پر چلتے رہیں گے، جسے مغرب، اپنی جدید تحقیقات کی روشنی میں غلط پا کر ترک کر چکا ہے۔ اسی ولادتِ مسیح کے مسئلہ میں دیکھ لیجئے کہ علم جدید کی روشنی میں، اہل مغرب کے ہاں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ ولادت کے عقیدہ کو تسلیم کرنے کا رجحان شروع ہو چکا ہے، لیکن ہمارے ہاں کے اندھے مقلدین

۱ The American Heritage Dictionary of the English language, Page 995

مغرب، مَا كَانُوا لِيُؤْمِنُوا بِمَا كَذَّبُوا بِهٖ مِنْ قَبْلُ کے مصداق بنے رہنے پر مصر ہیں، اور جس گمراہی کی کھڈ میں وہ خود گرا چاہتے ہیں، قرآن کو بھی اپنے ساتھ لیے گرنے پر بضد ہیں۔

مریم کے پاس آنے والے نے، خود کو، رسولِ خدا کہا ہے۔ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ . اور از روئے قرآن رسول، یا تو، ''الناس'' میں سے ہوتا ہے، یا پھر ''فرشتوں'' میں سے۔ (اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ). اگر یہ آنے والا (بقول ''مصنفِ کتاب'') یوسف ہی تھا، جو واقعی رسول تھا تو یقیناً وہ یہ کہنے میں حق بجانب تھا کہ میں تیرے رب کی طرف سے رسول ہوں، لیکن اس کی رسالت کا اقرار، نہ تو انجیل کرتی ہے اور نہ قرآن۔ نہ پرویز صاحب کرتے ہیں، اور نہ ہمارے ''تنقید نگار'' صاحب۔ نہ عنایت اللہ اثری کرتے ہیں، اور نہ کوئی اور منکرِ معجزات۔ جب ایسا ہے، تو لامحالہ وہ فرشتہ ہی ہے، جو انسانی روپ میں آیا ہے۔

آیت ۲۰:

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا

(مریمؑ ۲۰)

''وہ (مریمؑ) بولی ''میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا درآنحالانکہ نہ مجھے کسی بشر نے چھوا ہے اور نہ میں بدچلن ہی ہوں۔''

فحوائے کلام اور اسلوب بیان، یہ واضح کر رہا ہے کہ رُوْحَنَا سے مراد، فرشتہ ہے، جسے اچانک اور دفعتاً اپنی خلوت میں پانا، ایک حادثہ تھا، اس حادثہ کا جو اثر، مریمؑ پر، اُس وقت جبکہ وہ فرشتہ اور ہاتف وغیرہ سے ناآشنا تھیں، پڑا ہوگا، اس کا اندازہ کرنا کچھ آسان نہیں ہے، لیکن اس نازک موقع پر بھی، حضرت مریمؑ نے جس کردار کا مظاہرہ کیا، وہ بے مثال ہے، انہوں نے ایک انتہائی پاکباز اور عفت مآب خاتون کی طرح، اپنی خلوت میں آنے والی ذات کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر تمہارے اندر کچھ بھی خدا ترسی ہے، تو

تمہارا یہاں کیا کام؟ میں تمہارے شر سے بچنے کے لیے خود کو خدائے رحمٰن کی پناہ میں دیتی ہوں۔ فرشتہ نے جواباً کہا کہ جس خدائے رحمان کے واسطہ سے آپ طالبِ پناہ ہیں، میں اُسی کا بھیجا ہوا آپ کے پاس آیا ہوں تا کہ آپ کو پاکیزہ خصلت فرزند عطا کروں۔ حضرت مریمؑ، فرشتہ کی یہ بات سُن کا ہکا بکا رہ گئیں، اور استفسار فرمایا ''میرے ہاں لڑکا کس طرح پیدا ہوگا، جب کہ مجھے تو کسی انسان نے ہاتھ تک نہیں لگایا، اور نہ میں کوئی بدکار و بدچلن عورت ہوں؟

لفظ ''بَغِیًّا'' اور ''مصنفِ کتاب'':

قولِ مریمؑ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا میں مذکور لفظ بَغِیًّا، عربی زبان میں بدکار و بدچلن اور زنا کار کے علاوہ، کسی اور معنٰی میں استعمال ہی نہیں ہوتا، لیکن ''مصنفِ کتاب''، پرویز صاحب کی اندھی تقلید کا دم بھرتے ہوئے، اُنہی کا بیان کردہ غلط معنی اختیار کرتے ہیں اور ساتھ ہی، عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مصداق، یہ سوال بھی اٹھا دیتے ہیں کہ:

> ''یہ صحیح ہے کہ بغیّ کا معنی بدکار عورت ہے، مگر کیا بدکار عورت معاشرہ میں سرکشی کی مرتکب نہیں ہوتی۔'' [1]

جناب ''مصنفِ کتاب'' کا یہ اعتراف کہ...... ''یہ صحیح ہے کہ بغیّ کا معنی بدکار عورت ہے......'' ایک ادھوری حقیقت ہے، جبکہ پوری اور مکمل حقیقت صرف یہ ہے کہ'' بغیّ کا معنی ہی بدکار عورت ہے۔'' اور حضرت مریمؑ نے، بدکاری و بدچلنی کے اسی جرم کی اپنی ذات سے نفی کی ہے، سرکشی و سرتابی جیسے کسی جرم کا ذکر تک نہیں کیا، لہٰذا یہاں یہ سوال اٹھا دینا کہ ''کیا بدکار عوت، معاشرہ میں سرکشی کی مرتکب نہیں ہوتی؟'' محض اس لیے ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب، جو معنوی تحریف کر چکے ہیں، امانت و دیانت کو بالائے طاق رکھ کر، تائیدِ باطل کے ذریعہ، اسے سہارا دیا جائے۔

چکمہ بازی، مغالطہ آفرینی اور فریب دہی، منکرین حدیث کی عام عادت ہے، یہ لوگ،

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۳

اپنے ذہنی معتقدات اور قلبی نظریات کی حمایت و پاسداری کی خاطر، جن جرائم کو (یا ان کی سزاؤں کو) نہیں ماننا چاہتے، ان کے بارے میں، یا تو معنوی تحریف کی روش اپناتے ہیں (اور بات کو اصل ٹھکانے پر نہیں رہنے دیتے)، یا پھر اُن جرائم کے ساتھ، کسی اور جرم کو نتھی کر ڈالتے ہیں، اور سزا کی وجہ علت، اپنے اس (الحاق شدہ) جرم کو قرار دیتے ہیں۔ قتل مرتد کی عقوبت کا ذکر ہو، تو یہ لوگ، اس کے ساتھ، ''بغاوت'' کا جرم نتھی کر دیتے ہیں اور پھر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ عہد نبوی یا خلافتِ راشدہ میں، جو سزا دی گئی ہے، وہ جرمِ ارتداد کی نہیں، بلکہ ''جرمِ بغاوت'' کی سزا ہے۔ اور اگر زناکاری و بدکاری کا ذکر ہو، تو اس کے ساتھ ''سرکشی'' کو نتھی کر کے، یہ سوال اٹھا دیتے ہیں، کہ ''کیا بدکار عورت، معاشرہ میں سرکشی کی مرتکب نہیں ہوتی؟''۔ اب ان ''دانشورانِ قرآن'' کو کون سمجھائے کہ چھوٹے سے چھوٹے اور خفیف ترین گناہ سے لیکر، انتہائی بڑے اور ہلاکت خیز گناہوں میں سے ہر ایک گناہ سرکشی ہے، لیکن بَغِيًّا کے لفظ میں صرف وہ گناہ مراد ہے جو بدکاری و زناکاری کہلاتا ہے، اس کے علاوہ کسی اور جرم و گناہ پر، اس لفظ کا اطلاق ہوتا ہی نہیں ہے۔ اور زیر بحث، اس لفظ کی معنوی تحریف، صرف اس لیے کی جا رہی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ ولادت کو تسلیم کرنے کے ''خطرہ'' سے بچا جائے، اور حضرت مریمؑ کے خلاف اٹھنے والے طوفانِ طعن و تشنیع کی علت، اس بات کو قرار دیا جائے کہ انہوں نے قوانینِ ہیکل سے ''سرکشی'' کی تھی۔

آیت ۲۱:

قَالَ كَذَٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهُۥٓ ءَايَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ أَمْرًا مَّقْضِيًّا (مریمؑ ۲۱)

''اس (فرشتہ) نے کہا ''یونہی ہوگا، تیرے رب کا ارشاد ہے کہ یہ میرے لیے آسان ہے اور ہم یہ اس لیے کریں گے کہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی، اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں، اور یہ ایک طے شدہ امر ہے۔''

كَذَالِكِ (یوں ہی ہوگا) کا صاف مطلب یہ ہے کہ ہونے والا بچہ، اسی حال میں ہوگا کہ نہ تو مریمؑ کو کسی مرد نے چھوا ہوگا، اور نہ ہی وہ کسی بدکاری کی مرتکب ہوگی۔ یوں ہی، بغیر مسِ بشر، مریمؑ کو حاملہ کر دینا اور اسے بیٹا عطا کر دینا، ربِّ مریمؑ کے نزدیک کوئی مشکل بات نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ، یہ آزمائش، مریمؑ پر اس لیے ڈالنا چاہتا ہے کہ اس پیدائش کو لوگوں کے لیے ایک نشانی اور اپنی طرف سے ایک رحمت بنا دے، اور ایسا ہو کر رہے گا، کیونکہ یہ اللہ کا ایک طے کردہ فیصلہ ہے۔

منکرینِ معجزات کی تحریفات:

منکرین حدیث نے، اس واضح اور بیّن حقیقت کو (کہ اللہ تعالیٰ نے یُوں ہی ''كَذَالِكِ'' بغیر مسِ بشر، حضرت مریمؑ کو حاملہ کر دیا) نشانۂ تردید و تغلیط بنانے کے لیے، تاویلات کے پردہ میں، جو تحریفات کی ہیں، وہ پرویز صاحب کے مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہیں:

''اس نے کہا میں نے جو کچھ کہا ہے وہ قانون تخلیق کے مطابق ہوگا (۳/۴۶)۔ یہ اس کے نزدیک کچھ بھی مشکل نہیں (کہ جو موانعات تیرے ذہن میں ہیں، اور تمہیں اس طرح پریشان کر رہے ہیں، انہیں دور کر دے۔ ۱۹/۹) خدا نے یہ بھی کہا کہ وہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہوگا، وہ ہماری طرف سے لوگوں کے لیے موجب رحمت اور حق و باطل کے پرکھنے کی نشانی ہوگا (جو شخص، اس کی نبوت پر ایمان لائے گا، وہ حق پر سمجھا جائے گا، اور جو اس سے انکار کرے گا، وہ باطل پر ہوگا، اور یہ بات طے شدہ ہے (کہ وہ ہمارا پیغمبر بنے گا۔ ۳/۴۷)۔'' [1]

اس اقتباس میں ''مفکر قرآن'' صاحب نے، کلامِ خداوندی کو، اصل مفہوم سے پھیر دینے کے لیے، چار تحریفات سے کام لیا ہے۔

---

[1] مفہوم القرآن، جلد۲، صفحہ ۶۸۹

پہلی تحریف اور اس کا جائزہ:

سب سے پہلی تحریف، کَذٰلِکِ کے مفہوم میں کی گئی ہے۔ قرآن کریم میں، یہ لفظ، جس سیاق و سباق میں آیا ہے، اس میں، اس کا مفہوم، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ، حضرت مریمؑ کو، بغیر اس کے کہ کسی مَرد بشر نے اُسے چھوا ہو، بیٹا عطا کرے گا۔ لیکن ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، کَذٰلِکِ کا معنیٰ، حضرت مریمؑ کو ''قانون تخلیق'' کی رو سے بیٹا عطا کرنا ہے، نہ کہ بغیر مسِّ بشر کے۔

چونکہ عادتاً اور معمولاً، ایک بچہ، مرد و زن کے ملاپ کا نتیجہ ہوتا ہے، اس لیے پرویز صاحب، اسے ''خدا کا قانونِ تخلیق'' قرار دیتے ہوئے، اور پھر اسے، وُہ ''سنت اللہ'' قرار دیتے ہیں، جسے قرآن کریم، اٹل اور غیر متبدل قرار دیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کریم نے بچے کی اس طرح پیدائش کو نہ تو ''خدائی قانون تخلیق'' قرار دیا ہے، اور نہ ہی اسے ''سنت اللہ'' کہا ہے۔

اب رہا سورۃ الحجرات کی آیت ۱۳ سے استدلال، جس کا ترجمہ یوں کیا جاتا ہے کہ...... ''اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے''...... تو اس میں جس مرد اور عورت سے پیدا کیے جانے کا ذکر ہے، اس سے مراد آدم و حوا ہیں، جن سے پہلے شعوب و قبائل کا وجود تک نہ تھا، یہ سب شعوب و قبائل، اسی انسانی جوڑے کے بعد، ان ہی کی ذریت پر مشتمل ہیں، اور پھر آیت میں، جن ''النَّاس'' سے خطاب کیا جا رہا ہے، وہ سب اسی اولین جوڑے کی اولاد ہیں۔ اس آیت کو فرداً فرداً، ہر انسان کے لیے، بلا استثناء ''قانون تخلیق'' قرار دینا، ایک بیجا بات ہے۔ اسے بیش از بیش، معمول کا ایک عادی امر تو قرار دیا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہ، یہ ایک ''خدا کا اپنا قرارداده قانونِ تخلیق'' ہے، ہرگز درست نہیں ہے۔

دوسری تحریف اور اس کا جائزہ:

''مفکر قرآن'' کی دوسری تحریف قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے حوالہ سے ہے،

جس کا مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ ''مریمؑ کے نکاح کے راستہ میں حائل موانعات کو دور کرنا، اللہ کے لیے مشکل نہیں ہے۔'' یہ تحریف، صرف اس لیے کی گئی ہے کہ ذہنِ پرویز، عادی اسبابِ ولادت کے بغیر، کسی کے پیدا ہونے کو باور نہیں کرتا، خواہ یہ پیدا کرنے والا، خود خدائے قادرِ مطلق ہی کیوں نہ ہو۔ حالانکہ خدا تو کہتے ہی اُس ہستی کو ہیں، جو سارے اسباب سے بالاتر ہے، اور وہ خود مسبب الاسباب ہے، سلسلۂ اسباب کا خالق و فاطر، وہ خود ہے۔ اسباب، اللہ تعالیٰ کے غلام و محکوم ہیں، وہ خود اسباب کا اسیر و پابند نہیں ہے۔ اب اگر ''مفکرِ قرآن'' اور ان کی تقلید میں، جملہ منکرینِ معجزات، اگر کسی بالا و برتر ہستی کو محکوم و پابند کرنا ہی چاہتے ہیں، تو وہ، اور جو کچھ بھی ہو، بہر حال خدا نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کسی خدا پرست کی طرف سے، کسی خدائی فعل کا اس بناء پر انکار کرنا کہ وہ خارقِ عادت امر ہے، کوئی عقلمندی اور روشن خیالی نہیں، بلکہ انتہا درجے کی بے عقلی اور تاریک خیالی ہے۔

ہر وہ شخص، جو پیشگی اعتقادات کو، اپنے دل و دماغ میں راسخ کیے بغیر، قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کا مفہوم، قرآنی سیاق و سباق میں جاننے کا خواہاں ہو، وہ ان الفاظ کا مطلب یہی سمجھے گا کہ ''حضرت مریمؑ کو، بغیر مَسِّ بشر، فرزند عطا کرنا، اللہ تعالیٰ کے لیے کوئی مشکل کام نہیں ہے۔ حتیٰ کہ خود پرویز صاحب بھی، جب تک ان کا دماغ، نظریۂ انکارِ معجزات سے متاثر نہیں ہوا تھا، اپنے سیدھے سادے ترجمۂ آیت میں، یہی (صحیح) مفہوم پایا کرتے تھے۔ ملاحظہ فرمائیے، پوری آیت کے ترجمہ پر مشتمل یہ اقتباس:

> ''فرشتہ نے کہا'' ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرما دیا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اسے لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دوں، اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو۔ اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا۔'' [۱]

لیکن جب انہوں نے انکارِ معجزات کے مسلک کو اپنایا، تو ان ہی آیات کا (ترجمہ

۱۔ معارف القرآن، ج ۳، صفحہ ۴۹۲

کرنے کی بجائے) الفاظ کی بھرمار کے ساتھ، ایسا طویل و عریض ''مفہوم'' پیش کیا، جس میں حقیقت کا سراغ ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

تیسری تحریف اور اس کا جائزہ:

تیسری تحریف، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نشانی بنائے جانے سے متعلق ہے، ''مفکر قرآن'' کے نزدیک، اُن کا نشانی بنایا جانا، بایں معنیٰ ہے کہ وہ حق و باطل کی نشانی تھے، یعنی ان پر ایمان لانے والا، برسر حق، اور ان کا منکر، برسر باطل قرار پاتا ہے۔ حالانکہ اس معنیٰ کے لحاظ سے، حضرت عیسیٰؑ کی یہ کوئی خصوصیت ہے ہی نہیں، کیونکہ اس اعتبار سے تو جملہ انبیاء و رسل، اپنے اپنے عصر و مصر میں، نشانی تھے، پھر آخر اس میں حضرت مسیحؑ کا امتیاز کیا؟

امر واقعہ یہ ہے کہ نشانی ہونا کثیر الجہت ہے۔ وَلِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ کا مفہوم، مولانا عبدالماجد دریا آبادی، بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

> ''تا کہ ہم لوگوں کے لیے ایک نشان بنا دیں اپنی قوت و قدرت کا۔ اور یہ دکھا دیں کہ ہم تخلیق کائنات پر ہر طرح قادر ہیں، بہ توسطِ اسباب عادیہ بھی، اور بلا توسطِ اسباب عادیہ بھی۔ اے علامة لبنی اسرائیل ولد بلا اب''[1]

مولانا امین احسن اصلاحی صاحب، فرماتے ہیں:

> ''حضرت عیسیٰؑ کا ایک نشانی ہونا، قرآن میں جگہ جگہ مذکور ہے، ملاحظہ ہو سورۃ الانبیاء، آیت ۹۱، اور سورہ مومنون آیت ۵۰۔ ہمارے نزدیک حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت، قیامت کی بہت بڑی نشانی ہے۔ نادانوں کو قیامت پر سب سے بڑا شبہ یہی تو ہوتا ہے کہ آخر، اسباب کے بغیر لوگ کس طرح دوبارہ پیدا ہو جائیں گے، حضرت عیسیٰؑ کا وجود، اس شبہ کا جواب ہے کہ ہر چیز، اللہ کے کلمہ کُن سے ظہور میں آتی ہے، حضرت عیسیٰؑ اسی کلمہ سے وجود میں آئے ہیں، چنانچہ اسی بنیاد پر، ان کو انجیل اور قرآن، دونوں میں کلمۃ اللہ کہا

---

[1] تفسیر ماجدی، اردو، صفحہ ۶۲۶ (حاشیہ ۲۹)

گیا ہے۔'' [1]

اس اقتباس میں، مولانا اصلاحی صاحب نے جن آیات کا حوالہ دیا ہے، ان کے الفاظ بھی ملاحظہ فرمائیے:

(١) وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبیاء — ٩١)

''اور ہم نے اسے (مریمؑ کو) اور اس کے بیٹے کو، دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔''

(٢) وَجَعَلْنَا ابْنَ مَرْيَمَ وَ اُمَّهٗٓ اٰيَةً (مومنون — ٥٠)

''ہم نے ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو ایک نشان بنایا۔''

اس سے قبل کہ، ان دونوں آیات کے اصل مفہوم و مراد پر روشنی ڈالی جائے، ایک نظر اُس مفہوم پر بھی ڈال لیجئے، جسے پرویز صاحب نے پیش کیا ہے، وہ سورۃ الانبیاء، آیت ٩١ کے مندرجہ بالا الفاظ کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

''وہ دونوں اقوام عالم کے لیے اس بات کی نشانی تھے کہ احکام خداوندی اور انسانوں کی خودساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے (یہودیوں کی خودساختہ شریعت نے انہیں معاذ اللہ، مردود و ملعون قرار دیا، اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب و مقبول ٹھہرایا۔'' [2]

یاد رکھیے کہ الفاظ کا یہ کباڑ خانہ وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ کے چند الفاظ کا معنی و مفہوم ہے، اب انہی الفاظ کا، پرویز صاحب ہی کے قلم سے، یہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

''اور اُسے اور اُس کے بیٹے (مسیح) کو تمام دنیا کے لیے (سچائی کی) ایک نشانی بنا دیا۔'' [3]

بین القوسین، خودساختہ اضافۂ الفاظ (سچائی کی) کے بغیر بھی، بقیہ عبارت، صحیح ترجمہ

---

[1] تدبر القرآن، جلد۴، صفحہ ۱۴۵ [2] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۸

[3] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۴۹۳

ہے۔ لیکن پہلی عبارت کو، جس میں دل کھول کر، الفاظ کی فضول خرچی سے کام لیا گیا ہے، دوسری عبارت کے ساتھ ملا کر دیکھا جائے، تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ''مفکرِ قرآن'' کے قرآنی مفاہیم، وقت کی آندھیوں کے ساتھ، کس طرح مرغ بادنما کی طرح بدل جایا کرتے تھے۔ یہی سلوک، سورۃ المومنون کی آیت ۵۰ کے ساتھ، ''مفکرِ قرآن'' صاحب کرتے رہے ہیں۔ اب ان دونوں آیات میں فی الواقعہ جو حقیقت مذکور ہے، اُسے مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے:

''یہ نہیں فرمایا کہ ایک نشانی ابن مریمؑ تھے اور ایک نشانی خود مریمؑ۔ اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ ابن مریمؑ اور اس کی ماں کو دو نشانیاں بنایا، بلکہ فرمایا ہے کہ وہ دونوں مل کر ایک نشانی بنائے گئے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ باپ کے بغیر، ابنِ مریمؑ کا پیدا ہونا، اور مرد کی صحبت کے بغیر، مریمؑ کا حاملہ ہونا ہی وہ چیز ہے جو ان دونوں کو ایک نشانی بناتی ہے، جو لوگ، حضرت عیسیٰؑ کی پیدائشِ بے پدر کے منکر ہیں، وہ ماں اور بیٹے کے ایک نشانی ہونے کی کیا توجیہ کریں گے۔'' [۱]

''مفکرِ قرآن'' صاحب، اپنی پچاس سالہ ''قرآنی خدمات'' کا ڈھنڈورا، اس غرورِ علم کے ساتھ پیٹا کرتے تھے کہ اِس دنیا میں صرف اور صرف وہی اَعْلَمُ النَّاسِ بِالْقُرْآنِ ہیں۔ باقی رہے علماء کرام، تو ان کو تو قرآن کی ہوا بھی نہیں لگی، چنانچہ وہ بہ بانگِ دہل یہ منادی کیا کرتے تھے:

''حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات، قرآن سے قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔'' [۲]

اور مولانا مودودیؒ کے متعلق، بطورِ خاص، یہ اعلان فرمایا کرتے تھے:

''یہ صاحب، قرآنی حقائق و تصورات کی ابجد تک سے لابلد ہیں۔'' [۳]

۱۔ تفہیم القرآن، جلد ۳، صفحہ ۲۸۱ ۲۔ طلوعِ اسلام، جون ۱۹۵٦ء، صفحہ ٦

۳۔ طلوعِ اسلام، مارچ ۱۹۷۷ء، صفحہ ۳۱

لیکن حرام ہے، جو کبھی ''مفکر قرآن'' نے، مولانا مودودیؒ کے اٹھائے ہوئے، اس سوال کا سامنا کیا ہو کہ...... ''حضرت عیسیٰؑ اور اُن کی والدہ، دونوں مل کر، کیونکر، ایک نشانی بنائے گئے تھے؟

چوتھی تحریف اور اس کا جائزہ:

چوتھی تحریف کَانَ اَمْرًا مَقْضِیًّا کے اس مفہوم کی صورت میں ہے، جسے ''مفکر قرآن'' نے یہ کہہ کر، پیش کیا ہے کہ ''وہ بچہ ہمارا پیغمبر بنے گا'' حالانکہ جس سیاق وسباق میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں، اس میں بغیر صحبتِ مرد کے، مریمؑ کو حاملہ کر دینے کے معاملہ کو، قدرتِ خداوندی کے سامنے، نہایت آسان، از حد سہل اور بہت ہی ہلکا معاملہ بیان کیا گیا (باقی سب اس کے بعد کے لوازماتِ حمل ہیں)، اور یہی دراصل وہ چیز ہے، جسے قرآن کریم نے کَانَ اَمْرًا مَقْضِیًّا کہا ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے فوراً بعد، اگلی آیت میں حملِ مریمؑ کا ذکر شروع ہو جاتا ہے، ملاحظہ فرمائیے، اگلی آیت۔

آیت ۲۲:

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا (مریمؑ ۲۲)

''مریمؑ کو اس بچے کا حمل ہو گیا، اور وہ اس حمل کو لیے ہوئے، ایک دور کے مقام پر چلی گئی۔''

یہاں اس امر کی کوئی تصریح نہیں ہے کہ حاملہ قرار پانے کے بعد، مریمؑ، کس مکانِ بعید کی طرف گئی تھیں، تاہم مفسرین کی اکثریت اس پر متفق ہے کہ وہ بیت اللحم کو چلی گئیں۔

ظاہر ہے کہ حمل کا احساس کرنے کے بعد، وہ، ایک شدید ذہنی پریشانی، اور کرب میں مبتلا ہو گئی ہوں گی۔ اس طرح کے حالات میں، آدمی کے لیے، اپنا ماحول، وحشت انگیز بن جاتا ہے، وہ چاہتا ہے کہ اس سے الگ ہو کر، کوئی اور مامن تلاش کرے۔ شاید وہاں سکون پا لینے کی کوئی صورت نکل آئے، حضرت مریمؑ کی یہ تدبیر، اسی طرح کی ایک تدبیر تھی۔

تحریفاتِ منکرینِ معجزات:

منکرینِ معجزات نے، اس آیت کو، دو پہلوؤں سے اپنی تحریف کا نشانہ بنایا ہے، اولاً، اس پہلو سے، کہ مریمؑ کو نقل مکانی کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ ان کی خانہ بدوشی کا محرک اور سبب کیا تھا؟ ثانیاً، آیت کے ترجمہ و مفہوم کے پہلو سے۔

جہاں تک، تحریف کے پہلے پہلو کا تعلق ہے، تو علماءِ سلف و خلف نے، اس نقل مکانی کا جو متفق علیہ محرک اور سبب بیان کیا ہے، وہ مولانا مودودیؒ کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

"حضرت مریمؑ کا اپنے اعتکاف سے نکل کر وہاں جانا، ایک فطری امر تھا۔ بنی اسرائیل کے مقدس ترین گھرانے میں، بنی ہارون کی لڑکی، اور پھر وہ بیت المقدس میں خدا کی عبادت کے لیے وقف ہو کر بیٹھی تھی، یکایک حاملہ ہو گئی۔ اس حالت میں اگر وہ اپنی جائے اعتکاف میں بیٹھی رہتی، اور ان کا حمل لوگوں پر ظاہر ہو جاتا، تو خاندان والے ہی نہیں، قوم کے دوسرے لوگ بھی ان کا جینا مشکل کر دیتے۔ اس لیے بیچاری اس شدید آزمائش میں مبتلا ہونے کے بعد خاموشی کے ساتھ اپنے اعتکاف کا حجرہ چھوڑ کر نکل کھڑی ہوئیں تاکہ جب تک اللہ کی مرضی پوری ہو، قوم کی لعنت ملامت اور عام بدنامی سے تو بچی رہیں۔ یہ واقعہ بجائے خود، اس بات کی بہت بڑی دلیل ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام، باپ کے بغیر پیدا ہوئے تھے۔ اگر وہ شادی شدہ ہوتیں، اور شوہر ہی سے ان کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہوتا، تو کوئی وجہ نہ تھی کہ میکے اور سسرال، سب کو چھوڑ چھاڑ کر، وہ زچگی کے لیے، تن تنہا ایک دور دراز مقام پر چلی جاتیں۔" [۱]

تحریفِ اول اور اس کا جائزہ:

حضرت مریمؑ کے نقل مکانی کے حوالہ سے، "مفکر قرآن" نے اس کا جو محرک اور سبب بیان کیا ہے، اس کے لیے انہیں ایک لمبی چوڑی کہانی گھڑنی پڑی ہے، جس میں صداقت کی

---

[۱] تفہیم القرآن، جلد ۳، صفحہ ۶۴

خفیف ترین مقدار کے ساتھ، کذب و زُور کی بھاری مقدار کو ملانا پڑا ہے۔ پھر وہ اس کہانی کو اپنا مدعاءِ انکارِ معجزات، ثابت کرنے کے لیے، بطور زینہ استعمال کرتے ہیں۔ اس داستان سرائی میں، وہ، نقل مکانی کا محرک بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ اس کہانی کی رُو سے:

''یہودیوں کے ہاں شروع میں خانقاہیت (Mysticism) کا رواج نہیں تھا، اس لیے ہیکل شرعی رسوم و مناسک ہی کا مرکز تھا۔ اس کی حیثیت خانقاہ (Monastery) کی نہیں تھی۔ یہ بعد کی اختراع تھی ......'' [۱]

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ہے، وہ اس آمیزۂ صدق و کذب میں، کسی حد تک سچ کے عنصر کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ نظام خانقاہیت کا یہ اختراع، یہود میں کب واقع ہوا؟ اس کے متعلق ''مفکر قرآن'' صاحب لکھتے ہیں:

''...... ان کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کے ہاں یہ رواج، حضرت عیسیٰ کی ولادت سے کچھ ہی عرصہ پہلے شروع ہوا تھا۔ ابتداءً ہیکل میں صرف (مرد) راہب ہوتے تھے، جو عمر بھر تجرد کی زندگی بسر کرنے کا عہد کرتے تھے۔'' [۲]

''مفکر قرآن'' کی خود ساختہ کہانی کا یہ حصہ خالص جھوٹ ہے، نظام خانقاہیت اور مسلک رہبانیت کا آغاز ہوا ہی حضرت عیسیٰؑ کے بعد ہے (اس کے دلائل، اگلے باب میں آرہے ہیں)۔ اس کے بعد ''مفکر قرآن'' صاحب، بین القوسین جملہ کے بعد، فرماتے ہیں:

''(قرآن کریم نے ان کے احبار، علماء کے ساتھ رہبان، مشائخ کا ذکر بھی کیا ہے ۹/۳۵)۔ اس کے بعد، وہاں راہبات کا سلسلہ بھی شروع ہوگیا (جیسے عیسائی خانقاہوں میں Nuns ہوتی ہیں)۔ شروع میں ہیکل کا ضابطہ یہ تھا کہ راہبات زمانہ قبل از بلوغ تک ہیکل میں رہتی تھیں۔ پھر اس میں یہ ترمیم کی گئی کہ انہیں ساری عمر راہبہ کی حیثیت سے رہنا ہوگا عام حالات میں انہیں تجرد کی

---

[۱] تفسیر مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ۷۶ [۲] مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ۷۶

زندگی بسر کرنا ہوتی تھی لیکن بعض خاص حالات میں ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ ان کی شادی بھی ہو سکتی تھی۔ وہ نہ تو ان پجاریوں کی جماعت سے باہر کسی سے شادی کر سکتی تھیں، اور نہ ہی ہیکل کو چھوڑ کر جا سکتیں۔ اس ضابطہ کی خلاف ورزی، شرعی جرم کا ارتکاب قرار پاتا تھا، ان کی شریعت کسی راہبہ کی، پجاریوں کے باہر کسی مرد سے شادی کو جائز قرار نہیں دیتی تھی۔ اسے وہ زنا تصور کرتے تھے، اور اس کی اولاد کو ولدالزنا۔" [۱]

ماشاء اللہ! "مفکر قرآن" کی افسانہ سازی کی صلاحیتوں کے کیا کہنے۔ "ایسا بلند سب کا ذوقِ نظر کہاں" کہ الفاظ کا خوشنما پیراہن پہنا کر، صدقِ خالص کو جھوٹ اور کذب محض کو سچ بنا کر پیش کیا جائے۔

یہ جو کچھ کہا گیا ہے، اس میں رتی بھر بھی شائبہ صداقت نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں میں خانقاہی نظام، سرے سے موجود ہی نہیں تھا۔ نہ ان میں یہ نظام تھا، اور نہ ہی رہبانیت پائی جاتی تھی، اور نہ ہی وہاں رُہبان و راہبات کا وجود تھا، اور جب راہبات تھیں ہی نہیں، تو ان کے تجرد یا ضوابط نکاح کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہودیوں کی تاریخ میں، یہ چیزیں کبھی رہی ہی نہیں۔ یہ سب کچھ تو بعد میں عیسائیت میں رائج ہوا، لیکن "مفکر قرآن" کی عقلِ عیار نے، عیسائیت سے رہبانیت اور خانقاہت کی جڑیں لے کر، اسے سرزمین یہودیت میں بو دیا، تاکہ ضوابطِ ہیکل کی سرکشی کا، مریمؑ کو مجرم ٹھہرا کر، اسے اُن کی نقل مکانی کا محرک اور سبب قرار دیا جائے۔

تاریخی اعتبار سے تو پرویز صاحب کی کہانی غلط ہے ہی، قرآن کے نقطۂ نظر سے بھی، اس میں کوئی صداقت نہیں پائی جاتی۔

جس وقت امرءۃ عمران، حضرت مریمؑ کو بیت المقدس میں بطور نذر پیش کر رہی تھیں، اُس وقت، سرے سے وہ نظامِ خانقاہیت موجود ہی نہیں تھا، جس کا نقشہ "مفکر قرآن"

---

[۱] مطالب الفرقان، جلد۴، صفحہ ۶۷

صاحب نے، تسویلِ نفس کے زور پر گھڑ ڈالا ہے، کجا یہ کہ وہاں راہبات کو رکھا جاتا تھا۔ ہیکل میں زہد و عبادت، بندگی و ریاضت، دین کی تعلیم و خدمت کے سوا، اور کوئی کام ہی نہ ہوتا تھا۔ اور اس کے لیے صرف مرد حضرات ہی خدام ہیکل کی حیثیت سے وقف رہا کرتے تھے، یہی وجہ ہے کہ عمران کی بیوی، وقف ہیکل کرنے کے لیے، بیٹے کی ولادت کی آرزو مند تھیں۔ اگر وہاں ''مفکر قرآن'' صاحب کا مفروضہ نظام موجود ہوتا، اور مرد و خواتین، بلا امتیاز، وقفِ نذر کیے جاتے ہوتے، تو وہ، خاص طور پر بیٹے ہی کی متمنی نہ ہوتیں۔ اُن کا بیٹے کی پیدائش کا خواہشمند ہونا اور بیٹی کی پیدائش پر، اپنی نذر کے حوالہ سے مغموم و متفکر ہونا، بجائے خود، ''مفکر قرآن'' کی کہانی کے بطلان پر واضح دلیل ہے۔

مزید برآں، ''مفکر قرآن'' صاحب کی یہ بات بھی خلاف حقیقت ہے کہ ''راہبات کو تجرد کی زندگی بسر کرنا پڑتی تھی۔'' اول تو وہاں راہبات کا وجود ہی نہیں تھا جن کو تجرد کی زندگی بسر پڑتی تھی، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو والدۂ مریمؑ، حضرت مریمؑ کو، اور اُن کی ہونے والی اولاد کو خدا کی پناہ میں سونپنے کی یہ دعا نہ کرتی کہ اِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم ۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بچی کو ہیکل کے سپرد کرتے وقت، ماں کے ذہن میں رہبانیت اور خانقاہیت کا وہ تصور موجود ہی نہیں تھا، جو ''مفکر قرآن'' نے گھڑ ڈالا ہے، اور جس میں راہبات کے لیے تجرد کی زندگی بسر کرنا لازم تھی۔ یہ ساری من گھڑت کہانی صرف اس لیے پیش کی جا رہی ہے کہ مریمؑ کے نقلِ مکانی کا سبب اور محرک، اس بات کو قرار دیا جائے کہ ''خانقاہی قوانین'' کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، مریمؑ نے، (بقول ان کے) جو شادی کی ہے، اس پر طعن و تشنیع سے محفوظ رہا جائے (اس پر تفصیلی گفتگو، اگلے باب میں آ رہی ہے)۔

تحریفِ ثانی اور اس کا جائزہ:

آیت کے الفاظ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا کے ترجمہ میں، ''مصنفِ کتاب'' نے جو تحریف کی ہے، اسے وہ ''توضیحی مفہوم'' قرار دیتے ہوئے، یوں بیان کرتے ہیں:

"الغرض (مریمؑ کے اہل میں یہ نکاح ہوگیا، جس کے نتیجہ میں) اس نے اپنے بچے کو اپنے پیٹ میں لیا، پھر (جب لوگوں کی طرف سے ناقابل برداشت مصیبتیں پائیں) تو وہ اس (شوہر) کے ساتھ، کسی دُور جگہ میں الگ ہوگئیں۔"[۱]

يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ کی راہ پر چلتے ہوئے، سب سے پہلے تو بین القوسین خود ساختہ الفاظ کا اضافہ کیا گیا ہے، اور یہ اضافہ بھی، ان لوگوں کی طرف سے کیا جا رہا ہے، جو قرآن کریم کو، "قرآن سے باہر کی تعلیمات سے پاک" کرنا چاہتے ہیں، اور پھر اس اضافہ سے کنواری مریمؑ کا نکاح کر کے، کسی مرد کو، اس کا شوہر بنایا جا رہا ہے، حالانکہ قرآن میں، نہ نکاح کا ذکر ہے اور نہ ہی شوہر کا۔

مزید برآں، تحریف کا یہ پہلو بھی، انتہائی انوکھا اور نرالا ہے کہ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ میں ضمیرِ مجرور کا مرجع، شوہر کو قرار دیا گیا ہے، جس کا سرے سے سیاق و سباق میں کیا، بلکہ پورے قرآن میں کہیں ذکر نہیں ہے۔ اور پھر لطف یہ کہ ایسی تحریف، خود "مفکر قرآن" صاحب کو بھی نہیں سوجھی، انہوں نے بھی اس ضمیر کا مرجع، حملِ مریمؑ ہی کو قرار دیا ہے، اور ترجمۂ آیت، بایں الفاظ پیش کیا ہے:

"پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا، اور وہ لوگوں سے الگ ہو کر دور چلی گئی۔"[۲]

پھر اس کے بعد، "مصنفِ کتاب"، اپنے تحریف شدہ ترجمہ کو صحیح قرار دینے کے لیے (اور بِهٖ میں ضمیر کا مرجع، شوہر کو "ثابت کرنے کے لیے) عربی زبان کے قواعد میں، من گھڑت اضافہ کرتے ہوئے، اسے اپنے باطل موقف کے حق میں "دلیل" بنا کر، یوں تقریرِ استدلال پیش کرتے ہیں:

"فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا کا معنی ہے...... "پھر وہ (مریمؑ) اس (یعنی اپنے شوہر کے ساتھ) کسی دور جگہ میں الگ ہوگئیں، جبکہ طاہر سورتی مرحوم کا ترجمہ

---

۱ ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۵ ۲ شعلۂ مستور، صفحہ ۱۱۲

''اور وہ اسے لے کر لوگوں سے الگ دور کی جگہ چلی گئیں'' ہے۔ جو صحیح نہیں ہے، کیونکہ پیٹ کے بچہ کے لیے الگ ضمیر نہیں آنی چاہئے۔''[۱]

''پیٹ کے بچہ کے لیے الگ ضمیر نہیں آنی چاہئے''...... یہ موصوفِ محترم کی خواہش اور تمنا ہے کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے، لیکن اِسے ایک دوسرے مقام پر، عربی گرامر کا قطعی ضابطہ بنا کر، یوں پیش فرماتے ہیں:

''پیٹ کے بچے کے لیے علیحدہ ضمیر نہیں آتی۔''[۲]

ایک اور مقام پر، پھر اسی بات کا یوں اعادہ کرتے ہیں:

''فَانْتَبَذَتْ بِهٖ میں ضمیر مجرور (ہ) کا مرجع، حضرت مریمؑ کا خاوند ہے۔''[۳]

یہاں دو باتیں قابل غور ہیں۔

اوّلاً ...... یہ کہ، مولانا طاہر سورتی صاحب اور خود پرویز صاحب کے پیش کردہ ترجموں میں سرمو بھی کوئی فرق نہیں ہے دونوں کے تراجم میں بِهٖ میں واقع ضمیر کا مرجع حملِ بطن ہی کو قرار دیا گیا ہے، لیکن ''مصنفِ کتاب''، طاہر سورتی صاحب کے ترجمہ کو غلط قرار دیتے ہیں، اور موقفِ پرویز کی تائید فرماتے ہیں، اگر انصاف اور دیانت بھی کوئی چیز ہے، تو پھر یا تو دونوں ہی کو غلط کہنا چاہئے یا پھر دونوں کو صحیح۔

ثانیاً...... یہ کہ، جہاں تک ''مصنفِ کتاب'' کے اس اصول کا تعلق ہے کہ ''پیٹ کے بچے کے لیے علیحدہ ضمیر نہیں آتی۔'' تو اسے تسلیم کر لینے سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ عربی زبان کے قواعد وضوابط کا جس قدر علم، انہیں حاصل ہے، اُس قدر علم، خود اللہ تعالیٰ کو بھی حاصل نہیں ہے، کیونکہ قرآن مجید میں، ایک مقام پر، خود اللہ تعالیٰ نے، پیٹ کے بچہ کے لیے، الگ ضمیر استعمال کی ہے۔

فَلَمَّا تَغَشّٰهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ بِهٖ (الاعراف – ۱۸۹)

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۷ [۲] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۴۰

[۳] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۷۹

''پھر جب، اس (مرد) نے، اسے ڈھانپ لیا، تو اسے ہلکا سا حمل ٹھہر گیا، پھر وہ اسے لیے ہوئے چلتی رہی۔''

اور خود ''مفکر قرآن'' صاحب نے بھی، جنہیں ترجمہ و تفسیر میں دور کی کوڑی لانے کا شوقِ فضول، فراواں مقدار میں حاصل تھا، اپنے ''مفہوم القرآن'' میں، اس آیت میں واقع ضمیرِ مجرور کو، پیٹ کے حمل ہی کی طرف راجع کیا ہے۔

''...... جب ایسا ہوتا ہے کہ مرد، عورت کی طرف ملتفت ہوتا ہے، تو اسے حمل قرار پا جاتا ہے، شروع شروع میں وہ حمل اتنا ہلکا ہوتا ہے، کہ اسے اس کا بوجھ محسوس ہی نہیں ہوتا، پھر آہستہ آہستہ اس کی شدت محسوس ہونے لگتی ہے۔'' [۱]

آیت ۲۳:

فَاَجَاءَ هَا الْمَخَاضُ اِلٰی جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَنْسِيًّا (مریمؑ ۲۳)

''سو دردِ زہ، اُسے کھجور کے درخت کی طرف لے گیا، اور وہ بولیں کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔''

بہرحال، وضعِ حمل کا وقت آیا، تو دردِ زہ، انہیں، ایک ایسے کھجور کے درخت کی طرف لے گیا، جو کسی نہ کسی طرح انہیں معلوم تھا، تاکہ اس کے تنا کا اٹھنے، بیٹھنے میں سہارا لے سکیں، اور اس کا پھل، ان کی غذا بن سکے۔ یہاں پہنچ کر، ان کی زبان پر بیساختہ یہ الفاظ آ گئے کہ ''کاش''، میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، اور لوگوں کے حافظہ میں میری یاد تک نہ باقی رہی ہوتی۔''

قولِ مریم کا پس منظر:

ان الفاظ کے ارتجالاً اُن کے منہ سے نکل جانے کا سبب کیا تھا؟ اس بارہ میں، پرویز صاحب لکھتے ہیں:

---

[۱] مفہوم القرآن، صفحہ ۳۸۸

''وضعِ حمل کا وقت آیا، تو دردِ زہ کا اضطراب، مریم کو ایک کھجور کے درخت کی طرف لے گیا (آئینِ خانقاہیت کے خلاف متاہل زندگی، پہلے بچے کی ولادت، پردیس کا معاملہ، بے سروسامانی کا یہ عالم کہ سر پر چھت تک بھی نہیں۔ مریم گھبرا گئی، اور کہنے لگی ''اے کاش، میں اس سے پہلے مر گئی ہوتی، اور بالکل بھولی بسری ہوگئی ہوتی۔''

''غور کیجئے، قرآن نے یلیتنی مت قبل هذا و کنت نسیا منسیا کے ایک مختصر سے ٹکڑے میں جذبات و احساسات کی ایک پوری دنیائے نسائیت کو کس نادرہ کاری سے سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔''[۱]

قولِ مریمؑ کی اس بے جا توجیہ پر، جناب طاہر سورتی صاحب فرماتے ہیں:

''پرویز صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہر عورت، دردِ زہ کی تکلیف میں مر مٹنے اور نیست و نابود ہونے کی یہی تمنا رکھتی ہے، بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی است۔ یہ واقعہ ہے کہ وہ گھڑی، عورت کے لیے انتہائی صبر آزما اور موت و حیات کی کشمکش کا باعث ہوتی ہے۔ تاہم، اس وقت کوئی ماں، مرنے کی خواہش نہیں کرتی، بلکہ ہونے والے بچے کی دید و پرورش کا تقاضا، اُس میں زندگی کی خواہش اور زیادہ کر دیتا ہے۔ جناب پرویز صاحب نے اس ادبی جملہ کے ذریعہ جس طرح عورت کی نفسیات کی تشریح فرمائی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ عورت کی فطرت اور اُس کی نفسیات کے قطعاً ادا شناس نہیں ہیں، ان کی اس تشریح نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ وہ اپنے مزعومات کی خاطر، صرف قرآن مجید کی غلط تاویل ہی نہیں کرتے، بلکہ تجرباتِ عامہ سے بھی صرفِ نظر کرتے ہیں۔''[۲]

مولانا مودودی مرحوم، حضرت مریمؑ کے ان الفاظ کے پس منظر کو، بایں الفاظ واضح فرماتے ہیں:

---

[۱] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۶ [۲] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۳۲

''ان الفاظ سے اس پریشانی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے جس میں حضرت مریمؑ اُس وقت مبتلا تھیں، موقع کی نزاکت ملحوظ رہے تو ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ان کی زبان سے یہ الفاظ، دردِ زہ کی تکلیف کی وجہ سے نہیں نکلے تھے بلکہ یہ فکر ان کو کھائے جا رہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے جس خطرناک آزمائش میں ان کو ڈالا ہے، اس سے کس طرح بخیریت عہدہ برآ ہوں۔ حمل کو تو اب تک کسی نہ کسی طرح چھپا لیا، اب اس بچے کو کہاں لے جائیں؟ بعد کا یہ فقرہ کہ فرشتے نے ان سے کہا ''غم نہ کر'' اس بات کو واضح کر رہا ہے کہ حضرت مریمؑ نے یہ الفاظ کیوں کہے تھے۔ شادی شدہ لڑکی کے ہاں، جب پہلا بچہ پیدا ہو رہا ہو، تو وہ چاہے تکلیف سے کتنی ہی تڑپے، اسے رنج وغم کبھی لاحق نہیں ہوا کرتا۔ [1]

امر واقعہ یہ ہے کہ مریمؑ، لوگوں سے الگ ہوکر، دُور کے کسی مقام پر، اس لیے نہیں گئی تھیں کہ وہ ''قوانینِ ہیکل سے سرکشی'' کے نتائج وعواقب سے محفوظ رہنا چاہتی تھی، بلکہ اس لیے دُور دراز جگہ کی طرف نقل مکانی کی تھی کہ وہ اپنے حمل کو جان پہچان کے لوگوں سے چھپانا چاہتی تھیں، جیسا کہ خود، پرویز صاحب، ترجمۂ آیت کی وضاحت کے دوران بیان کیا کرتے تھے۔

''پھر اس ہونے والے فرزند کا حمل ٹھہر گیا، وہ (اپنی یہ حالت چھپانے کے لیے) لوگوں سے الگ ہوکر دُور چلی گئی۔ پھر اُسے دردِ زہ (کا اضطراب) کھجور کے ایک درخت کے نیچے لے گیا (وہ اس کے تنے کے سہارے بیٹھ گئی) اُس نے کہا ''کاش، میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی، میری ہستی کو لوگ یک قلم بھول گئے ہوتے۔'' [2]

آیت ۲۴:

فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا أَلَّا تَحْزَنِي قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا

(مریمؑ ۲۴)

---

[1] تفہیم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۶۴ [2] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۲

''پھر اُس نے پائنتی سے اس کو پکار کر کہا ''غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کر دیا ہے۔''

اس آیت میں دو باتیں، غور طلب ہیں، اولاً، یہ کہ پائنتی سے پکارنے والا کون تھا؟ ثانیاً یہ کہ سَرِيًّا سے مراد کیا ہے؟

پکارنے والا کون؟:

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ حضرت مریمؑ کو کس نے پکارا تھا؟، تو اس میں پرویز صاحب اور ''مصنفِ کتاب''، دونوں مختلف الرائے ہیں۔ شعلۂ مستور میں، اول الذکر نے، آواز دینے والے کو مبہم رکھا ہے، اور فعل معروف کا ترجمہ ایسے مجہول انداز میں کیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس بحث میں پڑنا ہی نہیں چاہتے کہ پکارنے والا کون تھا۔ چنانچہ، وہ فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا کا ترجمہ، ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''(اس کرب و یاس کے عالم میں، اسے، اس مقام کے) نشیب کی طرف سے آواز آئی۔'' [۱]

لیکن معارف القرآن میں، پرویز صاحب فَنَادَاهَا میں نَادىٰ کا فاعل، حضرت مریم کے نومولود کو قرار دیتے ہیں۔

''یہ نومولود ہی کی آواز تھی، جسے اللہ نے طاقتِ گویائی عطا فرمائی تھی، تاکہ حضرت مریمؑ پر، یہ حقیقت منکشف ہو جائے کہ یہ بچہ عام بچوں جیسا نہیں ہے۔'' [۲]

اور ''مصنفِ کتاب''، ڈیڑھ انیٹ کی اپنی الگ مسجد بناتے ہوئے، یہ نئی نرالی اور انوکھی بات کہتے ہیں:

''فناداها من تحتها میں آواز دینے والا بھی ان کا شوہر تھا۔'' [۳]

---

[۱] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۹ [۲] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۲

[۳] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴۰

حالانکہ یہ بات قطعی غلط ہے، کیونکہ ہیکل میں اپنے معتکف سے نکلتے وقت، مریم کے ساتھ، اس کے حملِ بطن کے سوا کوئی بھی نہیں تھا، اور خود پرویز صاحب ہی کے ترجمہ کے مطابق بھی، وہ تنِ تنہا ہی، عازم سفر ہوئی تھیں، البتہ اللہ کی رحمت، بصورتِ فرشتہ، اُن کے ساتھ تھی۔ اور اُسی فرشتہ نے نشیب سے پکارتے ہوئے، اسے خطاب کیا تھا۔ اور خدا کی طرف سے اسے یہ احکام دیئے تھے کہ ''غم نہ کر، درخت کے تنے کو ہلا، تازہ کھجوریں کھا وغیرہ۔'' ان جملہ احکام کا منجانب اللہ، فرشتہ ہی کے ذریعہ سے دیا جانا، قرینِ صواب ہے، نہ کہ مریم کے اس شوہر (یوسف نجار) کی طرف سے، جس کا ذکر، نہ صرف اس سورت میں، بلکہ پورے قرآن میں موجود نہیں ہے۔

بہرحال، نَادیٰ کے فاعل کو، پرویز صاحب کا کسی مقام پر مبہم رکھنا، اور کسی مقام پر نومولود کو بیان کرنا، اور پھر اس کے مقابلہ میں ''مصنفِ کتاب'' کا ''شوہرِ مریمؑ'' (یوسف نجار) کو ایسا سمجھنا، اُس بَیِّن، مُفصّل، مُبِیْن اور تبیاناً لّکُلِ شیءٍ قرآن سے کشید کیا جارہا ہے، جس کے متعلق یہ لوگ، یہ ڈھنڈورا پیٹتے نہیں تھکتے کہ:

> ''اگر قرآنِ خالص کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے، تو کوئی اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔''[۱]

اب یا تو یہ مان لیجئے کہ منکرینِ حدیث کا بیان کردہ یہ اصول غلط ہے، یا یہ تسلیم کر لیجئے کہ یہ دونوں حضرات (پرویز صاحب بھی اور ''مصنفِ کتاب'' بھی) ''خالص'' قرآن کو اتھارٹی تسلیم ہی نہیں کرتے، کیونکہ اگر ایسا ہوتا، تو ان دونوں میں اختلاف نہ ہوتا۔

اشکالِ پرویز اور اس کا جائزہ:

الغرض، قرآن کریم کی روشنی میں، یہ بات قرینِ عقل و صواب ہے کہ فنادیٰ کا فاعل فرشتہ ہی ہے۔ اور علماء سلف و خلف کی اکثریت بھی، اسی پر متفق ہے، لیکن پرویز صاحب نے معارف القرآن میں، اس پر یہ اعتراض کیا ہے:

---

[۱] طلوعِ اسلام، اگست ۱۹۸۴ء، صفحہ ۱۴

''لیکن اگر یہ آواز کسی فرشتہ کی تھی، تو مِنْ تَحْتِهَا کے الفاظ کی ضرورت سمجھ میں نہیں آتی، فرشتہ کی آواز، دل کی گہرائیوں میں القاء ہو سکتی تھی، یا فضا میں سے آ سکتی تھی، اس کے لیے جہت کا تعین کرنا ضروری نہ تھا۔'' [۱]

ضروری نہیں کہ خالقِ کائنات کی ہر مصلحت کا ادراک، مخلوق کے ذہن کو ہو سکے۔ خالقِ کائنات کی مصلحتیں لامحدود ہیں، اور مخلوق کا ذہن انتہائی محدود ہے۔ اس لیے یہ عین ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ کے بیشمار مصالح میں سے کوئی مصلحت، انسان کی سمجھ میں نہ آ سکے، خدا اندر قیاس ما نہ گنجد۔ لیکن حیرت اس بات پر ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب، کہیں تو آواز کے جہت کے تعین کے حوالہ سے، تامّل کرتے ہیں، کہیں (کسی دوسرے مقام پر) ایسی آواز کو بلا تامل تسلیم کر لیتے ہیں، حالانکہ وہاں بھی آواز کا ایک متعین جہت سے سنائی دینا، مذکور فی القرآن ہے۔ ملاحظہ فرمایئے، سرگزشتِ موسوی سے متعلقہ یہ آیت:

فَلَمَّا اَتٰهَا نُودِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ (القصص – ۳۰)

''سو جب وہ اس (آگ) کے پاس پہنچے، تو انہیں آواز آئی، اس میدان کے دا ہنی جانب سے، اس مبارک مقام میں، ایک درخت سے۔''

اب اسی آیت کا وہ ترجمہ بھی ملاحظہ فرمایئے، جو قلمِ پرویز سے برآمد ہوا ہے۔

''سو جب (موسیٰؑ، اس آگ کے شعلہ کے) قریب آیا، تو وادی کے دائیں جانب سے، درخت کے بابرکت مقام سے آواز آئی......'' [۲]

جس طرح، پرویز صاحب کو، یہاں ایک مخصوص جہت سے آواز کے آنے پر تامل نہیں ہوا، اُسی طرح، وہاں بھی انہیں، کوئی تامل نہیں ہونا چاہیے۔

''سَرِیًّا'' کا مفہوم؟:

آیتِ زیرِ بحث میں سَرِیًّا کا جو لفظ آیا ہے، اس سے کیا مراد ہے؟ جناب ''مصنفِ کتاب''

---

[۱] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۴۹۲ [۲] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ۲۰۸

کے نزدیک، اس سے مراد، ''چشمۂ آب'' ہے۔

''اَلَّا تَحۡزَنِیۡ قَدۡ جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِیًّا تو غم نہ کر، تیرے رب نے تیرے نیچے ایک چشمہ جاری کیا ہوا ہے۔'' [۱]

اب رہے، پرویز صاحب، تو وہ حسب عادت، کسی مقام پر کچھ بیان کرتے ہیں، اور کسی مقام پر کچھ۔ چنانچہ وہ شعلۂ مستور میں قَدۡ جَعَلَ رَبُّكِ تَحۡتَكِ سَرِیًّا کا ترجمہ، ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''اے مریم! گھبراؤ نہیں۔ اس طرف ایک (خوشگوار) پانی کی ندی ہے۔'' [۲]

چھوڑیے اس بات کو، کہ قرآنی الفاظ کا یہ ترجمہ درست بھی ہے یا نہیں۔ لیکن بہرحال، اس سے یہ واضح ہے کہ پرویز صاحب کے نزدیک، یہاں سَرِیًّا سے مراد ''پانی کی ندی'' ہے۔ لیکن معارف القرآن میں اسی لفظ کا مفہوم، اس سے مختلف بیان کیا گیا ہے۔

''تیرے پروردگار نے تیرے تلے ایک بڑی ہستی پیدا کردی ہے۔'' [۳]

ہمارے نزدیک سَرِیًّا کا معنٰی ''چشمۂ آب'' یا ''پانی کی ندی'' اقرب الی الصواب ہے۔ اس لیے کہ اس سے پہلے کھجور کے درخت کا ذکر آچکا ہے، جو حضرت مریم کے لیے سرچشمۂ غذاء وخوراک تھا، اور اب چشمۂ آب کا ذکر ہے، وہ ازالۂ جوع کے لیے، اور یہ پیاس بجھانے کے لیے۔

آیت ۲۵، ۲۶:

وَهُزِّیۤ اِلَیۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَیۡكِ رُطَبًا جَنِیًّا فَكُلِیۡ وَاشۡرَبِیۡ وَقَرِّیۡ عَیۡنًا فَاِمَّا تَرَیِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا فَقُوۡلِیۡۤ اِنِّیۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا (مریم ۲۵، ۲۶)

''اور اس کھجور کے تنا کو اپنی طرف ہلا، اس سے تجھ پر تر و تازہ خرمے گریں گے،

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۳۷
[۲] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۶
[۳] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۲

اور کھا اور پی، اور آنکھیں ٹھنڈی کر، پھر اگر تُو کسی آدمی کو دیکھے (کہ وہ معترض ہے) تو کہہ دینا کہ میں نے خداءِ رحمان کے لیے روزہ کی نذر مان رکھی ہے، سو آج میں کسی انسان سے ہرگز بات نہ کروں گی۔''

ان دونوں آیات میں چند قابل غور امور یہ ہیں:

(۱)...... کھجور کے تنا کو حضرت مریمؑ کا ہلانا، محض رحمت الٰہی کے ظہور کا ایک بہانہ تھا، ورنہ ظاہر ہے کہ بچہ کو جنم دینے کے بعد، ان کی قوت بازو اتنی کہاں کہ وہ کھجور کے درخت کو ہلا سکتیں۔

(۲)...... آیت سے یہ بات بھی واضح ہے کہ ماسوا نومولود کے، مریم کے ساتھ، کوئی اور مرد نہ تھا، جو کھجور کے درخت سے تازہ خرمے جھاڑتا، اسی لیے تروتازہ کھجوریں جھاڑنے کے لیے حضرت مریمؑ ہی کو یہ ہدایت جاری کی گئی۔

(۳)...... مولانا عبدالماجد دریا آبادی فرماتے ہیں:

''یونانی اطبّاء نے تازہ خرموں کو زچہ خانہ کے لیے بہترین غذا تسلیم کیا ہے۔''[۱]

(۴)...... دوسری آیت میں، یہ حکم دیا گیا ہے کہ ''کھاؤ پیو، اور فرزند نومولود کے دیدار سے اپنی آنکھیں ٹھنڈی رکھو۔

(۵)...... اگر کوئی شخص، اس بچے کی پیدائش کے حوالہ سے (جس کی دید و زیارت سے آنکھیں ٹھنڈی رکھنے کا تمہیں حکم دیا جا رہا ہے) زبانِ اعتراض دراز کرے، تو اسے اشارتاً یہ کہہ دیجئے کہ ''میں نے اللہ کے لیے صومِ سکوت کی نذر مان رکھی ہے۔ لہٰذا، میں کسی سے بات نہیں کر سکتی۔''

مجرد خاموشی کا یہ روزہ، معلوم ہوتا ہے کہ ہر حال میں، یہود کے ہاں مشروع تھا، ایسے روزے کی تلقین، جس مصلحت کے تحت کی گئی ہے، اُسے مولانا عبدالماجدؒ دریا آبادی، یوں بیان فرماتے ہیں:

---

[۱] تفسیر ماجدی، اردو، صفحہ ۶۲۶

''ایک شریف خاتون کے لیے، جب خود اسی کی عصمت زیر بحث آنے لگے، اپنی بریت و صفائی میں بھی تقریر کرنا، کتنا مشکل ہوتا ہے۔ اس کا اندازہ ہر صاحبِ فہم اور صاحبِ تجربہ رکھتا ہے۔ قرآن مجید نے حضرت مریم کے نزاکتِ جذبات کا لحاظ فرما کر، کتنا اچھا نسخہ انہیں بتا دیا کہ تم اس سوال و جواب ہی میں نہ پڑنا، بلکہ جواب اس بچہ ہی سے دیوانا (جیسا کہ آگے آ رہا ہے)۔ ہم اسے بطورِ خرقِ عادت، تمہاری صفائی میں گویا کر دیں گے۔'' [1]

سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کا یہ حاشیہ بھی قابل مطالعہ ہے:

''مطلب یہ ہے کہ بچے کے معاملے میں تجھے کچھ بولنے کی ضرورت نہیں، اس کی پیدائش پر جو کوئی بھی معترض ہو، اس کا جواب ہمارے ذمہ ہے۔ (واضح رہے کہ بنی اسرائیل میں چپ کا روزہ رکھنے کا طریقہ رائج تھا)۔ یہ الفاظ بھی صاف بتا رہے ہیں کہ حضرت مریم کو اصل پریشانی کیا تھی۔ نیز یہ امر بھی قابل غور ہے کہ شادی شدہ لڑکی کے ہاں، پہلوٹی کا بچہ اگر دنیا کے معروف طریقہ پر پیدا ہو، تو اسے چپ کا روزہ رکھنے کی کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے۔'' [2]

یہ ساری بحث، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ حضرت مریمؑ، متوقع اعتراضات کی جس بوچھاڑ کا نشانہ بننے والی تھیں، وہ اُن کی عفت و عصمت کے حوالہ سے تھی، نہ کہ ''قوانینِ ہیکل کی خلاف ورزی اور سرکشی'' کے حوالہ سے۔ پھر یہ بات بھی قابل غور ہے کہ اگر واقعی، انہوں نے ''قوانینِ ہیکل کی خلاف ورزی اور سرکشی'' کا ارتکاب کیا ہوتا، تو کہیں تو ان کا اعتراف مذکور ہوتا۔ کیونکہ قرآن کریم نے، انہیں انتہائی راستباز خاتون صِدّیقہ کہا ہے (اور صِدّیقہ، عربی زبان میں انتہائی مبالغۂ صفت کا وزن ہے)، اس صفت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ اگر ان سے یہ جرم سرزد ہوا ہوتا تو وہ اعتراف کر لیتیں۔

مزید برآں، قرآن کریم نے اگر کہیں ضمناً بھی، حضرت مریمؑ کا تذکرہ کیا ہے، تو ان

---

[1] تفسیر ماجدی، اردو، صفحہ ۶۲۷ [2] تفہیم القرآن، جلد ۳، صفحہ ۶۵

کی جس خوبی کو بالالتزام اجاگر کیا ہے، وہ خوبی، عفت و عصمت ہی کی خوبی ہے، صرف دو آیات بطور مثال ملاحظہ فرمائیے:

(۱)..... وَالَّتِیْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِنْ رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعَالَمِيْنَ (الانبیاء – ۹۱)

''اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کو محفوظ رکھا، ہم نے اُس میں اپنی روح میں سے پھونکا، اور اسے اور اس کے بیٹے کو، دنیا کے لیے ایک نشانی بنا دیا۔''

(۲)..... وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِنْ رُّوْحِنَا وَصَدَّقَتْ بِكَلِمَاتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ (التحریم – ۱۲)

''اور عمران کی بیٹی، مریم بھی، جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی، ہم نے اپنی روح میں سے، اس میں پھونک دیا، اس نے اپنے رب کی کلمات اور اس کی کتابوں کی تصدیق کی، اور فرمانبرداروں میں سے تھی۔''

اس وضاحت کے بعد، اب آئیے، اگلی آیت کی طرف۔

آیت ۲۷:

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا

(مریمؑ ۲۷)

''پھر وہ (مریمؑ) اپنے بچے کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم میں آئی۔ لوگ کہنے لگے ''اے مریمؑ! یہ تو نے بڑا پاپ کر ڈالا۔''

یہ آیت اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے، لیکن پھر بھی، بیچاری یہ آیت، اُن لوگوں کی دست برد سے محفوظ نہ رہ سکی، جو قرآنِ مجید کا نام لے کر، قرآن کی مرمت کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں۔ چنانچہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کی معنوی تحریف کرتے ہوئے، ''مفکر قرآن'' صاحب نے، جو کچھ لکھا ہے، اس کا ذکر، جناب طاہر سورتی صاحب نے، بایں

الفاظ کیا ہے:

"فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کا ترجمہ، پرویز صاحب نے بالکل غلط کیا ہے، اور یہ اس لیے کہ ان کا کوئی عقیدہ، سیدھے اور صاف ترجمہ کو گوارا نہیں کرتا۔ وہ اس کا ترجمہ یوں لکھتے ہیں:

"جب مریم، لڑکے کو لے کر، اپنی قوم کے پاس آئی، اور وہ سواری پر تھا۔" [۱]

قدرے آگے چل کر جناب طاہر سورتی صاحب تردیداً یہ فرماتے ہیں:

"اس میں کوئی ایسی گنجائش نہیں، جس کو مدنظر رکھتے ہوئے، اس کا ترجمہ "اور وہ سواری پر تھا" کیا جائے۔ یہ نہایت درجہ لغو، عربی زبان و ادب کے خلاف، غیر دیانتدارانہ ترجمہ ہے۔" [۲]

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے مرکب پر سوار ہونے کے لیے، بہرحال، کوئی دلیل یا قرینہ ہونا چاہیے، اس کی وضاحت، مولانا طاہر سورتی صاحب یوں فرماتے ہیں:

"البتہ حَمَلَ کے ساتھ علٰی یا فی بطور صلہ آئے، تو اس کے معنٰی "اٹھا کر کسی چیز پر یا کسی چیز میں رکھا یا سوار کرایا" ہو جاتے ہیں، جیسے حَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّ دُسُرٍ (۵۴/۱۳) "ہم نے اسے تختوں اور کیلوں والی (کشتی) پر سوار کر دیا" اور حَمَلْنٰكُمْ فِي الْجَارِيَةِ (۶۹/۱۰) "ہم نے تم کو کشتی پر سوار کر دیا" قرآن مجید میں صرف ایک مقام ہے جہاں مکرر حمل کا فعل آنے کی وجہ سے، سیاق و سباق اور قرینہ کی بناء پر، پہلے فعل کا صلہ حذف کر دیا گیا ہے، اور وہ یہ ہے وعلى الذين اذا ما اتوك لتحملهم قلت لا اجد ما احملكم عليه۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ یہاں سواری ہی مراد ہو، وہ تو اس قدر خستہ حال مجاہدین تھے کہ ان کے پاس جوتے تک نہ تھے، اور ان کے لیے عسرت کے باعث، جوتے بھی مہیا نہ کیے جا سکے۔ بہرحال، ایسی جگہ جہاں

---

[۱] + [۲] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۳۳

قرینہ و سیاقِ عبارت، سواری کی اجازت نہ دے، اس معنی کو لانا اور صحیح عام استعمال کو چھوڑ دینا، قطعاً بے محل ہے۔'' [1]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب الفاظ آیت میں کوئی ایسا لفظ نہیں ہے، جو حضرت عیسیٰؑ کو سواری پر بٹھا کر لانے پر دلالت کرتا ہو، تو پھر ''اور وہ سواری پر تھا'' کا جملہ تسویلِ نفس کے بل پر، داخلِ عبارت کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کا جواب فی الواقعہ وہی ہے، جو ہر شخص، ذہنِ پرویز کے مطالعہ کے بعد محسوس کرتا ہے، اور جسے خود، مولانا طاہر سورتیؒ صاحب نے، ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

''بات یہ ہے کہ پرویز صاحب کے ایسے صحیح ترجمہ سے لوگ کہتے کہ ''اتنا چھوٹا بچہ جسے ابھی ماں اٹھا کر لا رہی ہے کیسے باتیں کرنے لگا؟ یہ عقل کے خلاف ہے۔'' اسی تعقل پسندی نے انہیں قرآن کے غلط معنٰی کرنے کی جرأت دلا دی۔''

خود بدلتے نہیں قرآن کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق [2]

لیکن پرویز صاحب کو بہرحال، اپنے اس ترجمہ میں اِس سقم کا احساس ہوا، جس کی بناء پر، انہوں نے اس کا ازالہ یوں کیا کہ کہیں تو اس آیت کو اپنی تحریروں ہی سے حذف کر دیا، تاکہ نہ یہ آیت سامنے آئے، اور نہ ہی حضرت عیسیٰؑ کے سوار ہونے یا نہ ہونے کا ذکر کرنا پڑے، لہٰذا، انہوں نے عافیت اسی میں سمجھی کہ یہ آیت مع ترجمہ اپنے تحریری مواد سے خارج کر دی جائے، تاکہ نہ رہے بانس اور نہ بجے بانسری۔ چنانچہ شعلۂ مستور میں بھی اور مطالب الفرقان، جلد چہارم کے صفحہ ۱۰۷ پر بھی، یہی حربہ استعمال کیا ہے، لیکن بعض دیگر مقامات پر، اگر اس آیت کو بیان بھی کیا گیا ہے، تو اس میں سواری کا ذکر نہیں ہے، اور یوں ترجمہ میں کسی حد تک اس سقم کا ازالہ ہو گیا ہے، چنانچہ مفہوم القرآن صفحہ ۶۹۰ اور مطالب الفرقان فی

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۳۳ تا صفحہ ۳۴ [2] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۳۴

دروس القرآن (تفسیر سورہ مریمؑ) صفحہ ۲۸۳ پر، جہاں یہ آیت مذکور ہے، اس میں حضرت عیسٰیؑ کے سوار ہونے کا ذکر مفقود ہے، اگرچہ یہاں ایک اور سقم رکھا گیا ہے۔

مدعی سُست، گواہ چُست:

اب پرویز صاحب نے تو ''مرکب عیسٰی'' کے حوالہ سے، اپنی اصلاح کر لی، لیکن ان کے اندھے مقلدین، ''زمین جنبد نہ جنبد گل محمد'' کا مصداق بنے وہیں کھڑے ہیں، اور مدعیٔ سست کے حق میں، گواہِ چُست کا کردار بایں الفاظ انجام دیتے ہیں:

''طاہر سورتی مرحوم نے پرویز صاحب کے مذکورہ بالا ترجمہ کو بالکل غلط، نہایت درجہ لغو، عربی زبان و ادب کے خلاف، اور غیر دیانتدارانہ قرار دیا ہے، اس بارے میں عرض یہ ہے کہ یہ ترجمہ نہیں، بلکہ آیت کریمہ کا آزاد مفہوم ہے، لیکن معنٰی کے لحاظ سے غلط نہیں۔'' [1]

ہمیں نہیں معلوم کہ اسے عذرِ گناہ بدتر از گناہ کہا جائے یا ملمع ساز منطق (Fallacious Logic)۔ دو مختلف اور متفرق مفاہیم رکھنے والی عبارات میں سے ایک کو، اگر ''ترجمہ'' کہہ دیا جائے، اور دوسری کو ''آزاد مفہوم'' کہہ دیا جائے، تو گویا ''دانشورانِ قرآن'' کے نزدیک، ''بات بن'' جاتی ہے۔ آخر یہ واضح تو کیا جائے کہ ''ترجمہ'' اور ''آزاد مفہوم'' میں کیا فرق ہے؟ اگر دونوں، فی الواقعہ، ایک ہی چیز ہیں، تو پھر ان کے لیے ''ترجمہ'' اور ''آزاد مفہوم'' کی دو الگ الگ اصطلاحات کیوں؟ آخر یہ ہے کیا کہ دونوں عبارتوں میں موجود تخالف میں، یہ کہہ کر توافق پیدا کیا جائے کہ ''معنٰی کے لحاظ سے غلط نہیں ہے۔'' ان دونوں عبارتوں پر خود غور فرمائیے۔

(۱) حضرت مریمؑ، حضرت عیسٰیؑ کو خود اٹھائے ہوئے آئیں۔

(۲) وہ، اپنے بیٹے کو سواری پر بٹھا کر لائیں۔

یہ دونوں جملے واقعی معنٰی کے لحاظ سے ایک ہی حقیقت کے ترجمان ہیں؟ ان میں کوئی

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۹

فرق نہیں؟ اگر کوئی شخص، ضد اور تجاہل عارفانہ میں مبتلا نہیں، تو وہ کبھی بھی، زیرِ بحث قرآنی آیت کا یہ ''آزاد مفہوم'' بیان نہیں کرسکتا کہ...... ''مریم، لڑکے کو لے کر، اپنی قوم کے پاس آئی، اور وہ سواری پر تھا......''

یہ صورتِ حال، اس امر کو واضح کر دیتی ہے کہ خود ''مفکر قرآن'' صاحب، اگر اپنی کسی غلطی کا احساس کرتے ہوئے، چپکے سے، اُسے ترک بھی کر دیں، تو اندھے کی لاٹھی کے سہارے چلنے والے، اُس غلطی کو کبھی ترک نہیں کریں گے جس پر وہ قبل ازیں ''ایمان لا چکے'' ہیں۔

سوال یہ ہے کہ اگر یہ ''آزاد مفہوم'' معنی کے لحاظ سے غلط نہیں'' ہے، تو پھر ''مفکر قرآن'' نے اسے چپکے سے کیوں ترک کر دیا؟

معقول تنقید کا نامعقول جواب:

مولانا طاہر سورتیؒ مرحوم نے قرآنی آیات کے حوالوں سے، موقفِ پرویز کی تردید کرتے ہوئے، یہ ثابت کیا ہے کہ سواری کی صورت میں، حَمَلَ کے ساتھ فی یا عَلٰی کا صلہ آنا ضروری ہے، جبکہ فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ میں، ان دونوں میں سے کوئی صلہ بھی موجود نہیں ہے۔ اور سورہ توبہ کی جس آیت میں سواری کا مفہوم پایا جاتا ہے، وہاں عَلٰی کا صلہ موجود ہے۔ اب اگر، حضرت مریمؑ، واقعی حضرت عیسیٰؑ کو سواری ہی پر بٹھا کر لائی تھیں، تو فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ میں ایسا صلہ کیوں نہیں ہے؟ اس معقول تنقید کا جو جواب، گواہِ چُست کے قلم سے دیا گیا ہے، اسے بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

> ''لِتَحْمِلَهُمْ میں عَلٰی یا فی کے صلہ کو حذف کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جو مومن، رسولِ کریم کے پاس آئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ آپ انہیں کوئی سواری فراہم کریں، سواری کی تخصیص مقصود نہیں تھی کہ وہ گھوڑے ہوں یا اونٹ یا خچر وغیرہ، یا کوئی گاڑی کشتی وغیرہ۔'' [1]

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۹

یہ عبارت، دراصل، کسی کی بات کو، بغیر سوچے سمجھے، اس کا جواب دے ڈالنے کی عادت کر کرشمہ ہے۔

جناب طاہر سورتی صاحب نے خود یہ آیت پیش کرتے ہوئے، لِتَحْمِلَهُمْ میں، ایسے صلہ کی عدم موجودگی کی وجہ، ان الفاظ میں بیان کی ہے کہ...... ''قرآن مجید میں صرف ایک مقام ہے جہاں مکرر حَمَلَ کا فعل آنے کی وجہ سے سیاقِ عبارت اور قرینہ کی بناء پر، پہلے فعل کا صلہ محذوف کر دیا گیا ہے، اور وہ ہے وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ''...... یہ وجہ ہے لِتَحْمِلَهُمْ میں صلہ نہ آنے کی، کیونکہ اسی آیت میں مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ میں یہ صلہ موجود ہے، لیکن ہمارے ''تنقید نگار'' صاحب، بلا سوچے سمجھے یہ جواب دے رہے ہیں کہ چونکہ سواری کی نوعیت مخصوص نہ تھی، اس لیے یہ صلہ محذوف ہے، اور پھر اس بناءِ فاسد پر اگلے فاسد کا ایک اور رڈا جماتے ہوئے، فاتت به قومها تحمله کے بارے یہ فرماتے ہیں کہ

> ''اس آیت میں بھی چونکہ یہ بتانا مقصود نہ تھا کہ حضرت عیسٰیؑ کس جانور یا گاڑی پر سوار تھے، اس لیے عَلٰی یا فی کا صلہ اور سواری کی نوعیت محذوف ہے۔''[1]

بسوخت عقل ز حیرت ایں چہ بوالعجبی است

یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دل اور دے ان کو، جو نہ دے مجھ کو زبان اور

بندۂ خدا! سواری کی تخصیص ہو یا نہ ہو، مرکب کی نوعیت، متعین ہو یا غیر متعین، مطلق سواری ہی کا ذکر ہو، تب بھی حَمَلَ کے ساتھ، صلہ کا آنا ضروری ہے۔ مولانا طاہر سورتی صاحب نے دو مثالیں، قرآن سے پیش کی ہیں، جہاں حَمَلَ میں سواری کا مفہوم لینے کی دلیل عَلٰی یا فی کا صلہ موجود ہونا، بیان کیا گیا ہے۔ ان دونوں مثالوں میں (حَمَلْنٰهُ عَلٰی

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۹

ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ اور حَمَلْنَا كُمْ فِي الْجَارِيَةِ) میں سواری کی نوعیت متعین ہے، رہی ایسی مثال، جس میں سواری کی نوعیت کی تخصیص نہ ہو، اور کوئی صلہ بھی وہاں موجود ہو، تو اس کی مثال، خود ''مصنفِ کتاب'' ہی لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ والی آیت سے پیش کرتے ہیں۔ ان دونوں قسم کی مثالوں سے یہ واضح ہے کہ سواری متعین ہو یا غیر متعین، نوعیتِ مرکب کی تخصیص کی گئی ہو، یا نہ کی گئی ہو، حَمَلَ کے ساتھ، صلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اور جہاں ایسا کوئی صلہ موجود نہ ہو، وہاں، حمل میں سواری کا مفہوم لیا ہی نہیں جاسکتا، اور زیرِ بحث آیت فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ میں چونکہ کوئی صلہ موجود ہی نہیں ہے، اس لیے یہاں سواری کا مفہوم لینا قطعی غلط ہے۔ یہ سادہ سی حقیقت کو سمجھ لینا، کوئی مشکل بات نہیں ہے۔

بیاں میں نکتہ توحید تو آ سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

سواری کے لیے ''مصنفِ کتاب'' کا قرینہ:

اب رہی یہ بات، کہ ''مصنفِ کتاب'' فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ میں، سواری کا معنٰی لینے کے لیے دلیل یا قرینہ کیا پیش کرتے ہیں، تو اس کا جواب یہ ہے:

> ''رہا قرینہ کہ یہاں سوار کرا کے لانے کا معنٰی کیوں لیا جائے، تو وہ سیاقِ عبارت سے واضح ہے۔ حضرت مریمؑ اپنے بیٹے کو اس وقت اپنی قوم کے پاس لائیں، جب وہ جوان ہو چکے تھے۔''[1]

حالانکہ آیت میں سرے سے یہ قرینہ موجود ہی نہیں ہے کہ وہ جوان ہو کر، اپنی والدہ کے ساتھ، اپنی قوم میں آئے تھے، یہ قرینہ، صرف اس لیے خود گھڑا گیا ہے کہ آگے اِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ سے جو کلام شروع ہو رہا ہے، اسے حضرت عیسٰیؑ کے شیر خوارگی کے زمانے کی بجائے، دورِ شباب کا کلام قرار دیا جائے، کیونکہ ''دانشورانِ قرآن'' کی عقل، یہ معجزہ تسلیم نہیں کر سکتی کہ ایک شیر خوار بچہ لوگوں سے ہم کلام ہو۔ یہ سارے پاپڑ، صرف اپنے ذہنی مزعومات کی

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳۹

حمایت و پاسداری کے لیے بنیلے جا رہے ہیں۔ (اس پر تفصیلی بحث آگے آ رہی ہے)۔

شَيْئًا فَرِيًّا:

اب رہا آیت کا دوسرا حصہ، جس میں يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا کے الفاظ آئے ہیں۔ تو اس کے مفہوم میں بھی قائلینِ معجزات اور منکرینِ معجزات، مختلف الرائے ہیں، شَيْئًا فَرِيًّا کا ترجمہ، کسی نے ''بڑا پاپ'' کیا ہے، اور کسی نے ''انوکھی حرکت۔'' لیکن بہرحال، یہ امر کہ اس سے مراد و مفہوم کیا ہے؟ فریقین میں سے ہر ایک کا موقف، متفرق اور جداگانہ ہے۔ قائلینِ معجزات کے نزدیک، اس سے مراد، حضرت مریم کا دوشیزگی کی حالت میں، بیٹے کو جنم دینا ہے، جبکہ منکرینِ معجزات نے چونکہ اپنی خود ساختہ کہانی کی بنیاد پر، اس واقعہ کی ابتداء ہی میں، ٹیڑھی اینٹ رکھ دی ہے، اس لیے اس پر اٹھنے والے قصرِ استدلال کی پوری عمارت میں ہر مقام پر کجی اور اعوجاج موجود ہے جس کا آخری نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ان کے نزدیک، شَيْئًا فَرِيًّا سے مراد، ''قوانینِ ہیکل سے انحراف کرتے ہوئے، مریم کا شادی کرنا اور پھر بچہ جننا'' ہے۔ چنانچہ ''مصنفِ کتاب'' لکھتے ہیں:

> ''اعتراض کرنے والوں کی مراد یہ تھی کہ مریم نے متولیوں کے بغیر نکاح کر لیا ہے، جو عیسیٰ کی پیدائش کا موجب ہوا ہے۔'' [1]

حالانکہ مریمؑ نے کہیں اس بات کا اعتراف نہیں کیا کہ انہوں نے قوانینِ ہیکل سے سرکشی کرتے ہوئے نکاح کیا ہے، یہ منکرینِ معجزات کا خود اپنا گھڑا ہوا، وہ ''گناہ'' ہے، جسے حضرت مریم کے سر، اُسی طرح تھوپا جا رہا ہے، جس طرح، یہودِ بے بہبود نے، اُمّ عیسیٰؑ کو، اُن کی عفت و عصمت کے حوالہ سے، انہیں موردِ الزام بنا ڈالا تھا۔

آیت ۲۸:

يٰٓاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيًّا

(مریمؑ ۲۸)

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۴۸

''اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ کوئی بُرا آدمی تھا، اور نہ ہی تیری ماں بدچلن و بدکار تھی۔''

حضرت مریمؑ کو یَآ اُخْتَ هَارُوْنَ کہنے کی وجہ، یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ واقعتاً ہارون نامی، ان کا کوئی بھائی ہو، جسے تاریخ کی کتب اور الہامی نوشتوں نے محفوظ نہ رکھا ہو، اور اُس دور کے لوگ، مریمؑ کے اُس بھائی سے شناساں و واقف ہوں، یا یہ ہوسکتی ہے کہ اُن کا تعلق اس نسلی قبیلہ سے تھا، جو حضرت ہارون علیہ السلام کی ذریت پر مشتمل تھا، اور اس قبیلے کی طرف منسوب کر کے، انہیں خطاب کیا گیا ہو، ویسے بھی آج کل کی طرح، اُس دور میں بھی یہ دستور تھا کہ لوگ اپنے قبیلے یا قوم کے گزرے ہوئے اکابر و اشراف کے نام پر، اپنی اولاد کے نام رکھا کرتے تھے۔

لفظ ''بَغِيًّا'' اور منکرینِ حدیث:

بہرحال، یہاں اصل قابل توجہ لفظ ''بَغِيًّا'' ہے جسے وابستگانِ طلوع اسلام نے اپنی معنوی تحریف کا نشانہ بنایا ہے۔ ان کے نزدیک، مفہومِ آیت یہ ہے:

''اے اخت ہارون! نہ تو تیرا باپ برا آدمی تھا، نہ ہی تیری ماں نے ہیکل کے قوانین وضوابط سے سرکشی اختیار کی تھی۔'' ؎۱

اب اسی آیت کا وہ صحیح ترجمہ بھی ملاحظہ فرمایئے، جو کبھی، خود پرویز صاحب ہی کے قلم سے برآمد ہوا تھا۔

''اے ہارون کی بہن! نہ تو تیرا باپ بُرا آدمی تھا، اور نہ تیری ماں بدکردار تھی۔'' ؎۲

یہاں بھی، پرویز صاحب نے بغیا کا ترجمہ ''بدکردار'' کیا ہے، اور اس سے قبل، آیت (۱۹/۲۰) میں بھی، اسی لفظ کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔

''مریم بولی ''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا

؎۱ شعلۂ مستور، صفحہ ۱۱۷ ؎۲ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۳

نہیں، اور نہ میں بدچلن ہوں۔'' [1]

امر واقعہ یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' صاحب نے، روشنی سے تاریکیوں کی طرف، سفر کر کے، اپنی پوزیشن بالکل وُہی بنالی ہے، جو مرزا غلام احمد قادیانی نے، دعوائے نبوت کے بعد بنالی تھی۔

آیت ۲۹:

فَاَشَارَتۡ اِلَیۡہِ قَالُوۡا کَیۡفَ نُکَلِّمُ مَنۡ کَانَ فِی الۡمَھۡدِ صَبِیًّا

(مریمؑ ۲۹)

''پس اُس (مریم) نے، اُس (نومولود) کی طرف اشارہ کر دیا، لوگوں نے کہا ''ہم اس سے کس طرح بات کریں جو گود میں بچہ ہے۔''

اس آیت کا ترجمہ (بشرطیکہ اسے تحریف کی بجائے، ترجمہ کہنا صحیح بھی ہو) ''مفکر قرآن'' نے بایں الفاظ کیا ہے۔

''اس پر مریم نے بیٹے کی طرف اشارہ کر دیا، انہوں نے کہا'' بھلا ہم اس سے کیا بات کریں، جو ابھی کل تک جھولے میں تھا۔'' [2]

سوال یہ ہے کہ اس عبارت میں ''ابھی کل تک'' کن قرآنی الفاظ کا ترجمہ ہے۔ اپنی طرف سے ان اضافی الفاظ کے ساتھ، یہ تحریفِ قرآن کس لیے؟ کیا صرف اس لیے نہیں کہ شیر خوار بچے کے معجزائے تکلم کو تسلیم نہ کرنا پڑے؟ کیا انکارِ معجزات کے عقیدہ و مقصد کو پہلے سے قلب و دماغ میں ٹھونس کر، بارگاہِ قرآن میں آنا، کسی ملعون شخص کا طرزِ عمل نہیں ہے؟ کیا دل و نگاہ کی پاکیزگی، اِسی چیز کو کہتے ہیں کہ پیشگی خیالات کو اپنا کر، قرآن کا مطالعہ کیا جائے؟ خود پرویز صاحب ہی کا یہ فرمان ہے:

''اگر کوئی شخص، کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر، قرآن کی طرف صرف اُس لیے آتا ہے کہ اسے اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے،

---

[1] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۱ [2] شعلہ مستور، صفحہ ۱۱۸

تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لیے ہر دو جہاں میں وجہ رو سیاہی ہوتی ہے، قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرکِ عظیم ہے، یہ اپنا دروازہ اس کے لیے کھولتا ہے، جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر، اس کے آستانۂ عالیہ پر دستک دے۔"[۱]

اپنے پیشگی اپنائے ہوئے نظریات و معتقدات کی حمایت و پاسداری کے لیے، ترجمۂ قرآن میں، اضافی الفاظ کے ساتھ، تحریف کا یہ شیوہ اختیار کرتے ہوئے، "مفکر قرآن" صاحب، بڑی ڈھٹائی اور دیدہ دلیری کے ساتھ، یہ اعلان بھی کیا کرتے تھے:

"مَیں، برادرانِ عزیز! پوری دیانتداری سے یہ عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن کریم کو اس طرح سمجھنے کی کوشش نہیں کی، میں اسے شرک سمجھتا ہوں۔"[۲]

بہرحال، آیت زیر بحث کے تحریفی ترجمہ پر، مولانا طاہر سورتی صاحب فرماتے ہیں:

"اس آیت کا ترجمہ پرویز صاحب نے یوں کیا ہے...... انہوں نے کہا "بھلا اس سے ہم کیا بات کریں جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے"...... یہاں تک تو ترجمہ صحیح تھا، اگرچہ اس میں بھی "ابھی" کا لفظ اضافہ ہے جو غیر ضروری ہے، مگر بھلا اس صاف ترجمہ پر، انہیں کیونکر اطمینان ہوتا، اس میں تو انہیں اپنی بات بگڑنے کا خطرہ نظر آنے لگا تھا، لہٰذا بقولِ شاعر:

ع ہمیں تاویل بھی آتی ہے، اپنا مدعا کہیئے

فوراً اس کی تاویل کرتے ہوئے فرماتے ہیں...... "آپ دیکھئے کہ ان کے اس جواب میں کتنا گہرا طنز ہے، وہ کہتے ہیں جو بچہ ابھی کل ہمارے ہاتھوں میں پیدا ہوا، اس سے ہم کیا بات کریں؟"...... دیکھا آپ نے، اِسی کا نام ہے تاویل، یہ صحیح ہے کہ کَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا کے عربی میں دو طرح معنٰی ہو سکتے ہیں۔

---

[۱] + [۲] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۷، ۱۸

ایک تو یہ کہ ''جو گود میں بچہ تھا''، دوسرے یہ کہ ''جو گود میں بچہ ہے''۔ لیکن جو تصریفِ آیات کا قائل ہو، اسے تو دیکھنا چاہئے کہ قرآن مجید میں دوسری جگہ اسی مضمون کو، اس طرح بیان کیا گیا ہے، یُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ (یعنی وہ لوگوں سے، گود میں بات کرے گا)۔ یہ آیت صرف ایک معنیٰ کی طرف راہنمائی کر رہی ہے، اور وہ ایک معنیٰ یہ ہیں کہ یہاں كَانَ ، بجائے ''تھا'' کے ''ہے'' کے لیے استعمال ہوا، اس لیے کہ اس بچہ کے متعلق پیشینگوئی میں یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ گہوارہ میں لوگوں سے گفتگو کرے گا۔'' [1]

''مصنفِ کتاب''، طاہر سورتی صاحب کی، اس معقول تنقید پر، موقفِ پرویز کی حمایت میں لکھتے ہیں:

''یہ تنقید، حضرت عیسیٰؑ کے قول سے، جو اگلی آیت میں، آیت ۳۳ تک مذکور ہے، غلط ثابت ہو جاتی ہے، کیونکہ کوئی بچہ، گہوارہ یا گود میں ہوتے ہوئے، نبی نہیں بنایا گیا، اور نہ ہی اسے کوئی کتاب دی گئی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول، ان کے گود میں ہونے یا گہوارہ میں ہونے کے وقت کا کیونکر ہو سکتا ہے، لہٰذا من كان في المهد صبيا کا معنیٰ ''جو گود میں بچہ تھا'' ہے۔ [2]

پرویز صاحب کے ''وکیل صفائی'' کا یہ استدلال، بالکل اُس شخص کا سا ہے، جو فرشتوں کے سامنے، حضرت آدمؑ کے مسجود ملائکہ ہونے کا انکار، اس بنا پر کیا کرتا تھا کہ ''یہ صریحاً شرک ہے، اور بھلا خدا شرک کا حکم کس طرح دے سکتا ہے، وہ تو قرآن میں جگہ جگہ غیر اللہ کو سجدہ کرنے سے منع کرتا ہے، پھر بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ خود ہی، کسی مخلوق کو، یہ حکم دے کہ خود اس کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کیا جائے، یہ عقل و دانش اور قرآنی بصیرت کے خلاف ہے۔ لہٰذا، نہ تو اللہ نے، فرشتوں کو حکمِ سجدہ دیا، اور نہ ہی آدم مسجودِ ملائکہ قرار پائے۔''

قرآن کا سیاق و سباق، اور اسی موضوع سے متعلقہ دیگر مقامات پر موجود آیات سے

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۳۴ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۴۱

بھی، فی الواقعہ، یہی حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ یہاں کَانَ کو ''ہے'' کے معنٰی میں لینا ہی درست ہے، اور مہد کا یہ کلامِ عیسیٰؑ ، ایک معجزہ ہے۔

اِنِّیْ عَبْدُاللّٰہِ سے لے کر، آیت ۳۳ تک کے فرمودات، حضرت عیسیٰؑ کے دور شباب کے ارشادات ہیں یا زمانۂ شیر خوارگی کے؟ یہ بات تو آئندہ آیات کی بحث میں آ رہی ہے، لیکن یہاں صرف یہ دیکھئے کہ اگر کَانَ کو ''تھا'' کے معنوں میں لیا جائے، تو لوگوں کی مبنی بر اعتراض عبارت یوں قرار پاتی ہے کہ

''ہم (مسیح ہونے کے متعلق) ایسے شخص کے ساتھ کیونکر کلام کریں (جو بچپن میں دیگر بچوں کی طرح) ہنڈولے میں کھیلا کرتا تھا'' [۱]

فی الحال، ''مصنفِ کتاب'' کے اس ترجمۂ آیت میں واقع بین القوسین اضافی الفاظ ''مسیح ہونے کے متعلق'' کو نظر انداز کیجئے، اور بقیہ عبارت پر توجہ اور غور فرمائیے، تو لوگوں کا یہ استفسار کہ کَیْفَ نُکَلِّمُ بے جان و بے وزن ہو کر رہ جاتا ہے، بلکہ مستفسرین، خود بھی، اسی اعتراض کی زد میں آ جاتے ہیں جو وہ ''تیس برس کے عیسیٰؑ'' پر کر رہے ہیں۔ آخر لوگوں کے اس ہجوم میں سے وہ کون سا شخص تھا، جو ''بچپن میں دیگر بچوں کی طرح ہنڈولے میں کھیلا'' نہیں کرتا تھا۔ ہر شخص، ماں کی گود یا گہوارے کی آغوش میں پل کر ہی بڑا ہوا کرتا ہے۔ اب اگر عیسیٰؑ بھی گہوارے (یا آغوشِ مادر) میں پل کر بڑے ہو کر عالم شباب کو پہنچ کر، یہ گفتگو فرما رہے ہیں، تو انہیں لوگوں پر، یا لوگوں کو خود، اُن پر کوئی امتیاز حاصل نہیں ہو جاتا کہ وہ یہ استفسار (یا اعتراض) کر ڈالتے کہ......ہم اِس ''نوجوان'' سے کس طرح کلام کریں، جو ''بچپن'' میں دیگر بچوں کی طرح ہنڈولے میں کھیلا کرتا تھا''......اس لیے، فی الواقعہ، یہاں کَانَ کا معنٰی ''ہے'' ہی درست ہے۔ لیکن منکرینِ معجزات اور ''دانشورانِ قرآن'' کی ''مجبوری'' یہ ہے کہ وہ کسی بھی معجزہ کو ماننا نہیں چاہتے۔ اس لیے انہیں اپنے ذہنی مزعومات کے خلاف، ہمالیہ جیسی وزنی دلیل بھی مل جائے، تو اسے تحریف و

---

[۱] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴۲

تاویل کے ڈاینامائیٹ سے اڑا دینے پر جُت جاتے ہیں، لیکن اگر، انہیں اپنے دل و دماغ میں راسخ کردہ پیشگی خیالات کی حمایت میں، رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی چیز مل جائے، تو اسے پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں، بلکہ اس معاملہ میں یہ لوگ، ایسے کمال درجہ کے فنکار واقع ہوئے ہیں کہ بغیر رائی کے بھی، پہاڑ بنا ڈالنے میں ماہر ہیں۔

۶ ایسا بلند سب کا ذوق نظر کہاں

قرآن کے سیاق و سباق سے، اور ان دیگر آیات سے، جن سے جناب طاہر سورتی مرحوم نے استدلال کیا، یہ واضح ہے کہ بلند پایہ کلام عیسوی، ان کی صبیانی حالت کا معجزانہ کلام ہے، اور اِس کی یہ رزانت و سنجیدگی، فصاحت و بلاغت، حکمت و معرفت اور عظمت و جلالت، آغوشِ مادر میں بھی، اور آخری عمر میں بھی، برقرار رہی ہے، شیر خوارگی و کہولت کی ہر منزل میں، پختہ سن و سال کی دانائی سے لبریز، اس کلامِ نبوت میں قائم جزالت و بلاغت کو دیکھ کر، یہ کہنا کہ یہ صبیانی حالت کا نہیں بلکہ جوانی کی حالت کا کلام ہے، دراصل، ان قلبی خیالات کی ہمنوائی، حمایت اور پاسداری کے لیے ہے، جو پہلے سے اپنائے جا چکے ہیں۔ اور اُنہی تصورارت کے زیر اثر، مطالعۂ قرآن کیا جاتا ہے، اور دور خیز استدلالی موشگافیوں کی بنیاد پر، کبھی تو یہ کہا جاتا ہے، کہ شیر خوارگی کی عمر میں، حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کو تسلیم کرنا، ان آیات کے منافی ہے جن میں انبیاء و رسل کو ''مرد'' کہا گیا ہے، اور صبیانی حالت کے بچے کو ''مرد'' نہیں کہا جاتا۔ حالانکہ یہ اعتراض صرف اس صورت میں صحیح قرار پا سکتا ہے، جبکہ کوئی شخص حضرت عیسیٰؑ کی رجولیت کی عمر میں نبوت کا منکر ہو، حالانکہ نبوت عیسیٰؑ پر ایمان لانے والے، اُن کی صبیانی، جوانی اور کہولت کی ہر حالت میں اُنہیں نبی تسلیم کرتے ہیں اور کبھی یہ کہا جاتا ہے کہ صبیانی حالت میں، حضرت عیسیٰؑ کا صاحبِ علم و فہم ہونا، اس آیت کے منافی ہے جو یہ بیان کرتی ہے کہ ''اللہ نے تمہیں، تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں، اس حال میں پیدا فرمایا کہ تم کچھ نہ جانتے تھے'' (النحل)۔ حالانکہ یہ بات عام لوگوں کے بارہ میں تغلیباً کہی گئی ہے جبکہ حضرت عیسیٰؑ کا معاملہ خصوصی معاملہ ہے جو معجزانہ حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل

حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں ا'تینہ الحکم صبیا آچکا ہے اگر انہیں حالتِ شیر خوارگی میں مضبوطی سے کتاب پکڑنے اور اسی صبیانی حالت حکم دیا جانا قابلِ تسلیم ہے تو عیسیٰ کو کتاب دیئے جانے پر اعتراض کیسا؟

''مصنفِ کتاب'' اور گفتگوئے عیسیٰ:

سرگزشتِ عیسوی میں، قدم قدم پر، جو نشانات سامنے آرہے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا انکار کرنے کے لیے، منکرینِ حدیث، تلبیس و تحریف پر تل جاتے ہیں۔ فرشتے کا عیانا بشری صورت میں مریم سے ہمکلام ہونا، بلامسِ بشر اُن کا حاملہ قرار پانا، اور صبیانی حالت میں حضرت عیسیٰؑ کا لوگوں سے گفتگو کرنا، یہ سب اعجازی علائم ہیں، جنہیں تسلیم کرنا، چونکہ انہیں ناگوار خاطر گزرتا ہے، اس لیے، وہ ان واقعات میں سے اعجازی پہلو کو زائل کرنے کے لیے، جتن پر جتن کیے چلے جاتے ہیں، چنانچہ یُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا کا درست ترجمہ کہ...... ''وہ لوگوں سے گہوارہ میں باتیں کرے گا......'' کرنے کے باوجود، ان الفاظ کا ''آزاد مفہوم'' بیان کرنے میں ہیر پھیر سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ''مصنفِ کتاب'' لکھتے ہیں:

> ''یُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ (وہ لوگوں سے گہوارہ میں باتیں کرے گا) کا مطلب یہ ہے کہ ذہین ہوگا، اچھی اچھی باتیں کرے گا۔'' [1]

قرآن حکیم، یہاں جو حقیقت سامنے لا رہا ہے، وہ یہ نہیں ہے کہ وہ، اپنے آپ سے اچھی اچھی باتیں کرے گا، اور خود کلامی میں اپنی ذہانت و فطانت کا مظاہرہ کرے گا، اور ظاہر ہے کہ یہ تکلم صرف اور صرف اسی صورت میں قابلِ تعریف قرار پا سکتا ہے جبکہ لوگوں سے ان کی گفتگو، دینی حکمت و معرفت، اسلامی عظمت و جلالت، اور پختہ سن و سال کی دانائی اور خردمندی پر مشتمل ہو، محض خود کلامی کی صورت میں، خواہ کتنی ہی اچھی اور مبنی بر ذہانت باتیں ہوں، وہ ہرگز، اس سے مراد نہیں۔ اس کے ساتھ ہی، ''مصنفِ کتاب'' لکھتے ہیں:

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴۱

"...... اور اچھی اچھی باتیں کرے گا، یہ نہیں کہ اسے گہوارے میں ہی نبی بنایا جائے گا، اور گہوارے ہی میں کتاب بھی دی جائے گی، اور صلوٰۃ اور زکوٰۃ کا مکلف ٹھہرایا جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔"[۱]

منکرینِ معجزات کے دماغ کچھ اس قدر کج واقع ہوئے ہیں کہ قرآن کریم کی ہر حقیقت کو جھٹلانا، ان کا مستقل مزاج بن چکا ہے۔ قرآن کریم، اگر یہ کہے کہ ایک پیغمبرؑ کو پرندوں کی بولی سکھائی گئی تھی، تو یہ حضرات، قرآن کی تردید میں یہ کہہ دیتے ہیں کہ "بولی نہیں سکھائی گئی تھی، بلکہ انہیں گھوڑوں کے رسالے کا علم دیا گیا تھا۔" کتاب اللہ، اگر یہ بیان کرے کہ ایک مرسلِ خداوندی نے چیونٹی جیسی حقیر مخلوق کی آواز کو نہ صرف یہ کہ سُنا، بلکہ اس کی زبان بھی سمجھی، اور اس پر تبسم بھی فرمایا، تو قرآن کے یہ ٹھیکیدار فرماتے ہیں کہ "وہ کسی چیونٹی کی آواز نہ تھی، بلکہ قبیلۂ نمل کی ایک خاتون کی گفتگو تھی۔" کلام اللہ اگر یہ بتائے کہ حضرت سلمان، ہدہد جیسے پرندے کی زبان جانتے اور سمجھتے ہوئے، اس سے ہم کلام ہوا کرتے تھے، تو یہ "دانشورانِ قرآن" قرآن کی تغلیط کرتے ہوئے، یہ فرماتے ہیں کہ "ہدہد کوئی پرندہ نہیں تھا، بلکہ وہ ایک انسان تھا جو خبر رساں ادارے میں بھرتی کیا گیا تھا۔" قرآن اگر یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ نے، ایک ایسی آگ سے، جس میں ایک پیغمبر کو پھینکا گیا تھا، اس کی تحریقی خاصیت یوں سلب کر لی اور وہ سلامتی کے ساتھ، اس نبی کے لیے ٹھنڈی ہو کر رہ گئی، تو یہ "علمبردارانِ قرآن" یہ کہہ کر، قرآن کو جھٹلا دیتے ہیں کہ...... "انہیں تو آگ میں پھینکا ہی نہیں گیا تھا، وہ تو اس سے پہلے ہی ہجرت فرما چکے تھے۔" اللہ تعالیٰ کی وحی جلی، اگر یہ کہے کہ حضرت زکریا کی طلبِ پسر کی خواہش میں، اُن کا حد سے بڑھا ہوا بڑھاپا، ایک منقصت ہونے کے علاوہ روکاوٹ بھی تھا، تو اَعْلَمُ النَّاس، بِالقرآن کے زعم میں مبتلا یہ لوگ یہ کہہ کر، قرآن کی تردید کرتے ہیں کہ "حضرت زکریا میں تو کوئی نقص تھا ہی نہیں۔" پھر خدا کا کلام، اگر حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش سے قبل یہ پیشگی اطلاع

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۲۱

دے کہ وہ مہد میں لوگوں سے باتیں کریں گے، اور پیدائش کے بعد، مہد میں گفتگو کا واقعہ تک بیان کر دے، تو یہ قرآن پر ایمان کے دعوے دار، پیشگی اطلاع گفتگو کو یہ کہہ کر جھٹلا دیں گے، کہ "قرآن میں مہد کی گفتگو کا تو ذکر ہی نہیں ہے، وہ تو ان کے عہدِ شباب کی گفتگو ہے۔"

میری صاف گوئی، اگر ناگوارِ خاطر نہ ہو، تو میں یہ عرض کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ یہ لوگ کج دماغ ہونے کے ساتھ ساتھ، خائن اور بد دیانت بھی ہیں، کیونکہ دیانتداری کا یہ تقاضا ہے کہ اگر قرآن کی فراہم کردہ معلومات کو، ان کا دل و دماغ ماننے سے انکار کرتا ہے، تو وہ مخلصانہ ایمانداری کے ساتھ، قرآن کا انکار کر دیں، آخر یہ کیا منافقت ہے کہ قرآنی حقائق کو تسلیم بھی نہ کیا جائے، اور دعویٰ ایمان بھی کیا جائے، اور اس منافقت پر پھر یہ خیانت مستزاد ہو کہ قرآنی حقائق کی تحریف بھی کی جائے

زیرِ بحث آیت کے ضمن میں، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ سیّد مودودیؒ کے حاشیہ کو بھی نقل کر دیا جائے، وہ فرماتے ہیں:

"قرآن کی معنوی تحریف کرنے والوں نے اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ "ہم اس سے کیا بات کریں جو کل کا بچہ ہے یعنی ان کے نزدیک یہ گفتگو، حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کے زمانے میں ہوئی اور بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں نے کہا کہ ہم بھلا اس لڑکے سے کیا بات کریں جو کل ہمارے سامنے گہوارے میں پڑا ہوا تھا مگر جو شخص موقع و محل اور سیاق و سباق پر کچھ بھی غور کرے گا، وہ محسوس کرے گا کہ یہ محض ایک مہمل تاویل ہے جو معجزے سے بچنے کے لیے کی گئی ہے، اور کچھ نہیں تو ظالموں نے یہی سوچا ہوتا کہ جس بات پر اعتراض کرنے کے لیے لوگ آئے تھے، وہ تو بچے کی پیدائش کے وقت پیش آئی تھی، نہ کہ اس کے جوان ہونے کے وقت۔ علاوہ بریں، سورہ آل عمران کی آیت ۴۲ اور سورہ مائدہ کی آیت ۱۱۰، دونوں اس بات کی قطعی صراحت کرتی

ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ نے یہ کلام، جوانی میں نہیں، بلکہ گہوارے میں ایک نوزائدہ بچے کی حیثیت سے کیا تھا، پہلی آیت میں فرشتہ، حضرت مریم کو بیٹے کی بشارت دیتے ہوئے، یہ کہتا ہے کہ وہ لوگوں سے گہوارے میں بات کرے گا، اور جوان ہو کر بھی۔ دوسری آیت میں اللہ تعالیٰ خود حضرت عیسیٰؑ سے فرماتا ہے کہ تو لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرتا تھا اور جوانی میں بھی۔'' [1]

اقتباساتِ پرویز:

منکرینِ حدیث کے نزدیک ''قرآنی حقائق میں اتھارٹی'' کی حیثیت، صرف پرویز صاحب کو حاصل ہے، ان کے نزدیک ''سند'' صرف وہی ہیں۔ قرآن کے الفاظ کا خدائی منشا و مراد، وہی کچھ ہے جو انہوں نے بیان فرمایا ہے۔ باقی رہے مُلّا حضرات، تو وہ تو، ان کے نزدیک، قرآنی حقائق پر پردے ہی ڈالتے رہتے ہیں۔ قرآنی مطالب و مفاہیم کی وضاحت، صرف پرویز صاحب ہی نے کی ہے۔ اس لیے، ہم ان ہی کی چند تحریریں پیش کیے دیتے ہیں۔ وہ خود فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ کا مفہوم اس طرح بیان کرتے ہیں کہ مرکبِ عیسیٰ کا مسئلہ بھی حل ہو جاتا ہے۔

''پس جب وہ لڑکے کو لے کر اپنی قوم کے پاس آئی، لڑکا اس کی گود میں تھا۔'' [2]

پھر حضرت عیسیٰؑ کی صبیانی حالت میں گفتگو پر، پرویز صاحب کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی شاہد ہے کہ جب معترضین کا ہجوم اُن پر پل پڑا تھا، تو اس وقت:

معاملہ بڑی نازک صورت اختیار کر رہا تھا۔ آپ یہ سب کچھ سُن رہی تھیں لیکن خاموش تھیں، خاموش اس لیے بھی تھیں کہ آپ سے، اس سے پہلے کہہ دیا گیا تھا کہ اگر ایسا وقت آئے تو اپنے روزے کے متعلق اشارہ کر دینا۔ لہٰذا آپ خاموش کھڑی تھیں، مناسب وقت تھا کہ حضرت مریم کے طرزِ عمل کے متعلق ایک ایسی شہادت پیش کی جاتی، جس کے بعد، اس باب میں کسی اور دلیل کی

---

[1] تفہیم القرآن، جلد ۳، صفحہ ۶۶ [2] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۳

ضرورت باقی نہ رہتی، اور یہ شہادت، اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتی تھی کہ یہ بچہ کوئی عام بچہ نہیں، بلکہ خصوصیاتِ عظمیٰ کا حامل ہے، چنانچہ فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ ''اس پر مریمؑ نے بچے کی طرف اشارہ کیا''۔ اس پر انہوں نے قہقہہ لگایا، اور کہا ''کیا کہتی ہو؟ سوال ہم نے تم سے کیا ہے، بجائے اس کے کہ اس کا جواب دو، ہمیں کہہ رہی ہو کہ اس بچے سے پوچھیں۔ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ''انہوں نے کہا بھلا اس سے ہم کیا بات کریں؟ جو ابھی گود میں بیٹھنے والا بچہ ہے'' اس پر کیا ہوا؟ وہ بچہ بول اٹھا قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ ......''[۱]

آیات ۳۰ تا ۳۳:

قَالَ اِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ اٰتٰنِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا وَّجَعَلَنِي مُبَارَكًا اَيْنَ مَا كُنْتُ وَ اَوْصَانِي بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا وَّبَرًّا بِوَالِدَتِي وَلَمْ يَجْعَلْنِي جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا (مریمؑ ۳۰ - ۳۳)

''بچے نے کہا ''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا اور جہاں کہیں بھی میں ہوں، مجھے مبارک بنایا، اور جب تک زندہ رہوں، مجھے نماز اور زکوٰۃ کی ہدایت کی، اور مجھے اپنی ماں کا حق شناس بنایا، اور سرکش و بدبخت نہیں بنایا، میرے یوم پیدائش، یوم موت اور یوم بعثت، الغرض ہر روز مجھ پر سلامتی ہے۔''

ان آیات پر، ''مصنفِ کتاب''، اپنی فلسفیانہ عقل کی روشنی میں لکھتے ہیں:

''کیا یہ کسی بچہ کا قول ہو سکتا ہے؟ نہیں، اس لیے کہ قرآن مجید میں ایک قاعدہ کلیہ بیان کیا گیا ہے کہ انسانوں کو، ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں نکالتا ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں جانتے ہوتے۔''[۲]

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۴ [۲] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۴۲

موصوف محترم، پہلے خود ایک سوال پیش کرتے ہیں، اور پھر خود ہی، اس کا جواب نفی میں دیتے ہیں۔ اس پر ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ خود ہی، اب پرویز صاحب کا مندرجہ بالا اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیں، جس میں انہوں نے اِنِّی عَبْدُ اللہِ سے لے کر، آیت ۳۳ تک کی گفتگو کو نومولودِ مریمؑ ہی کی گفتگو قرار دیا ہے۔

اب رہا وہ ''قاعدہ کلیہ'' جو سورہ نحل کی آیت ۷۸ سے کشید کیا گیا ہے، تو پوری آیت کے الفاظ دیکھنے سے، اس کی حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔

وَاللہُ اَخْرَجَکُمْ مِّنْ بُطُوْنِ اُمَّهَاتِکُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَیْئًا وَّجَعَلَ لَکُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ لَعَلَّکُمْ تَشْکُرُوْنَ(النحل - ۷۸)

''اور اللہ نے تمہیں، تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے اس حال میں برآمد کیا ہے کہ تم کچھ بھی نہیں جانتے تھے، اور اس نے تمہارے کان، آنکھیں اور دل بنائے تاکہ تم شکر کرو۔''

آیت میں سمع و بصر اور دل (و دماغ) کے دیئے جانے کا بھی ذکر ہے، لیکن ''مصنفِ کتاب''، پیدائش کے وقت، صرف ''بے علمی'' ہی کا ذکر کرتے ہیں۔ اور باقی چیزوں کے ذکر کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ اب اگر واقعی، اس آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قاعدہ کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے، تو ہمارا روز مرہ کا مشاہدہ، اس کے قاعدہ کلیہ ہونے کی نفی کرتا ہے، کیونکہ جس خدا نے (بقول ''مصنفِ کتاب'') اسے قاعدہ کلیہ قرار دے رکھا ہے، وُہی خدا، خود اس دنیا میں ایسے افراد پیدا کر رہا ہے، جو پیدائشی اندھے اور مادرزاد بہرے ہوتے ہیں، اور دل و دماغ کی صلاحیتوں اور قوتوں سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ اگر پوری آیت، ''مصنفِ کتاب'' کے سامنے ہوتی، اور وہ قرآن کو ہدایت دینے کی بجائے، قرآن سے ہدایت لینے کے متمنی ہوتے، تو یہ حقیقت، ان پر منکشف ہو جاتی کہ آیت میں جو کچھ کہا گیا ہے، وہ قاعدہ کلیہ کے طور پر نہیں، بلکہ تغلیب کے اصول پر کہا گیا ہے، اور تغلیب کا یہ وہ اصول ہے جس کے تحت، ایک مثال دیتے ہوئے، وہ خود لکھتے ہیں:

''آباء میں تغلیباً مائیں بھی داخل ہیں۔'' ؎۱

الغرض، سورہ مریم کی آیات ۳۰ تا ۳۳، حضرت عیسیٰؑ کے اس کلام پر مشتمل ہے، جو تکلم فی المھد کے طور پر پیش کیا گیا ہے، اور جسے جوانی کے دور کی گفتگوئے عیسوی قرار دینے کے لیے، ''مصنفِ کتاب''، ایڑی چوٹی کا زور لگاتے ہوئے، طاہر سورتیؒ کی معقول تنقید کی تردید میں یہ فرماتے ہیں:

''یہ تنقید، حضرت عیسیٰؑ کے قول سے، جو اگلی آیت میں، آیت ۳۳ تک مذکور ہے، غلط ثابت ہو جاتی ہے، جہاں انہوں نے کہا ''میں اللہ کا بندہ ہوں، اس نے مجھے کتاب دی اور نبی بنایا الخ۔ کیونکہ کوئی بچہ گود یا گہوارہ میں ہوتے ہوئے نبی نہیں بنایا گیا اور نہ ہی اسے کتاب دی گئی۔ جب ایسا نہیں ہوا تو حضرت عیسیٰؑ کا یہ قول، ان کے گود میں ہونے یا گہوارہ میں ہونے کے وقت کا کیوں کر ہو سکتا ہے۔'' ؎۲

جی ہاں! حضرت عیسیٰ علیہ السلام، فی الواقعہ، ایسے ہی نبی تھے، جنہوں نے فی المھد تکلم کے ذریعہ، اپنے نبی ہونے کا، اور خود کو الکتاب دیئے جانے کا اعلان فرمایا تھا، اور یہی تکلم فی المھد صَبِیًّا اُن کا معجزہ تھا، جو ''مصنفِ کتاب'' سمیت، ہر منکرِ معجزات کی عقل سے بالاتر ہے، یقین نہ آئے، تو پرویز صاحب کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے، جسے شائد، انہوں نے اپنے ماضی کے کسی ''مصنفِ کتاب'' ہی کی تردید میں لکھا تھا، یہ الگ بات ہے کہ بعد میں، وہ مرزا غلام احمد قادیانی کی طرح، صحیح پٹڑی سے اکھڑ گئے، اور خود کسی ''مصنفِ کتاب'' کی تائید کے محتاج ہو گئے۔

''تکلم فی المھد کے متعلق بہت سی تاویلیں کی جاتی ہیں تاکہ کسی طرح یہ ظاہر ہو جائے کہ یہ واقعہ، حضرت عیسیٰؑ کی جوانی (بلکہ نبوت) کے زمانہ کا ہے، لیکن قرآنی اندازِ بیان، اس باب میں ان تاویلات کا متحمل نہیں ہوتا، اس لیے یہ واقعہ معجزہ کے ضمن سے تعلق رکھتا ہے۔'' ؎۳

؎۱ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۹۹ ؎۲ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۴۱

؎۳ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۶

تناقض کلامی اور تضاد گوئی، ''مفکر قرآن'' جناب غلام احمد پرویز صاحب کا مستقل شعار تھا، صبیانی حالت کے جس تکلم کو وہ معجزہ قرار دیا کرتے تھے، اور اس گفتگو کو، اُن کے عہد شباب سے وابستہ کرنے کے لیے، جن تاویلات کے متعلق وہ کہا کرتے تھے، کہ قرآن ان کا متحمل نہیں ہوسکتا، بعد میں، اُن ہی تاویلات کو، خود انہوں نے اپنا لیا، اور اپنے اصول تضاد گوئی کا دامن، اس لیے اپنے ہاتھ سے نہ چھوڑا کہ وہ ''بڑے ہی اصول پرست'' تھے، اور اب اس بدلے ہوئے موقف کی وکالت، ''مصنفِ کتاب'' کے حصہ میں آئی ہے۔

''مصنفِ کتاب'' سے ایک درخواست:

قبل اس کے کہ فرموداتِ عیسوی میں سے، ہر جملے کا مختصر مفہوم پیش کیا جائے، جناب ''مصنفِ کتاب'' سے درخواست ہے کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کے تکلم فی المھد کو تسلیم کر لیں۔ انہیں جو الجھن ہوتی ہے کہ..... ''کوئی بچہ، گود یا گھوارے میں ہوتے ہوئے، نبی نہیں بنایا گیا، اور نہ ہی اسے کوئی کتاب دی گئی''.....تو اس کا ازالہ وہ اس توجیہ کے ساتھ بھی کر سکتے ہیں کہ ''مستقبل کے ان واقعات کو، جن کا وقوع، یقینی اور غیر مشتبہ ہو، ماضی کے صیغہ میں بیان کرنا قرآن کی عادت کے عین مطابق ہے۔ اس لیے آیت ۳۰ تا ۳۳ میں موجود ماضی کے صیغے، مستقبل میں اُن کے نبی بنائے جانے، اور اُنہیں کتاب دیئے جانے کے یقینی ہونے کے پیشِ نظر، استعمال ہوئے ہیں۔'' لیکن بہر حال، اس کلام عیسوی کو تکلم فی المھد قرار دیئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔

پھر یہاں، ایک اور بات بھی قابل غور ہے، اور وہ یہ کہ ان آیات (۳۰ تا ۳۳) کو، آپ، حضرت عیسیٰؑ کی جوانی کا کلام قرار دے بھی ڈالیں، تب بھی تکلم فی المھد کے معجزہ سے جان چھڑانا ممکن نہیں ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود، اس امر کا یہ کہہ کر، اثبات کر رہا ہے کہ تُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً ''تو لوگوں سے مہد میں اور سن کہولت میں باتیں کیا کرتا تھا''۔ اب کیا آپ، خدا کی اس صراحت سے بھی انکار کے لیے، ایسی ہی ضد اور مکابرت اختیار کرتے رہیں گے؟

مختصر مفہومِ آیات:

آیئے اب ہم دیکھیں، کہ سورہ مریم کی آیات ۳۰ تا ۳۳، جن فرمودات عیسیٰ علیہ السلام پر مشتمل ہیں ان کا مفہوم و مطلب کیا ہے۔

(۱)..... اِنِّی عَبْدُ اللهِ اس ذرا سے فقرہ میں، ہر قسم کے غلو کی تردید آ گئی، خواہ یہ غلو، نصاریٰ کے افراط کی جانب سے ہو یا یہود کے تفریط کی۔ اور نہ صرف، دو متضاد انتہاؤں میں پہنچے ہوئے غلو کی تردید آ گئی بلکہ ان کی اصل حیثیت بھی اجاگر ہو گئی کہ وہ صرف بندے ہیں، اللہ کے مقرب اور خاص بندے۔

(۲)..... وَاٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا وَّجَعَلَنِیْ مُبٰرَکًا اَیْنَ مَا کُنْتُ اس فرمانِ عیسوی کے مطابق، آپؑ نے اپنی تعریف و تعارف کے لیے فرمایا کہ میں صاحبِ کتاب اور رسول خدا ہوں، اس اعتبار سے میں مامور من اللہ معلم خیر ہوں، جس سے خلقِ خدا کو مجھ سے، دین و دنیا کا نفع پہنچے گا، اور یہ منفعت بخشی، میرے وجود کے مبارک ہونے پر دال ہے۔

(۳)..... وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا یعنی منصبِ نبوت و رسالت پر فائز ہونے کے باوجود بھی، میں کوئی ایسی فوق البشر ہستی نہیں ہوں، جو احکام خداوندی کی اطاعت و پیروی سے بالاتر قرار پائے، میں بندۂ خدا ہوں اور میرے اوپر بھی، زندگی بھر، عبادتیں اور احکام شریعت کی اتباع و تابعداری فرض ہے۔

(۴)..... وَّبَرًّا بِوَالِدَتِیْ (الف) اس فقرہ میں تردید ہے، انجیل مروجہ کی پیدا کی ہوئی، اس غلط فہمی کی، کہ آپؑ کا برتاؤ اپنی والدہ کے ساتھ، اچھا نہ تھا، اور آپؑ ان سے بے رخی، بے التفاتی اور بے اعتنائی برت جاتے تھے۔

(ب) اس حُسنِ سلوک کے موقع پر، بجائے والدین کے، صرف والدہ ہی کا نام لینا، خود اس بات کا قرینہ ہے کہ آپ کی ولادت، بلا باپ تھی۔

(ج) آپؑ نے خود اپنی والدہ کا ذکر کر کے، خود اس بات کی نفی کر دی کہ آپ کوئی

ایسی ہستی تھے، جس کی صفت لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ ہو۔

(۵)......وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا اسلام کی زبان میں سرکش و بد بخت وہ شخص ہوتا ہے، جو خالق ومخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرے۔ اس فقرہ میں آپؑ نے خود اپنا تعارف یہ کہہ کر پیش کیا کہ میں خلق یا خالق، کسی کے حقوق کو ادا کرنے میں بھی کوتاہ و قاصر نہیں ہوں، کہ ایسا کرکے، سرکشی و بدبختی کا سزاوار قرار پاؤں۔

ضمناً، یہاں یہ مسئلہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ اپنے تعارف کے لیے (نہ کہ غرور و افتخار کے لیے) کسی دینی مصلحت کے پیشِ نظر، اپنی تعریف کرنا جائز ہے۔

(۶)......وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا سلام یہاں وسیع معنوں میں، امن و حفظ کے مرادف ہے، یعنی اللہ کی طرف سے مجھ پر سلامتی، میری پیدائش کے وقت بھی رہی، اور میری موت اور بعثت کے وقت بھی رہے گی۔

آیت ۳۴:

ذٰلِكَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ (مریمؑ ۳۴)

''یہ ہیں عیسیٰ بن مریم، سچی بات، جس میں یہ لوگ جھگڑ رہے ہیں۔''

یعنی یہ ہے صحیح کیفیت۔ یہ ہے ان کے نبی اور بندۂ مقبول و مقرب ہونے کا صحیح بیان اور سچی صورتِ حال۔ نہ وہ خدا، نہ فرزندِ خدا، نہ اوتارِ خدا، جیسا کہ عیسائیوں کا گمان ہے، اور نہ وہ بندۂ نامقبول و مردود، جیسا کہ یہود نے طرح طرح سے انہیں متہم کر رکھا ہے۔

قَوْلَ الْحَقِّ یعنی اصل حقیقت یہی ہے، نہ کہ وہ داستانیں، جو ماضی میں یہود و نصاریٰ نے گھڑ رکھی ہوں، یا دورِ حاضر میں، منکرینِ حدیث و منکرینِ معجزات نے افتراء کر ڈالی ہوں۔

الغرض، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا وجود بجائے خود ایک نشانی ہے (وَلِنَجْعَلَه اٰيَةً لِّلنَّاسِ)، اس سلسلہ میں، اختتامِ بحث پر سید مودودیؒ کا مندرجہ ذیل اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

''یہ ہے وہ ''نشانی'' جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات میں بنی اسرائیل کے

سامنے پیش کی گئی۔ اللہ تعالیٰ بنی اسرائیل کو ان کی مسلسل بدکرداریوں پر عبرت ناک سزا دینے سے پہلے ان پر حجت تمام کرنا چاہتا تھا، اس کے لیے، اس نے یہ تدبیر فرمائی کہ بنی ہارون کی ایک ایسی زاہدہ و عابدہ لڑکی کو جو بیت المقدس میں معتکف تھی اور حضرت زکریا کے زیر تربیت تھی، دوشیزگی کی حالت میں حاملہ کر دیا تاکہ جب وہ بچہ لیے ہوئے آئے تو ساری قوم میں ہیجان برپا ہو جائے، اور لوگوں کی توجہات یک لخت اس پر مرکوز ہو جائیں۔ پھر اس تدبیر کے نتیجے میں، جب ایک ہجوم، حضرت مریم پر ٹوٹ پڑا تو اللہ تعالیٰ نے اس نوزائیدہ بچے سے کلام کرایا، تاکہ جب یہی بچہ بڑا ہو کر نبوت کے منصب پر سرفراز ہو، تو قوم میں ہزاروں آدمی اس امر کی شہادت دینے والے موجود رہیں کہ اس کی شخصیت میں وہ اللہ تعالیٰ کا ایک حیرت انگیز معجزہ دیکھ چکے ہیں۔ اس پر بھی جب یہ قوم اس کی نبوت کا انکار کرے اور اس کی پیروی کرنے کی بجائے، اسے مجرم بنا کر، صلیب پر چڑھانے کی کوشش کرے، تو پھر اس کو ایسی عبرتناک سزا دی جائے، جو دنیا میں کسی قوم کو نہیں دی گئی۔ [1]

☆..........☆..........☆

---

[1] تفہیم القرآن، جلد۳، صفحہ ۶۷

باب پنجم

معقول دلائل پر، نامعقول تنقید

ولادتِ مسیح علیہ السلام کا مسئلہ، اگرچہ گزشتہ ابواب میں واضح ہو چکا ہے، لیکن پھر بھی یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بے پدر ولادت کے بارے میں، مولانا طاہر سورتی مرحوم نے، قرآنی آیات کی تشریحات کے علاوہ، جو قرآنی دلائل پیش کیے ہیں، ان کا ذکر بھی کر دیا جائے، اور پھر ان معقول دلائل پر، غلط تراجم آیات اور باطل تشریحات کے ذریعہ، ''مصنفِ کتاب'' نے جو نامعقول تنقید کی ہے، اُسے بھی قارئین کرام کی خدمت میں پیش کر دیا جائے، تاکہ یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جائے کہ یہ لوگ:

ع خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں

مریمؑ، رہبانیت اور اقتباسِ پرویز:

یہود بے بہبود نے، حضرت مریمؑ پر، نہایت شرمناک الزامات لگائے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو (معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ۔ نقل کفر، کفر نباشد) براہ راست ولد الزنا قرار دیا، لیکن اس کے مقابلہ میں، ''مفکر قرآن'' نے، اپنی ایک من گھڑت داستان کی رو سے، حضرت مریمؑ پر یہی الزام بالواسطہ، اِس طرح عائد کیا:

> حضرت مریم ایک راہبہ کی زندگی بسر کر رہی تھیں جسے دنیاوی علائق سے کچھ واسطہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ ساری عمر تجرد میں گزار دینی چاہئے، آپ کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ انہیں متاہل زندگی بسر کرنی ہوگی، کیونکہ انہیں عظیم الشان رسول کی امین بننا ہے۔ اس طے شدہ امر (اَمْرًا مَقْضِيًّا) کے مطابق حضرت مریم نے خانقاہ کی زندگی چھوڑ کر عائلی زندگی اختیار کی، لیکن یہودیوں

کے نزدیک یہ کوئی چھوٹا جرم نہ تھا۔ ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر، ایک متاہل زندگی اختیار کر لینا، مشربِ خانقاہیت میں ارتداد سے کم نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس جذبۂ انتقام اور شکستِ پندار کو بھی ملحوظ رکھیئے جو حضرت مریمؑ کی اس روش سے ان کے دل میں پیدا ہوا تھا کہ انہوں نے ہیکل کے پجاریوں میں سے کسی کے ساتھ شادی نہیں کی، اور ہیکل سے باہر، ایک دوسرے شخص سے شادی کر لی۔ ان وجوہات کی بناء پر انہوں نے حضرت مریمؑ کو موردِ طعن و تشنیع بنایا، اور اپنے جوشِ انتقام میں، اس پیکرِ عفت و ناموس کے خلاف طرح طرح کے الزام تراشے وَقَوْلِهِمْ عَلَىٰ مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيمًا (۴/۱۵۶) یعنی ان کے نزدیک ایک راہبہ کا اس طرح کا نکاح، نکاح ہی نہیں قرار پا سکتا تھا۔ اس لیے اس کی اولاد کس طرح مستحسن نظروں سے دیکھی جا سکتی تھی۔'' [۱]

اس اقتباس کے پہلے ہی جملہ میں، لفظ ''راہبہ'' کے تحت، حاشیہ میں، ''مفکرِ قرآن'' صاحب لکھتے ہیں:

''خانقاہیت (Monasticism) کی زندگی، مذہبِ عیسویت کی ایجاد نہیں۔ اس کے آثار، اس سے پہلے یہودیوں کے ہاں بھی موجود تھے، اور مصریوں میں بھی۔ خود حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے حالات اس پر شاہد ہیں کہ یروشلم کے ہیکل (خانقاہ) میں راہب اور راہبات ہوتی تھیں۔ یہ تارک الدنیا لوگ، عبادت میں مصروف رہتے، اور انبیائے یہود کی پیشینگوئیوں کے ماتحت، ایک آنے والے مسیح کا انتظار کرتے۔'' [۲]

''مفکرِ قرآن'' کی اِس داستانِ زُور کے نتیجہ میں، چونکہ، حضرت مریمؑ، ایک راہبہ کی زندگی بسر کر رہی تھی، اور پھر چونکہ ''ایک راہبہ کی زندگی چھوڑ کر، متاہل زندگی اختیار کر لینا، مشربِ خانقاہیت میں، ارتداد سے کم نہ تھا''، اس لیے ''اس طرح کا نکاح، نکاح ہی قرار

---

[۱] شعلۂ مستور، صفحہ ۱۱۴ [۲] شعلۂ مستور، صفحہ ۱۱۴

نہیں پا سکتا تھا'' لہٰذا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت، اس پرویزی کہانی کی بدولت بھی، ویسی ہی غیر مستحسن تھی، جیسی یہود کے ہاں تھی، فرق اگر ہے، تو یہ کہ یہود نے براہ راست، مریمؑ پر الزام لگایا، اور ''مفکر قرآن'' نے، اپنی خود ساختہ کہانی کی بنا پر بالواسطہ یہی الزام عائد کیا۔

بُطلانِ داستان پر دلائلِ طاہر سورتیؒ:

بہر حال، ''مفکر قرآن'' نے، جو خود ساختہ داستان بیان کی ہے، اس کے بطلان پر دلائل قائم کرتے ہوئے، مولانا طاہر سورتی مرحوم، فرماتے ہیں:

پرویز صاحب کے اس بیان میں، بہت سی باتیں، قرآن مجید کے خلاف ہیں۔

(۱) ایک تو یہ کہ حضرت مریمؑ، راہبہ کی زندگی گذار رہی تھیں۔

(۲) ثانیاً یہ کہ راہبانیت و خانقاہیت، حضرت عیسیٰؑ سے پہلے وجود پذیر تھی۔

(۳) ثالثاً یہ کہ حضرت مریمؑ، ایسی راہبہ کی زندگی گزار رہی تھیں، جن کو ساری عمر تجرد میں گزارنا تھی۔

(۴) رابعاً یہ کہ خانقاہیت کی زندگی چھوڑ کر، عائلی زندگی گزارنے پر، یہودی انہیں موردِ طعن و تشنیع قرار دیتے تھے۔

قرآن مجید سے تو ان چاروں باتوں کا کہیں سراغ نہیں ملتا، البتہ ناقابل اعتماد تاریخی ذرائع سے شاید ان باتوں کو کسی طرح سہارا مل جائے۔ قرآن مجید تو کہتا ہے کہ جب حضرت مریمؑ کی والدہ نے اپنے پیٹ کے بچے کو، راہ خدا میں بطور نذر دے دیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی نذر کو عمدگی سے قبول فرمالیا۔

''ساتھ ہی قرآن مجید یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ، اُن ہی کی نذریں اور اعمال قبول فرماتا ہے جو حدود اللہ کے اندر رہتے ہیں، اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵/۲۷)۔ دوسری طرف قرآن مجید یہ کہتا ہے رَهْبَانِيَّةَ کو (مسلک خانقاہیت کو، جس میں تجرد کی زندگی گذاری جاتی ہے) عیسائیوں نے خود ہی

سب سے پہلے وضع کرلیا تھا۔ رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَا هَا عَلَيْهِمْ (۵۷/۲۷)۔ اس آیت سے ثابت ہے کہ رہبانیت کی بناء، سب سے پہلے عیساؤں نے ڈالی۔ اس سے قبل یہ مذہبی روایت موجود نہ تھی۔ اس آیت کے ہوتے ہوئے، حضرت مریمؑ کو راہبہ بنا دینا، جناب پرویز صاحب کی اندھی عقلیت پرستی کی کرشمہ سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر قرآن مجید، حضرت مریمؑ کی والدہ کی اس دعاء کو، جو وہ اپنی بیٹی کو نذر کرتے ہوئے مانگتی ہے، ان الفاظ میں بیان کرتا ہے۔ اِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ (۳/۳۶) ''میں اسے (مریمؑ) اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے محفوظ رکھنے کے لیے تیری پناہ میں سونپتی ہوں'' تو اس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ حضرت مریمؑ کی والدہ، انہیں قطعاً اس قسم کی راہبہ نہیں بنا رہی تھیں جو تجرد کی زندگی گزارے گی، ورنہ وہ یہ کیوں کہتی کہ میں، اِسے اور اس کی نسل کو تیری پناہ میں دیتی ہوں، صرف یہ کہتیں کہ میں اسے (مریمؑ کو) تیری پناہ میں دیتی ہوں۔'' [1]

قرآنی آیات کی اس واضح شہادت کے بعد، پرویز صاحب کی داستانِ زُور کا قلعہ، زمین بوس ہو جاتا ہے، جسے انہوں نے تسویلِ نفس کے زور پر، محرف انجیلوں اور اُن مغربی دانشوروں کی اہواء کی اتباع میں ایستادہ کر رکھا تھا، جن کی ذہنی غلامی اور فکری اسیری میں وہ مبتلا رہے ہیں، کیونکہ ازروئے قرآن، نہ تو مریمؑ راہبہ تھی، نہ ہی اُن کی والدہ کے ذہن میں، انہیں نذر کرتے وقت، یہ خیال تھا کہ وہ تجرد کی زندگی بسر کرے گی، اور اس کی اولاد نہیں ہوگی، بلکہ اس کے برعکس، اُن کی ازدواجی زندگی اور پھر اس کے نتیجہ میں اُن کی ذریت کا شعور رکھتے ہوئے ہی، وہ اپنی دعاءِ اعاذہ میں ان کا ذکر کر رہی تھی۔ نیز، نہ ہی ازروئے قرآن، اُس وقت رہبانیت کا نظام، رواج پذیر تھا، کیوں کہ نظامِ رہبانیت کی ابتداء و ابتداع، بعد میں پیروانِ مسیح کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ چنانچہ ''مفکر قرآن'' صاحب،

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۴۳ تا صفحہ ۴۴

مفہومِ آیات کے نام سے الفاظ کا جو کباڑ خانہ پیش کیا کرتے تھے، ان میں بھی، اس مسلک کو، متبعینِ عیسیٰؑ کا وضع کردہ مسلک قرار دیا گیا ہے۔

''پھر ہم نے ان کے بعد، انہی کی نہج پر، اور رسول بھی بھیجے۔ اور (سلسلۂ بنی اسرائیل میں) سب سے پیچھے، عیسیٰ ابنِ مریمؑ کو بھیجا اور اسے انجیل دی۔ جو لوگ اس کی پیروی کرتے تھے، ان کے دل میں خلقِ خدا کے لیے شفقت، اور ایک دوسرے کے ساتھ محبت اور ہمدردی کے جذبات پیدا کر دیئے (یعنی عیسےٰ کی تعلیم کا یہ نتیجہ تھا)۔ باقی رہا مسلک رہبانیت (خانقاہیت) جسے تم اس وقت ان کے ہاں مروّج دیکھتے ہو، تو اسے انہوں نے ازخود وضع کر لیا تھا۔'' [۱]

مزید برآں، لفظ اِبْتَدَعُوا کا مادہ (ب - د - ع) ہے، جس کے متعلق خود پرویز صاحب کی تحقیق یہ ہے:

''البدع - وہ کام، جو پہلے پہل ہوا ہو، اور اس سے پہلے اس کی مثال موجود نہ ہو۔ (ابن فارس) البدیع، وہ رسی جسے پہلی بار، نئے ریشہ سے بٹا گیا ہو۔ رَکِیّ بَدِیْعَۃٌ نیا کھودا ہوا کنواں۔ نواب صدیق حسن خاں نے لکھا ہے کہ جن الفاظ میں باء کے ساتھ دال آئے، ان میں ابتداء اور ظہور کا مفہوم مضمر ہوتا ہے۔'' [۲]

قدرے آگے چل کر لکھتے ہیں:

''قرآن کریم نے رہبانیت کو بدعت کہہ کر، اس کی مذمت کی ہے۔'' [۳]

ایمان — قرآن پر؟ یا غیر قرآن پر؟:

یہاں پہنچ کر، ''مفکر قرآن'' چوہدری غلام احمد پرویز کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ ایک طرف قرآن یہ کہتا ہے کہ مسلکِ رہبانیت و خانقاہیت کے

---

[۱] مفہوم القرآن، جلد۳، صفحہ۱۲۸۴   [۲] لغات القرآن، جلد۱، صفحہ۳۰۲
[۳] لغات القرآن، جلد۱، صفحہ۳۰۳

موجد عیسائی تھے، اس سے قبل، اس کا وجود تک نہ تھا، اور دوسری طرف، ''مفکرِ قرآن'' صاحب، محض اپنی نرالی اُپج کی لاج رکھنے کی خاطر، یا علماءِ مغرب کی تقلید میں، یہ کہتے ہیں کہ خانقاہیت و رہبانیت، عیسائیوں کی ایجاد نہیں بلکہ ان سے بہت پہلے یہودیوں اور مصریوں میں یہ مسلک موجود تھا۔ سوال یہ ہے کہ ایمان بالقرآن کا تقاضا کیا ہے؟ قرآن کی بات مانی جائے؟ یا غیرِ قرآن کی؟ فرمانِ خداوندی قابلِ تسلیم و اطاعت ہو؟ یا اقوالِ علماءِ مغرب؟ اگر قرآنی حقائق اور اکتشافاتِ مغرب میں تعارض و تضاد پایا جائے تو کسے قبول کیا جائے اور کسے رد کیا جائے؟ آپ جو عمل بھی یہاں اختیار کریں گے وہ آپ کے اصل ایمان واعتقاد کو ظاہر کر دے گا؟ اگر قرآن کی بات مانیں گے تو آپ کے ایمان بالقرآن کی عملاً تصدیق ہو جائے گی، اور اگر آراءِ علماءِ مغرب کو تسلیم کریں گے تو (قرآن کی بجائے) اُن پر آپ کا اعتقاد و ایمان، واضح ہو جائے گا، اور آراءِ مغرب کو شرفِ تقدم بخشنے کا آپ کا یہ عمل، اس زبانی کلامی ایمان کی تردید کر ڈالے گا جو قرآن کے بارے میں آپ ظاہر کرتے ہیں۔ فی الواقعہ، کسی انسان کا عملی رویہ ہی وہ معیار ہے، جو یہ واضح کر دیتا ہے کہ اُس کا ایمان واعتقاد، قرآن پر ہے یا غیرِ قرآن پر۔

حقیقت یہ ہے کہ جس قرآن کے واحد سند اور حجت ہونے کا ڈھنڈورا ''مفکرِ قرآن'' پیٹا کرتے تھے، اس پر ان کا زبانی کلامی ایمان ہو، تو ہو، عمل کی دنیا میں خوردبین لگا کر دیکھنے سے بھی، اس کے اثرات دکھائی نہیں دیتے۔ وہ اپنی عملی زندگی میں، قرآن کے نہیں بلکہ مغرب ہی کے پیروکار تھے۔ قرآن کے نام پر، جو کچھ وہ عمر بھر پیش کرتے رہے ہیں، وہ سب کچھ، بغیر کسی قرآن کے مغرب میں موجود ہے۔ مخلوط سوسائٹی، مخلوط تعلیم، ترکِ حجاب، مرد و زن کی مطلق مساوات (بلکہ اب اس سے بھی آگے بڑھ کر نظریۂ افضلیتِ اناث)، درونِ خانہ فرائضِ نسواں کی بجائے، انہیں بیرون خانہ مشاغل میں منہمک کرنا، تعدد ازواج کو معیوب قرار دینا، عورت کو خانگی مستقر سے اکھاڑ کر، اسے مردانہ کارگاہوں میں دھکیل دینا، خانگی زندگی میں عورت کے فطری وظائف سے منحرف کر کے، اسے قاضی و جج بلکہ

سربراہِ مملکت تک کے مناصب پر براجمان کرنا، وغیرہ جملہ امور میں سے، آخر وہ کون سا امر ہے جسے ''مفکرِ قرآن'' نے، کتاب اللہ میں سے کشید کر ڈالنے میں زحمت کشی نہ کی ہو، اور وہ، مغرب میں پہلے سے موجود نہ ہو۔ وہ، اشتراکیت، جس کا چوہا، جبلِ قرآن سے کھود نکالنے میں، ''مفکرِ قرآن'' نے بڑی کلفت اور مشقت اٹھائی ہے، وہ، ان کے ایسا کرنے سے بہت پہلے، روس وچین اور دیگر ممالک میں موجود تھی۔ ''مفکرِ قرآن'' کا اس باب میں، اصل ''اجتہادی کارنامہ'' یہ ہے کہ انہوں نے، جو کچھ بھی، مغرب کی غلامی میں پیش کیا ہے، اُسے مغرب کی اصطلاحوں میں پیش کرنے کی بجائے، اپنی اصطلاحوں میں پیش کیا ہے، وہ اشتراکیت کو پیش کرتے ہیں تو اس کے اصل نام کے ساتھ نہیں، بلکہ ''نظامِ ربوبیت'' کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ کارل مارکس کی ''جدلی مادیت'' کا فلسفہ، ان کے ہاں ''حق و باطل کی کشمکش'' قرار پاتا ہے، ''تاریخی وجوب'' کی قوت کو، وہ، ''زمانے کے تقاضے'' کہہ دیتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ زہر ہلاہل کی بوتل پر، آبِ حیات کا لیبل چسپاں کر دینے سے، زہر کی اصل حقیقت نہیں بدل جاتی۔

الغرض! قرآن کا بیان یہ ہے کہ رہبانیت و خانقاہیت کی ابتداء، عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی۔ لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب، اسے حضرت عیسیٰؑ سے بھی پہلے کا قائم شدہ مسلک قرار دیتے ہیں۔ قرآن کے مقابلہ میں، غیر قرآنی چیز کو ترجیح دینا، ''مفکرِ قرآن'' کے ایمان بالقرآن کی حقیقت کو آفتابِ نصف النہار کی طرح واضح کر دیتا ہے۔

مریمؑ پر یہود کی طعن و تشنیع کی وجہ:

حضرت مریمؑ پر، یہود کی طعن و تشنیع کی وجہ، اُن کا بلامسِ بشر، معجزانہ طور پر حاملہ قرار پانا، اور پھر بچے کو جنم دینا تھا، لیکن چونکہ ''مفکرِ قرآن'' صاحب، معجزات کے قائل نہیں رہ گئے تھے، اس لیے انہیں یہ پاپڑ بیلنا پڑا کہ ولادتِ عیسیٰ علیہ السلام کو، معمول کے مطابق، نکاح کا نتیجہ قرار دیا جائے، لیکن اس صورت میں یہ ضروری تھا کہ یہود کے مریمؑ پر طعن و تشنیع کا کوئی سبب گھڑا جائے، (کیونکہ معمول کے نکاح میں، ولادتِ فرزند پر طعن و تشنیع کا کوئی تُک

نہیں بنتا)، اس لیے یہ افسانہ تراشا گیا کہ حضرت مریمؑ نے، قوانینِ ہیکل کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، جو نکاح کیا تھا، وہ چونکہ مجاورینِ ہیکل کے نزدیک، نکاح ہی نہیں تھا، لہٰذا، اس نکاح کے نتیجہ میں پیدا ہونے والا بچہ، غیر قانونی تھا۔ اسی غیر قانونی ولادت پر، حضرت مریمؑ کو نشانۂ ملامت بنایا گیا، لیکن یہ سب کچھ، قرآن کے قطعی خلاف ہے۔

مضبوط موقف کے خلاف، انتہائی کمزور وکالت:

اس باب کے آغاز میں، پرویز صاحب کی کتاب "شعلۂ مستور" کے صفحہ ۱۱۴ سے، جو اقتباس دیا گیا ہے، اس میں یہ کہا گیا ہے کہ...... "حضرت مریمؑ، راہبہ کی زندگی گزار رہی تھیں"..... اسے مولانا طاہر سورتیؒ نے مضبوط قرآنی دلائل کی بناء پر، جب خلافِ قرآن قرار دیا، تو اِس کے جواب میں، "مصنفِ کتاب" نے، بیت العنکبوت سے بھی کمزورتر، جو وکالت فرمائی ہے، ایک نظر، اس پر بھی ڈال لیجیے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "پہلا حاشیہ، جو پرویز مرحوم کی کتاب شعلۂ مستور سے ایک اقتباس پر مشتمل ہے، اس کے متعلق عرض ہے کہ رہبانیت سے ملتی جلتی شکل، پہلے بھی رائج تھی، جیسا کہ سیموئیل ۱ باب ۱، آیت ۹:۱۱ (تورات) سے واضح ہے۔" [1]

اس بودی اور لچر وکالت کا اولین پہلو تو یہ ہے کہ زیرِ بحث مسئلہ "نفسِ رہبانیت" کا مسئلہ ہے، نہ کہ "رہبانیت سے ملتی جلتی کسی شکل کا۔" اور دوسرا ضعیف پہلو یہ ہے کہ رہبانیت کے یہود میں رواج پذیر ہونے کے ثبوت میں، تورات کے متذکرہ بالا حوالہ کے مطابق، جو اقتباس پیش کیا گیا ہے، اس میں نہ "رہبانیت" کا ذکر ہے، اور نہ ہی "رہبانیت سے ملتی جلتی کسی شکل کا۔" وہاں تو صرف نرینہ بچہ کو نذر کر دینے کا ذکر ہے، ملاحظہ فرمائیے یہ اقتباس:

> "اور جب وہ سیلا میں کھا پی چکے تو حنہ بول اٹھی، اُس وقت عیلی کا کاہن، خداوند کی ہیکل کی چوکھٹ کے پاس کرسی پر بیٹھا ہوا تھا، اور وہ نہایت دلگیر تھی،

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۵۰

سو وہ خداوند سے دعا کرنے اور زار زار رونے لگی، اور اس نے منت مانی اور کہا "اے رب الافواج! اگر تو اپنی لونڈی کو فراموش نہ کرے اور اپنی لونڈی کو فرزند نرینہ بخشے، تو میں اسے زندگی بھر کے لیے خداوند کی نذر کر دوں گی۔" [1]

ملاحظہ فرمائیے، تورات کے اس اقتباس میں، نرینہ اولاد ہی کو نذر کر دینے کا ذکر ہے۔ اب نذر کو "رہبانیت" یا "رہبانیت کی ملتی جلتی شکل" میں لے لینا، عقلاً، عرفاً، لغتاً، شرعاً، ہر لحظ سے غلط ہے، اور پھر اس غلطی سے بھی بڑھ کر غلطی یہ ہے کہ نذر بمعنی رہبانیت کے اسی غلط مفہوم کی بنیاد پر اِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَافِي بَطْنِي مُحَرَّرًا میں مذکور نذر میں، یہی معنی (رہبانیت) داخل کیا جائے، (جیسا کہ "مصنفِ کتاب" نے کیا ہے)۔ حالانکہ رہبانیت تو کبھی بھی، کسی حال میں بھی، کسی پیغمبر کی تعلیم میں بھی، اور کسی آسمانی دین میں بھی، جائز نہیں رہی، جبکہ نذر اور منّت، ہر آسمانی شریعت میں مشروع رہے ہیں۔ سورۃ الحج میں، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں کو حج بیت اللہ کے لیے بلائیں، تاکہ وہ، یہاں آکر، (مناسک حج کے ساتھ ساتھ) اپنی نذریں پوری کریں، اور اس آزاد وقدیم گھر کا طواف کریں وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ اب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام لوگوں کو خانہ کعبہ میں اس لیے بُلا رہے تھے کہ وہ، یہاں آکر "رہبانیت" اختیار کریں؟ اَعَاذَنَا اللّٰهُ مِنْ تِلْكَ الْخُرَافَاتِ.

بھونڈی وکالت کا ایک اور پہلو:

پرویز صاحب کے اسی متذکرہ بالا اقتباس میں (جو شعلۂ مستور صفحہ ۱۱۴ سے ماخوذ ہے) یہ بھی کہا گیا ہے کہ...... "آپ (مریمؑ) کو خدا کی طرف سے اشارہ ملا کہ انہیں متاہل زندگی بسر کرنا ہوگی"...... مولانا طاہر سورتی مرحوم نے اس پر نقد کرتے ہوئے فرمایا:

"کیا ہی اچھا ہوتا کہ پرویز صاحب، حوالہ دے دیتے کہ کس کتاب میں، اللہ نے، حضرت مریمؑ کو یہ اشارہ کیا تھا۔ بہرحال، ہم آپ کو بتاتے ہیں کہ یہ

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۵۰

قرآن میں ہے، نہ انجیل میں۔ یہ پرویز صاحب کی من گھڑت بات ہے اور حیرت ہے کہ پرویز صاحب اپنے دل کی بات کو خدا کی طرف منسوب کرنے کی جسارت کر رہے ہیں؟ اس سے اگلی عبارت محض لفاظی ہے۔" [1]

اس پر "مصنفِ کتاب" فرماتے ہیں:

"طاہر سورتی تھوڑا سا غور کر لیتے تو اس اشارے کا سراغ، سورہ آل عمران کی آیات ۴۲، ۴۶ میں مل جاتا ...... سورہ آل عمران کی آیت ۴۴ میں ہے **وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ** اور (اے رسول!) تو اس موقع پر ان کے پاس موجود نہ تھا جب وہ قرعہ اندازی کے ذریعے یہ طے کر رہے تھے کہ ان میں سے کون مریم کی کفالت کرے گا، اور تو اس موقع پر بھی، ان کے پاس نہ تھا جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے۔ (ترجمہ طاہر سورتی مرحوم)

یہ قرعہ اندازی اور یہ جھگڑنے والے کون تھے؟ یہ اس عبادت گاہ کے مجاور تھے۔ کیا اس وقت حضرت مریمؑ عبادت گاہ میں تجرد کی زندگی نہیں گزار رہی تھیں؟ ان دنوں ہی ملائکہ نے حضرت مریمؑ سے کہا تھا "بے شک اللہ تجھے اپنی طرف سے ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے، اس کا نام مسیح ابن مریم ہوگا۔ **اذ قالت الملائكة يمريم ان الله يبشرك بكلمة منه اسمه المسيح عيسى ابن مريم**۔" [2]

سوال یہ ہے کہ اس آیت میں یہ "اشارہ" کہاں اور کن الفاظ میں مذکور ہے کہ...... "مریم تجرد کی زندگی چھوڑ کر شادی کریں گی اور پھر اس شادی کے نتیجہ میں ایک نبی کی والدہ بنیں گی" ...... یہاں تو صرف اور صرف بشارت پسر ہی مذکور ہے لیکن اس "اشارہ" کے اثبات کے لیے، قرآنی مفہوم میں، "مصنفِ کتاب"، اپنے وہم وگمان پر مشتمل الفاظ

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۴۳ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۵۱ تا صفحہ ۵۲

کا یہ پھانہ ٹھونکتے ہیں:

"کیونکہ بچہ کی پیدائش کا مطلب سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ وہ تجرد کی زندگی چھوڑ کر شادی کریں گی، اور اس شادی کے نتیجہ میں، وہ، ایک نبی کی والدہ بنیں گی۔" ۱؎

پہلے سے اپنے ذہن میں راسخ کیے ہوئے تصورات کو "ثابت" کرنے کے لیے، قرآنی مفاہیم میں، اس قسم کے اضافی اور الحاقی الفاظ کو گھسیڑتے ہوئے، آخر وہ کون سا باطل نظریہ ہے، جسے قرآن سے برآمد نہیں کیا جا سکتا۔ اِن الکاذب قد یصدق ۔ کیا ہی سچی بات ہے جو کبھی پرویز صاحب کے قلم سے بایں الفاظ نکل گئی تھی۔

"جب کوئی قرآن کو مسخ کرنے پر اتر آئے تو اُسے، اس سے اپنی کون سی مصلحت کی سند نہیں مل سکتی۔" ۲؎

"مصنفِ کتاب" کا بے جا استفسار:

حضرت مریمؑ، صغیر السن ہی تھیں، کہ ان کی والدہ نے، اپنی نذر کے مطابق، انہیں سپرد ہیکل کر دیا، اس پر "مصنفِ کتاب"، یہ استفسار فرماتے ہیں کہ...... "کیا اُس وقت، حضرت مریمؑ، تجرد کی زندگی نہیں گزار رہی تھیں؟"...... موصوفِ محترم کا خیال ہے کہ کم سنی ہی میں حضرت مریمؑ کی شادی کر ڈالنے کے بعد، انہیں وقفِ ہیکل کرنا چاہئے تھا۔ یہ بے جا استفسار ایسا ہی ہے، جیسا کسی کم عمر بچے کے معتکف ہو جانے پر، یہ کہا جائے کہ... "کیا وہ حالت اعتکاف میں، تجرد کی زندگی نہیں گزار رہا ہے؟"

اب "مصنفِ کتاب" کو یہ کون سمجھائے کہ اُس زمانے میں رواج یہ تھا کہ نذر کیے جانے والا بچہ، بالغ ہونے تک ہیکل ہی میں رہتا تھا۔ پھر اسے بالغ ہونے پر یہ اختیار حاصل تھا کہ چاہے تو ہیکل میں اپنی اقامت برقرار رکھے اور چاہے تو فارغ ہو جائے، اگر وہ، اقامت پذیر ہونے کی بجائے، کوچ کرنا چاہتا تو ایسا کرنے کا مختار و مجاز تھا، لیکن اگر اس کا

۱؎ ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی ۔ صفحہ ۵۲ ۲؎ طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۷۹ء، صفحہ ۱۳

فیصلہ اقامت ہی کے حق میں ہوتا تو پھر اُس سے ہمیشہ کے لیے ترکِ اقامت کا اختیار سلب ہو جاتا، جیسا کہ تفسیر الکبیر میں مذکور ہے:

> کان المحرر یجعل فی الکنیسة یقوم بخدمتها حتی یبلغ الحلم، ثم یخیر بین المقام والذهاب، فان ابی المقام واراد ان یذهب ذهب، وان اختار المقام فلیس له بعد ذالك خیار، ولم یکن نبی الا ومن نسله محرر فی بیت المقدس۔ [1]

> ''آزاد شدہ فرد، خدمتِ کنیسہ کے لیے، بالغ ہونے تک کنیسہ ہی میں رہائش پذیر رہتا۔ پھر (بالغ ہونے پر) اُسے وہاں رہنے یا نہ رہنے کا اختیار حاصل تھا، اگر وہ اقامت کی بجائے، جانا چاہتا تو چلا جاتا، لیکن اگر وہ، وہاں ہی رہنا پسند کرتا، تو آئندہ، ترکِ معبد کے اختیار سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو جاتا، اور کوئی نبی ایسا نہیں گزرا جس کی نسل میں سے کوئی نہ کوئی بیت المقدس کی خدمت کے لیے آزاد (اور وقف) نہ رہا ہو۔''

قرآنی مفاہیم میں، اپنے تصورات کو گھسیڑتے ہوئے، اور جناب طاہر سورتی صاحب کے معقول و مضبوط دلائل کو رکیک و خسیس تاویلات کے ساتھ رد کرتے ہوئے، ''مصنفِ کتاب'' کا ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے باطل موقف کی حمایت کرتے چلے جانا، اُن کا خود اپنی امانت و دیانت کا جنازہ پڑھنے کے مترادف ہے۔ یہ طرزِ عمل، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ان لوگوں کا ایمان و یقین، قرآن کریم پر نہیں، بلکہ غیر قرآنی معتقدات پر ہے، ولادتِ مسیحؑ کی بابت، پرویز صاحب، خود لکھتے ہیں:

> ''اس (قرآن) میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔'' [2]

خیر یہ فیصلہ تو اُن نیک نیت اہل ایمان کے ہاں (جو قرآن سے ہدایت لینے کے متمنی

---

[1] تفسیر الکبیر، جلد ۸، صفحہ ۳۷ [2] شعلۂ مستور، صفحہ ۱۰۵

ہیں، نہ کہ الٹا اُسے ہدایت دینے کے) ہو ہی چکا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، معجزانہ ولادت تھی یا عام معمول کا واقعہ تھی، (اور اسی باب میں، آئندہ بھی یہ بحث، قرآنی تصریحات کے ساتھ آرہی ہے)۔ لیکن یہاں جو بات، قابلِ غور اور باعثِ صد حیرت و استعجاب ہے، وہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر، قرآن کریم کی طرف سے اثباتاً یا نفیاً، عدم تصریح کے دعوائے پرویز کے بعد بھی، اگر "مفکر قرآن" صاحب، انہیں "ابن یوسف" قرار دیتے ہیں، تو پھر یہ نظریہ، خارج از قرآن، کسی ماخذ ہی سے ہتھیایا ہوا نظریہ قرار پا سکتا ہے، کیونکہ "قرآن میں تو، باپ کے ذریعہ یا بلا باپ، ولادتِ عیسیٰؑ کی تصریح نہیں ہے"، اور امر واقعہ بھی یہی ہے کہ یہ لوگ، نام تو قرآن ہی کا لیتے ہیں، لیکن اپنے نظریات و معتقدات، غیر از قرآن، مآخذ سے لیتے ہیں۔ پھر لطف یہ کہ پرویز صاحب، یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

> "قرآن کریم میں کسی اور رسول کی پیدائش، ذاتی کوائفِ حیات اور زندگی کے آخری مراحل کے متعلق، اس شرح و بسط سے تذکرہ نہیں آیا، جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آیا ہے۔" [1]

لیکن "منکرین حدیث کے سرخیل، اور حسبنا کتاب اللہ کے باطل دعویٰ دار "مفکر قرآن" کی چشمِ بصارت، اس "شرح و بسط" کے باجود، قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کی "باپ کے ذریعہ یا بلا باپ پیدائش" کی تصریح نہیں پاتی، لیکن ان کی "قرآنی بصیرت"، خارج از قرآن مآخذ سے ابن مریم کا باپ ڈھونڈ نکالتی ہے۔

مسلک رہبانیت اور تاریخی حقائق:

قرآن کریم کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے، (یا اسے اپنی تحریفات کا نشانہ بناتے ہوئے) "مفکر قرآن" نے جو یہ موقف اختیار کیا کہ مسلکِ رہبانیت، یہودیوں میں، قبل از ولادتِ مسیحؑ موجود تھا، اس کی تردید، قرآن کی روشنی میں جناب طاہر سورتی صاحب نے کی، اور پرویز صاحب کے لیے، یہ کہہ کر، اقتباساتِ علماءِ مغرب بھی پیش کیے:

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۱۳ تا صفحہ ۱۴

''اس مقام پر، ہم قارئین سے معذرت کرتے ہوئے، دل پر پتھر رکھ کر، چند غیر قرآنی حوالے، محض پرویز صاحب کے لیے، بطور سند پیش کر رہے ہیں۔ ہمارے لیے تو قرآن کی تصریح کے بعد، کسی حوالہ کی کوئی اہمیت ہی نہیں۔ بہر حال، ان چند حوالوں سے آپ کو قرآن کی تصریح کی تائید ہی ملے گی، اور وہ یہ کہ یہودیوں میں رہبانیت کا تصور موجود ہی نہ تھا۔

(۱) انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس، جلد۴، کالم ۱، صفحہ ۹۷، مصنف جیمز ہیسٹنگز

عنوان، (Asceticism - ترکِ دنیا، رہبانیت، مسلکِ خانقاہیت)۔

رہبانیت کے لیے، یہودیت میں کوئی مقام نہیں ہے، کیونکہ اس کا دارومدار، ایمان باللہ اور میثاق باللہ پر ہے، دراصل، میثاق کے تصور نے رہبانیت کے تصور کو ناممکن کر دیا تھا۔'' [1]

....

(۲) سٹینڈرڈ جیوئش انسائیکلو پیڈیا، صفحہ ۱۷۵، کالم ۱، مصنفہ سیسل رُوتھ۔

عنوان Asceticism

یہودیت کا بنیادی مزاج رہبانیت کے خلاف ہے؛ کیونکہ اس کی رو سے تمام اشیاء سے استفادہ کرنے میں خیر ہے، بشرطیکہ یہ استفادہ مناسب حدود و قیود میں منحصر رکھا جائے۔'' [2]

....

(۳) این انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن، صفحہ ۴۱، کالم ۱، مصنفہ ورجلیس فرم

---

[1] + [2] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۴۷ تا صفحہ ۴۸

عنوان Asceticism

رہبانیت، یہودیت کے مزاج کے منافی تھی، اور یہ نتیجہ غیر فطری بھی نہیں تھا، کیونکہ رہبانیت میں روح اور جسم کی .... ثنویت کا قائل ہونا پڑتا ہے۔'' ۱

....

(۴) این انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنس، صفحہ ۳۸، کالم ا، مصنفہ کینی

عنوان Asceticism

رہبانیت کو یہودی مذہب میں کوئی نمایاں مقام حاصل نہیں تھا۔

بحوالہ ریلیجن ان دی میکنگ (مصنفہ ایس جی اسمتھ)۔'' ۲

نامعقول تردید:

یہ چاروں حوالے، اس واحد حوالہ سے کہیں زیادہ مستند ہیں، جسے پرویز صاحب نے، یہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیا ہے کہ رہبانیت و خانقاہیت قبل از ولادتِ مسیحؑ، یہودیوں اور مصریوں میں رائج تھی۔ ان چاروں حوالوں کو رد کرنے کے لیے، ''مصنفِ کتاب'' (پہلے تو) یہ فرماتے ہیں:

''قرآن اور تورات سے حوالوں کے بعد، اصولی طور پر، ان حوالوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔'' ۳

ہم حیران ہیں کہ قرآن کا وہ کون سا حوالہ ہے جس کی موجودگی میں، طاہر سورتی مرحوم کے پیش کردہ، ان ''حوالوں کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہتی۔'' نہ ایسا کوئی قرآنی حوالہ، پرویز صاحب ہی نے پیش کیا ہے، اور نہ ہی ''مصنفِ کتاب'' نے۔ بلکہ قرآن، تو الٹا یہ کہتا ہے کہ رہبانیت و خانقاہیت، ایجادِ نصرانیت ہے، جبکہ گواہِ چست، اپنے مدعیٔ سست کی تقلید میں (لیکن قرآن کریم کی مخالفت میں) یہ فرماتے ہیں کہ یہ مسلک، عیسائیوں سے قبل، یہودیوں

---

۱ + ۲ ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۴۸ ۳ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۵۷

اور مصریوں میں رواج پذیر تھا۔

اب رہا تورات کا حوالہ، تو اس کا مفہوم اگر درست بھی ہو، تب بھی، وہ نا قابل اعتماد اور تحریف شدہ کتاب ہے، خود پرویز صاحب لکھتے ہیں:

"تاریخی اعتبار سے بھی یہ مجموعے، اس قدر نا قابل اعتماد ہیں کہ خود عیسائی مورخین و محققین، ان کے بیانات پر بھروسہ نہیں کرتے۔" ۱؎

"خود عیسائی مورخین و محققین، بھروسہ نہیں کرتے" لیکن "مفکر قرآن" صاحب اور ان کے مقلدین اس کے سوا کوئی چارۂ کار ہی نہیں پاتے۔

اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہرحال، انہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا (اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے)۔" ۲؎

ایک اور قابل غور پہلو:

یہاں ایک اور پہلو بھی قابلِ غور ہے۔ احادیث کا ذکر ہو، تو یہ لوگ یہ کہہ دیا کرتے ہیں کہ "جو حدیث، قرآن کے مطابق ہو، اسے ہم سر آنکھوں پر جگہ دیتے ہیں۔" حدیثِ رسول ؐ ہی نہیں، بلکہ ہر فکر اور ہر نظریہ کے بارے میں (خواہ وہ کسی کافر کا پیش کردہ ہو، یا مسلمان کا)، ان لوگوں کا یہ اعلان ہوتا ہے۔

"ہمارے نزدیک، دین کا معیار، فقط کتاب اللہ ہے۔ جو عقیدہ یا تصور اس کے مطابق ہے، وہ صحیح ہے، اور جو اس کے مطابق نہیں، وہ بلا تامل و تذبذب، غلط اور باطل ہے، خواہ اس کی تائید میں ہزاروں حدیثیں بھی ایسی کیوں نہ پیش کر دی جائیں، جس کے راویوں میں جبرائیل اور میکائیل تک کا نام بھی شامل کر دیا گیا ہو۔" ۳؎

نظریہ و عقیدہ ہی نہیں، بلکہ عمل کی جولان گاہ میں بھی، خواہ کسی بھی حرکت و عمل کے

۱؎ شعلہ مستور، صفحہ ۱۴ ۲؎ شعلۂ مستور، صفحہ ۹۸

۳؎ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۵۳ء، صفحہ ۳۷

بارے میں بات ہو، تب بھی واحد کسوٹی قرآن ہی ہے۔

"ہر معقول بات، خواہ وہ ابو حنیفہ کی ہو یا کارل مارکس کی، اگر قرآن کی کسوٹی پر سچی ثابت ہوتی ہے، تو اسے قبول کرنے میں عار نہ ہونی چاہیئے۔" [1]

لیکن قرآن کو واحد کسوٹی اور واحد معیار قرار دینے والے، یہاں، قرآن کے اس بیان کو پسِ پُشت ڈال رہے ہیں کہ مسلکِ رہبانیت و خانقاہیت کی ابتداء و ابتداع، عیسائیوں کے ہاتھوں ہوئی تھی، اور مغربی محققین کی اس بے سروپا بات کو سر آنکھوں پر رکھ رہے ہیں کہ یہ مسلک، قبل از ولادتِ مسیحؑ، یہودیوں اور مصریوں میں رائج تھا۔

اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان لوگوں کے نزدیک، سند و حجت، قرآن ہے یا غیر قرآن؟ یہ لوگ خدا پرست ہیں، یا ہوا پرست؟ یہودیوں اور مصریوں میں مشربِ خانقاہیت کو تسلیم کرنا، اتباعِ خالقِ کائنات ہے یا اتباعِ مخلوق اور وہ بھی کافر و مشرک مخلوق؟

تردید کا دوسرا پہلو:

جناب طاہر سورتیؒ کے پیش کردہ چاروں حوالوں کو، قرآن اور تورات کے بالمقابل، "کوئی قدر و قیمت" نہ دینے کے بعد، اب اس نامعقول تنقید کا دوسرا پہلو ملاحظہ فرمائیے، جس میں "ڈوبتے کو تنکے کا سہارا" کا مصداق بنتے ہوئے، "مصنفِ کتاب" فرماتے ہیں:

"تاہم چوتھے حوالے سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہودی مذہب میں رہبانیت پائی جاتی تھی مگر وہ نمایاں حیثیت کی حامل نہ تھی۔" [2]

اعلم الناس بالقرآن کے زعم میں مبتلا، ان لوگوں کی ہوا پرستی کا یہ عالم ہے کہ ان کی خواہش کے مطابق، کوئی تصور، اگر یہودیوں کے ہاں سے بھی مل جائے (خواہ وہ کتنا ہی بے اصل و بے سروپا کیوں نہ ہو) تو یہ لوگ، اُسے، لپک کر ہاتھوں ہاتھ لے لیتے ہیں۔ لیکن اگر خلافِ خواہش، کوئی چیز، قرآن بھی پیش کرے، تو وہ، ان حضرات کے لیے قطعی ناقابلِ قبول ہوتی ہے۔ كُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوٰىٓ اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ اب

---

[1] طلوعِ اسلام، دسمبر ۱۹۶۳ء، صفحہ ۷۵ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۵۷

یہاں دیکھئے کہ قرآن مجید، صراحت کے ساتھ، یہ بیان کرتا ہے کہ رہبانیت کے اولین موجد، پیروانِ مسیح تھے۔ رَهْبَانِيَّةَ نِ ابْتَدَعُوهَا ...... اور ابتداع کا معنیٰ ''کسی نئی چیز کو گھڑنا'' ہوتا ہے۔ خود پرویز صاحب کے اقتباسات، اس سے پہلے پیش کیے جا چکے ہیں، لیکن تنہا قرآن ہی کو واحد سند اور حجت ماننے کے دعوے دار، قرآنی حقیقت کو دیوار پر مارے دے رہے ہیں، اور خواہشاتِ نفسانیہ کے ہاتھوں، ولادتِ عیسیٰؑ کی تراشی ہوئی کہانی کو، صحیح باور کروانے کے لیے، اناجیل و کتبِ اعداءِ اسلام پر بھروسہ کر رہے ہیں۔ اب، اگر یہی ایمان بالقرآن ہے، تو پھر نمعلوم کفر بالقرآن، کس بلا کا نام ہے؟

منکرینِ حدیث و معجزات کے اس طرزِ عمل سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ، خالی الذہن ہو کر بارگاہِ قرآن میں نہیں آتے، بلکہ اپنے قلب و دماغ میں پہلے سے رچے بسے افکار و نظریات کی تائید و حمایت کے لیے قرآن کی ورق گردانی کرتے ہیں، اور ایسا کرتے ہوئے، قرآنی حقائق کو روند ڈالنے میں بھی، انہیں کوئی جھجک محسوس نہیں ہوتی۔ کھینچ تان کے ذریعہ، قرآنی حقائق کو، اپنے ذہنی مزعومات پر منطبق کرنا، ان کا عام شیوہ ہے۔ مہمل موشگافیوں، بیجا نکتہ آفرینیوں، خسیس و رکیک تاویلوں کے ذریعہ، قرآن مجید سے وہ سب کچھ ''ثابت کر ڈالنا''، ان غلام فطرت لوگوں کا معمول ہے، جسے اہلِ مغرب، بغیر کسی قرآن کے، پہلے ہی سے اپنائے ہوئے ہیں۔ لیکن یہ سب کچھ کرتے ہوئے، فریب دہی یا فریب خوردگی کے ساتھ، بڑی بلند آہنگی کے ساتھ، اس قسم کے اعلانات بھی کرتے ہیں:

> ''اگر کوئی شخص، کسی خاص نظریہ یا تصور کو ذہن میں لے کر، قرآن کی طرف اس لیے آتا ہے کہ اسے، اس سے اپنے نظریہ یا تصور کی تائید مل جائے تو اسے قرآن کی بارگاہ سے ایسی پھٹکار پڑتی ہے جو اس کے لیے ہر دو جہاں میں وجہ روسیاہی ہوتی ہے۔ قرآن کو اپنے خیالات کے تابع رکھنا شرک عظیم ہے۔ یہ اپنا دروازہ اس کے لیے کھولتا ہے جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے ساتھ، خالی الذہن ہو کر، اس کے آستانِ عالیہ پر دستک دے۔''[1]

---

[1] طلوع اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۷

پرویز صاحب کے لٹریچر کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے والے، ہر شخص پر یہ حقیقت عیاں ہے کہ جن باتوں کی وہ دوسروں کو تلقین کیا کرتے ہیں، خود ان کا اپنا دامن، ان سے خالی ہوتا ہے، اور قرآن سے استہداء کی دعوت دیتے ہوئے، ان کا اپنا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ قرآن سے ہدایت لینے کی بجائے، الٹا اسے ہدایت دیا کرتے ہیں، وہ اپنے افکار و نظریات کو، قرآن کے تابع رکھنے کی بجائے، الٹا قرآن کو اُن کے تابع رکھا کرتے ہیں۔ وہ خالی الذہن ہو کر، بارگاہِ قرآن میں آنے کی بجائے، مغربیت اور اشتراکیت کے تصورات کو دل و دماغ میں راسخ کر کے وارد ہوا کرتے ہیں، لیکن، اپنی خوبصورت عبارتوں کی آڑ میں، الفاظ کا جادو جگاتے ہوئے، یہ اعلان کرنا، ان کا معمول رہا ہے کہ:

> ''میں، برادرانِ عزیز! پوری دیانتداری سے عرض کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ میں نے قرآن مجید کو اس طرح سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی۔ میں اسے شرک سمجھتا ہوں.......... میرے فہم قرآنی میں، کہیں غیر شعوری طور پر، میرے خیالات کی آمیزش ہو گئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا، لیکن میں نے دانستہ کبھی ایسا نہیں کیا۔ یہ اس لیے کہ اس کے لیے میں اپنے آپ کو خدا کے ہاں جواب دہ سمجھتا ہوں۔ ذمہ داری کا یہی شدید احساس ہے، جس سے میری کیفیت یہ ہوتی ہے کہ میں قرآن کے متعلق جب بھی کچھ کہنے کے لیے لب کشائی کرتا ہوں یا کچھ لکھنے کے لیے قلم اٹھاتا ہوں تو میرا دل لرز جاتا ہے، میری روح پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔'' [1]

میں جب پرویز صاحب کے اس طرح کے اقوال و اقتباسات کو، ان کی سیرت و کردار کے ساتھ ملا کر دیکھتا ہوں، تو انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں کہ اس ''مفکرِ قرآن'' میں کس قدر تضاد پایا جاتا ہے۔ عام ناظرین کرام، اگر پرویز صاحب کی ''پوری دیانتداری'' کو ملاحظہ فرمانا چاہیں، تو انہیں میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے

[1] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۶۸ء، صفحہ ۱۸

میں'' کا مطالعہ کرنا چاہیے، اس سے انہیں اندازہ ہوگا کہ وہ، اپنے آپ کو خدا کے ہاں کس قدر جوابدہ سمجھا کرتے تھے، اور یہ کہ انہیں، ذمہ داری کا کس قدر شدید احساس تھا، اور حقائق بیان کرنے میں، ان کا دل کس قدر لرزا کرتا تھا، اور ان کی روح پر، کس قدر کپکپی طاری ہوا کرتی تھی۔

اب اسی زیرِ بحث، ولادت مسیحؑ کے مسئلہ میں، ان کا یہ اقتباس بھی ملاحظہ فرمائیے:

''باقی رہا یہ کہ ہم اپنے ذہن میں پہلے ایک عقیدہ قائم کر لیں اور پھر اس کے تائیدی شواہد تلاش کرنے کے لیے قرآن کریم کی ورق گردانی کریں، تو یہ ''تدبر فی القرآن'' کا ایسا غلط طریقہ ہے جسے درحقیقت تدبر فی القرآن کہنا ہی غلط ہے۔ قرآن کریم کو اپنے خیالات وتصورات کے تابع لے آنا، بہت بڑی جسارت ہے۔ اس سے دلوں پر مہریں لگتی اور آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کریم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنے کی کوشش کیجیے۔ اس کے بعد، اگر ایسی باتیں سامنے آئیں جو سردست آپ کی سمجھ میں نہیں آتیں تو قرآنی حقائق کو کھینچ تان کر اپنی عقل کے قالب میں ڈھالنے کی سعیٔ ناکام نہ کیجیے بلکہ قرآنی حقائق کو اپنی جگہ محکم اور اٹل سمجھتے ہوئے انتظار کیجیے تاآنکہ مزید تحقیق وتدبر آپ کی عقل میں اتنی وسعت پیدا کر دے کہ اس میں قرآنی حقائق سما سکیں۔ اگر قرآن کریم کا یہ ارشاد ہو کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بغیر باپ کے ظہور میں آئی تھی تو بلا تامل ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ہم ہر لحہ بدلنے والی عقل کی خاطر، نہ بدلنے والے حقائق کو رکیک تاویلات سے موڑ توڑ نہیں سکتے، اور اگر قرآن کریم اس طرف لے جائے کہ آپ کی پیدائش عام انداز کے مطابق ہوئی تھی، تو محض اس لیے کہ اس سے ایک ایسے عقیدہ کی تردید ہوتی ہے جو ہم میں ایک عرصہ سے متوارث چلا آ رہا ہے، بے معنی نکتہ آفرینیوں اور دور از کار موشگافیوں کی سعیٔ لاحاصل بھی خود فریبی سے زیادہ نہیں۔ ہمارے تمام رجحانات اور

معتقدات، قرآن کے تابع ہونے چاہییں اور بس۔" ۱؎

آیئے! اب اس بات کا جائزہ لیں کہ ولادتِ عیسیٰؑ کے معاملہ میں، پرویز صاحب، اپنے عقائد و تصورات کو، قرآن کے تابع رکھتے ہیں یا نہیں۔

اس ضمن میں، انہوں نے جو کچھ بھی لکھنا تھا، وہ شعلہ مستور میں لکھ چکے ہیں، کیونکہ باقی ہر جگہ وہ یہی فرماتے ہیں کہ جسے تفصیل درکار ہو، وہ شعلۂ مستور کی طرف رجوع کرے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسئلہ زیر بحث میں، ان کے افکار و نظریات کی آخری ترجمان ،یہی کتاب ہے۔ اس کتاب میں، وہ لکھتے ہیں کہ:

"اس (قرآن) میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بغیر باپ کے ہوئی تھی، نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔" ۲؎

اب جبکہ قرآن سے بالتصریح یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ حضرت عیسیٰؑ، بن باپ، پیدا ہوئے تھے، یا باپ کے ذریعہ، تو اس کا لازمی اور منطقی تقاضا یہی قرار پاتا ہے کہ مکمل سکوت اختیار کیا جائے۔ نہ اس بات پر زور دیا جائے کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے، اور نہ ہی اس بات پر کہ وہ باپ کے ذریعہ متولد ہوئے۔ علمی دیانت بھی اسی خاموشی کو لازم ٹھہراتی ہے۔ قرآن کریم کے ایک مخلص، اور خدا ترس طالب علم کے لیے، صرف اور صرف، یہی رویہ شایانِ شان ہے، نیز تقویٰ و پرہیز گاری کے لحاظ سے عافیت بھی، اسی طرزِ عمل میں ہے...... لیکن ...... ہمارے "مفکر قرآن" صاحب، نہ تو قرآن کی حدود میں رہنا پسند کرتے ہیں (کہ آزادی، انسان کا "بنیادی حق" ہے، جس سے محروم ہونا انہیں پسند نہیں)، اور نہ ہی سکوت و خاموشی اختیار کرنا چاہتے ہیں (کہ ایسا کریں تو ان کی عقل عیار، بیکار اور ان کا شغلِ قلمکاری، تعطل کا شکار ہوکر رہ جاتے ہیں)، اس لیے وہ خود کو مجبور پاتے ہیں کہ قرآنی "اغلال و اصر" سے آزاد ہوکر، دنیاءِ مغرب کے اسلام دشمن "محققین" (مثل رینان وغیرہ) کی اتباع میں، ابن مریمؑ کو "ابن یوسف" بنا ڈالیں۔ اور پھر اپنی بے معنیٰ نکتہ آفرینیوں،

۱؎ شعلۂ مستور، صفحہ ۹۷ تا صفحہ ۹۸ ۲؎ شعلۂ مستور، صفحہ ۱۰۵

دُور از کار موشگافیوں اور خسیس و رکیک تاویلات کے ذریعہ، اپنی ہر لمحہ بدلنے والی عقل عیار کی خاطر، قرآن کریم کے محکم اور اٹل حقائق کو توڑا مروڑا جائے، پھر حرام ہے جو کبھی ''مفکر قرآن'' صاحب یہ سوچیں کہ قرآنی حقائق کی شکست و ریخت کے نتیجہ میں، معارف القرآن جلد سوم میں، اس مبحث پر جو کچھ وہ لکھ چکے ہیں، اس کے ساتھ، قدم قدم پر تضادات و تناقضات کا کس قدر وسیع و عریض خارزار پیدا ہو رہا ہے۔ بس اب ان کے قلب و ذہن پر ایک ہی دھن سوار ہے کہ واقعۂ ولادتِ مسیحؑ سے معجزانہ پہلو کو زائل کر دیا جائے، خواہ اس کے لیے ترجمۂ آیات اور مفہوم قرآن میں مسخ و تحریف سے کام لینا پڑے، یا قواعدِ زبان کو پسِ پشت ڈالنا پڑے یا بین القوسین اضافی الفاظ کے ذریعہ مدلولاتِ آیات کا حلیہ بگاڑنا پڑے، اُن کی بلا سے۔

دریا کو اپنی موج کی طغیانیوں سے کام
کشتی کسی کی پار ہو یا درمیاں رہے

قرآن بمقابلہ مغربیت اور زاویۂ پرویز:

یہاں ''مفکر قرآن'' صاحب کے ''قرآنی ذوق'' اور علمی مزاج کا یہ پہلو بھی، قارئین کرام سے مخفی نہیں رہنا چاہئے کہ قرآنی تصریحات اور مغربی تحقیقات میں، جب تعارض واقع ہو جاتا ہے تو ان کے نزدیک، قرآنی تصریحات کی بجائے، مغربی تحقیقات ہی شرفِ قبولیت کا مستحق قرار پاتی ہیں۔ اس کے لیے، ان کی دلیل یہ ہوا کرتی ہے کہ ہمارے ہاں تو جمود ہی جمود اور تقلید ہی تقلید ہے، تحقیق و ریسرچ کا کام تو ہے ہی نہیں، یہ تو مغرب ہی میں پایا جاتا ہے، لہٰذا، تحقیقاتِ مغرب کی طرف رجوع ناگزیر ہے۔

''ایک جنسیات ہی پر کیا موقوف ہے۔ زندگی کے اور کون سے شعبے ہیں جن کے متعلق ہمارے ہاں کوئی ریسرچ ہوئی ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ جس قوم پر صدیوں سے سوچنا حرام ہو چکا ہو، اور تقلید کہن، زندگی کی محمود روش قرار پا چکی ہو، ان میں فکری صلاحیتیں بہت کم باقی رہ جاتی ہیں، لہٰذا ہمیں اس مقصد کے

لیے مغرب ہی کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔'' [1]

اس اقتباس سے قارئین کرام یہ نہ سمجھیں کہ پرویز صاحب، تقلید سے بیزار تھے، ایسا ہرگز نہیں تھا، وہ بڑے پختہ مقلد تھے، اور انتہائی جامد اور اندھی تقلید میں مبتلا تھے، فرق صرف یہ ہے کہ وہ تقلیدِ کہن کی بجائے تقلیدِ نو پر قائم تھے۔ وہ تقلید قدیم پر خوب برسا کرتے تھے مگر تقلید جدید کا التزام کیا کرتے تھے۔ امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ بن حنبل کی تقلید کی سخت مخالفت (بلکہ مذمت) کیا کرتے تھے۔ مگر ''امام'' کارل مارکس، ''امام'' ماوزے تنگ، ''امام'' چارلس ڈارون اور ''امام'' رینان کی تقلیدِ جامد پر ڈٹے ہوئے تھے، اور وہ بھی اس حد تک کہ اگر کہیں قرآن اور ائمۂ مغرب کے موقف میں (Tie) پڑ جاتی تو وہ مغرب ہی کے اماموں کی پیروی کو ترجیح دیتے ہوئے، قرآن کریم کو چھیل چھال کر، مطابقِ مغرب بنانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ قرآنی تصریحات کو وہ اپنی اُس ''عقلِ عیار'' کی کسوٹی پر پرکھا کرتے تھے جو مغربیت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، اور جسے وہ، اپنی ''قرآنی بصیرت'' کا نام دیا کرتے تھے، اس کی متعدد مثالوں میں سے ایک مثال یہ ہے کہ قرآن، صراحت کے ساتھ، حضرت نوح علیہ السلام کی عمر ۹۵۰ سال بتاتا ہے وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوحًا اِلٰی قَومِهٖ فَلَبِثَ فِيهِمْ الف سنةٍ اِلَّا خمسين عَامًا ۔ اس کا صحیح ترجمہ خود پرویز صاحب ہی کے قلم سے ملاحظہ فرمائیے:

''ہم نے نوحؑ کو اُس کی قوم کی طرف بھیجا، اور وہ ان میں پچاس برس کم ہزار سال رہا۔'' [2]

لیکن اب ''مفکر قرآن'' صاحب کی ''قرآنی بصیرت'' کو اتنی لمبی عمر پر استبعاد محسوس ہوتا ہے، چنانچہ وہ اس کثیر العمری کو قصیر العمری میں بدل ڈالنے کے لیے، جو پاپڑ بیلتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے:

---

[1] سلیم کے نام، جلد سوم، صفحہ ۱۴۰

[2] معارف القرآن، جلد ۲، صفحہ ۲۷۶

''عربی لغت میں سنۃ کا اطلاق فصل پر بھی ہوتا ہے جو سال میں چار ہوتی ہیں، یعنی چار فصلوں کا ایک سال ہوتا ہے، اس اعتبار سے اَلْفَ سَنَۃ کے معنی ہوں گے اڑھائی سو سال۔ اور عَامًا پورے سال کو کہتے ہیں، اس لیے اگر خمیسن عَامًا (پچاس سال) کو، اس میں سے منہا کر دیا جائے، تو باقی دو سو سال رہ جاتے ہیں، اور اتنی عمر کچھ ایسی مستبعد نہیں۔'' [۱]

نو سو پچاس سال کی عمر کو مستبعد جاننا، یہ ہے وہ لِمْ، جو خدا کی بیان کردہ صریح اور واضح مدت کی تاویل (بلکہ تحریف) میں کارفرما ہے۔ پھر قرآن کی بالصراحت بیان کردہ عمرِ نوح کو، اپنی تاویلاتی موشگافیوں کا نشانہ بناتے ہوئے، وہ جو کچھ بیان کرتے ہیں، انہیں وہ خود بھی ''قیاسات'' ہی قرار دیتے ہیں۔

''یہ بہرحال قیاسات ہیں۔ تاریخی تحقیقات کسی یقینی نقطہ تک پہنچیں گی، تو اس کا حتمی مفہوم سامنے آئے گا۔'' [۲]

کیا ستم ظریفی ہے کہ فَلَبِثَ فِيهِمْ الف سنۃٍ اِلَّا خمسین عَامًا کے قرآنی الفاظ سے تو حتمی مفہوم واضح نہیں ہوتا، اس لیے ''تاریخی تحقیقات'' کا انتظار ہو رہا ہے کہ وہ آ کر، قرآن کے ان ''غیر واضح مفاہیم'' کو کسی ''حتمی مفہوم'' میں بدل ڈالیں گی۔

بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی است

خوب جان لیجئے کہ تاریخی تحقیقات کی روشنی میں، قرآنی آیات کے مفہوم کو متعین کرنے والا یہ ''مفکر قرآن'' وہی ہے، جو عمر بھر تاریخ کے بارے میں یہ اعلان کرتا رہا ہے:

''ہماری باز آفرینی کے لیے طریق کار یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ کو قرآن کے معیار پر پرکھ کر دیکھیں۔ جو اس کے مطابق ہو اس کو حسن سمجھیں، جو اس کے خلاف ہو، اسے عیب قرار دیں۔'' [۳]

۱۔ تفسیر مطالب الفرقان، جلد ۵، صفحہ ۲۳۷ ۔۔۔ ۲۔ مفہوم القرآن (حاشیہ)، صفحہ ۹۱۲

۳۔ طلوعِ اسلام، اپریل ۱۹۵۹ء، صفحہ ۳۳

سبحان اللہ! ''مفکرِ قرآن'' صاحب نے ''عقل و دانش'' کا کیا خوب فلسفہ بگھارا ہے۔ ہمیں (یعنی مسلمانوں کو) تو اپنی تاریخ کو قرآن کے معیار پر پرکھنا چاہیے، اور خود قرآن کا مفہوم، مغرب کی تاریخی تحقیقات کی روشنی میں متعین کرنا چاہیے، جو گویا ہر عیب، غلطی اور خطا سے پاک ہیں۔

قرآنی تصریحات کو، مغرب کے سانچے میں ڈھلی ہوئی، پرویزی ''عقلِ عیار'' کی روشنی میں پرکھنے کی دوسری مثال، وہ ہے جس میں قرآن، واضح انداز میں، ایک نہیں بلکہ بہت سے مقامات پر، یہ بیان کرتا ہے کہ فرعون، ابناءِ بنی اسرائیل کو قتل کیا کرتا تھا، لیکن ہمارے ''مفکرِ قرآن'' صاحب کے نزدیک، یہ بات درست نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ:-

> ''اس وقت تک، مصر کی قدیم تاریخ سے، جس قدر پردے اٹھے ہیں، ان میں سے بنی اسرائیل کے بچوں کو قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا، ممکن ہے، جب تاریخ کے مزید اوراق سامنے آئیں تو ان میں سے اس کے متعلق کوئی ذکر ہو''[1]

کیا یہ عجیب بات نہیں کہ قرآنی الفاظ کے واضح اور قطعی مفہوم کو نظر انداز کر کے، مصر کی تاریخ پر سے مزید پردوں کے اٹھنے کا شدید انتظار کرتے کرتے، وہ شخص مر گیا، جو اٹھتے بیٹھتے، قرآن قرآن کی گردان کیا کرتا تھا، اور قرآن ہی کے اول و آخر سند ہونے کی رٹ لگائے رکھتا تھا۔ اب اگر اثری تحقیقات سے، حیاتِ پرویز ہی میں کوئی ایسی شہادت مل جاتی جو ابناءِ بنی اسرائیل کو جان سے مار ڈالنے کا انکشاف کر ڈالتی، تو پھر ''مفکرِ قرآن'' صاحب، ایک اور قلابازی کھاتے، اور مفہومِ قرآن بدل کر کچھ اور ہو جاتا، اور یوں، قرآن کا ''مبہم مفہوم''، ان تاریخی معلومات کی روشنی میں ''حتمی اور قطعی'' مفہوم قرار پا جاتا۔

بمقابلہ قرآن، پرویز کا انجیلِ متی پر اعتماد:

مغرب کے سامنے، ''مفکرِ قرآن'' کی دماغی اسیری، ذہنی غلامی اور فکری عبودیت کی

---

[1] لغات القرآن، جلد۲، صفحہ ۶۹۴

شدت کا یہ عالم تھا کہ اُن کی بے اصل اور تحریف شدہ مذہبی کتب کا بیان بھی، بغیر کسی حیل و حجت کے قابل قبول تھا، اور اس کے مقابلے میں، قرآن کی بیان کردہ حقیقت، پرویز صاحب کے نزدیک، تاریخ کی روشنی میں، مشتبہ اور مشکوک قرار پاتی تھی۔ وہ، انجیل متی کی بیان کردہ صورتِ واقعہ کو صاف، شفاف، واضح اور بے غبار قرار دیتے تھے، جسے قبول کرنے میں، اُنہیں، ادنیٰ سا تامّل بھی نہیں ہوتا تھا، لیکن ویسی ہی کوئی حقیقت، اگر قرآن میں مذکور ہو، تو انہیں، اس کا مفہوم، غیر واضح اور مبہم دکھائی دیتا تھا، جسے قبول کرنے میں، انہیں دغدغہ، اشتباہ اور تامل لاحق ہو جاتا تھا۔ اب اسی مقام پر یہ دیکھ لیجئے کہ قرآن مجید، واضح اور غیر مبہم انداز میں یہ حقیقت بیان کرتا ہے کہ خود فرعون بھی اور اس کے حکم سے اس کے حکومتی کارندے بھی، قتلِ ابناءِ بنی اسرائیل کے مرتکب تھے، لیکن ''مفکر قرآن'' صاحب کو یہ حقیقت، اس لیے تسلیم نہیں کہ ''اس وقت تک مصر کی قدیم تاریخ سے جس قدر پردے اٹھے ہیں، ان میں سے بنی اسرائیل کو قتل کر دینے کا کوئی واقعہ سامنے نہیں آیا۔'' لیکن جب ایسا ہی بیان، عیسائیوں کی من گھڑت مذہبی کتاب (انجیل متی) میں مذکور ملتا ہے، تو وہ، اسے بغیر کسی ادنیٰ تامّل کے، یہ کہہ کر قبول کر لیتے ہیں:

> ''انجیل متی میں یہ بھی مذکور ہے کہ ہیرودیس نے بیت لحم اور اس کی سرحدوں کے تمام بچوں کو، جن کی عمر، دو برس یا اس سے کم تھی، قتل کرا دیا تھا۔'' [1]

کیا یہ مثالیں، ''مفکر قرآن'' کے ایمان بالقرآن کی اصل حقیقت کو بے نقاب نہیں کر ڈالتیں؟ کیا اس سے یہ حقیقت واضح نہیں ہو جاتی کہ وہ قرآن کے نام کی آڑ میں، مغرب ہی کے پیروکار تھے؟

''مفکر قرآن'' کی مغرب پرستی کی مجبوری:

کوئی مانے یا نہ مانے، لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب، اول و آخر، مغرب پرستی ہی کا بری طرح شکار تھے، وہ، قرآن کریم کے واحد سند اور تنہا حجت

---

[1] شعلہ مستور، صفحہ ۱۶

ہونے کا ڈھنڈورا پیٹنے کے باوجود، فکر و عمل کی جو راہ اختیار کیے ہوئے تھے، وہ مغرب پرستی ہی کی راہ تھی۔ ان کی اس ذہنی اور عملی کیفیت کو، مولانا طاہر سورتی مرحوم نے، اِن الفاظ میں، خوب بے نقاب کیا ہے:

''یوں تو پرویز صاحب قرآن مجید کو کامل کتاب مانتے ہیں، اور یہ بھی کہتے ہیں کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں جو اختلافات تھے، قرآن مجید نے انہیں بے نظیر انداز سے رفع کر کے حقیقتِ حال کو نکھار کر رکھ دیا ہے۔ انہیں تسلیم ہے کہ قرآن مجید میں کسی اور رسول کی پیدائش، ذاتی کوائفِ حیات اور زندگی کے آخری مراحل کے متعلق، اس شرح و بسط سے تذکرہ نہیں آیا جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق آیا ہے (شعلۂ مستور صفحہ ۱۹)۔ انہیں یہ بھی اعتراف ہے کہ قرآن مجید نے آ کر، حضرت عیسیٰؑ کی زندگی پر سے افراط و تفریط کے وہ تمام پردے ہٹا دیئے، جو یہودیوں اور عیسائیوں نے ڈال رکھے تھے، لیکن بایں ہمہ وہ قرآن مجید سے حضرت عیسیٰؑ کے بن باپ پیدا ہونے یا باپ سے پیدا ہونے کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر پائے اور بالآخر مجبور ہو کر ''محققینِ یورپ'' کا دامن تھامتے ہیں جو ہمیشہ ان کی مشکلات میں کام آتے ہیں۔ لیکن خدا جانے پرویز صاحب میں اتنی جرأت کیوں نہیں پیدا ہوتی کہ وہ صاف لفظوں میں اعتراف کریں کہ قرآن مجید جو ''ع چھیڑتا ہے وہ ناقص ہوتا ہے، اور ہمیں اس کے بیانات کی شرح جب تک اناجیل وغیرہ سے نہ ملے، ہم کسی قطعی نتیجہ پر نہیں پہنچ سکتے۔ وہ دبی زبان سے اس قسم کے اعترافات ضرور کرتے رہتے ہیں جن سے قرآن کا نقص ثابت ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً اسی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تذکرہ کے متعلق، جو بقول ان کے، قرآن مجید میں پوری تفصیل اور شرح و بسط سے ملتا ہے، ایک جگہ وہ تحریر فرماتے ہیں...... ''اب آیئے قرآن کریم کی طرف، اس میں بالتصریح کہیں نہیں لکھا کہ

حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بغیر باپ کے ہوئی تھی۔ نہ ہی یہ لکھا ہے کہ آپ یوسف کے بیٹے تھے۔" [۱]

"مصنفِ کتاب" کی تنقیدِ زور:

مولانا طاہر سورتی مرحوم، کے اقتباس کے آخری حصہ پر، "مصنفِ کتاب"، جھوٹ کے بل بوتے پر، تنقید کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

"طاہر سورتی مرحوم کو، پرویز مرحوم کو مطعون کرنے کے باوجود، اتنی جرأت نہ ہوئی کہ تردید میں کہتے کہ "قرآن مجید میں بالتصریح لکھا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور وہ یوسف کے بیٹے نہیں تھے......" [۲]

محترم تنقید نگار کی اس تنقید پر، ماسواء اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے:

بیاں میں نکتہ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

مولانا طاہر سورتی صاحب نے تو پوری کتاب لکھی ہی اس موضوع پر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش، ازروئے قرآن، بغیر باپ کے ہوئی تھی، اور وہ، یوسف تو رہا ایک طرف، کسی بھی مرد کے بیٹے نہیں تھے۔ پھر کتاب "ابن مریمؑ اور پرویز" کے آخری حصہ میں، فاضل مصنف نے سات قرآنی تصریحات، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بن باپ پیدائش پر پیش کی ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ کہ خود "مصنفِ کتاب" نے، اپنی کتاب کے پیش لفظ میں، یہ کہہ کر ان دلائل کا اعتراف کیا ہے کہ:

"طاہر سورتی مرحوم نے حضرت عیسیٰؑ کے بغیر باپ پیدا ہونے کے حق میں جو دلائل دیئے ہیں، ان کا خلاصہ یہ ہے کہ......" [۳]

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ "مصنفِ کتاب" نے، مولانا طاہر سورتیؒ کے دلائل

---

[۱] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۴۸ تا صفحہ ۴۹ [۲] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۵۸
[۳] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ا

پر غور فرمانے کی زحمت ہی نہیں کی، اور اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر، ان کے معقول دلائل پر، نامعقول تنقید پر مشتمل کتاب لکھ ماری ہے۔

''مصنفِ کتاب'' کی انتہائی کمزور وکالتِ پرویز:

فاضل تنقید نگار، اپنی تنقید کو برقرار رکھتے ہوئے، مندرجہ بالا عبارت کے متصل ساتھ ہی، مولانا طاہر سورتی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''............لیکن ڈھٹائی کے ساتھ حکم لگاتے ہیں کہ:

بایں ہمہ محرف اناجیل پر اعتماد کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔

پرویز صاحب کی نظر میں، قرآن مجید حرفِ آخر نہیں ہے۔ وہ قرآن مجید سے پہلے بھی اناجیل اور دیگر اولیاء پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہیں اور قرآن مجید کے بعد بھی، اس کے مطالب کی شرح کے لیے، اناجیل و اولیاء پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ چنانچہ شعلۂ مستور کے صفحہ ۹۰ پر لکھتے ہیں......''قرآن کریم تک آنے سے پیشتر ہمیں ایک بار پھر اناجیل پر غور کر لینا چاہیئے۔ اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہر حال، اُنہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا (اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے)۔'' [1]

جناب ''مصنفِ کتاب''، مولانا طاہر سورتی صاحب کے ''ڈھٹائی کے ساتھ'' لگائے گئے اس حکم کی تردید میں لکھتے ہیں:

''طاہر سورتی مرحوم نے ان اناجیل کا کوئی اقتباس پیش نہیں کیا جن کے بارے میں پرویز مرحوم نے لکھا ہے کہ قرآن کریم تک آنے سے پیشتر ان پر غور کر لینا چاہیئے۔'' [2]

نمعلوم، ''مصنفِ کتاب''، اپنی اس عبارت میں کیا کہنا چاہتے ہیں؟......اگر وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ طاہر سورتی مرحوم کو وہ اقتباسات بھی پیش کرنے چاہیئے تھے جو پرویز صاحب

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۵۸ — [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۶۰

نے اناجیل میں سے پیش کیے ہیں، تو یہ ایک بیجا مطالبہ ہے کیونکہ مولانا طاہر سورتی مرحوم، ''مفکرِ قرآن'' پر یہ معقول اور جچا تلا اعتراض کرتے ہیں کہ وہ، ولادتِ عیسیٰؑ کی بحث میں ،قرآن مجید کو اول و آخر سند و حجت ماننے کے دعویٰ کے باوجود بھی، قرآنی حدود میں محدود رہنے کی بجائے، اناجیل پر اعتقاد کرتے ہیں، اور اپنے اس اعتراض کو پرویز صاحب ہی کی اس عبارت سے ثابت کر دیتے ہیں کہ...... ''اناجیل جیسی کچھ بھی آج ہیں، بہرحال، انہی کے بیانات کو سامنے رکھا جائے گا (اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے)''...... اس تحریری ثبوت کے بعد، اقتباساتِ اناجیل کو بالفعل پیش کرنے کی ضرورت ہی نہیں رہ جاتی۔

لیکن اگر ''مصنفِ کتاب''، یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ پرویز صاحب نے اناجیل کے بیانات کو سامنے رکھنے کا تذکرہ تو کیا ہے، لیکن خود انہوں نے عملاً ایسا کیا نہیں ہے، تو یہ بات بھی خلاف واقعہ ہے، کیونکہ اناجیل کی طرف مراجعت کو ناگزیر قرار دینے کے بعد، پرویز صاحب نے اناجیل سے سات اقتباسات پیش کیے ہیں، دو انجیل متی سے، تین انجیل لوقا سے، اور دو انجیل یوحنا سے۔ اور پھر اپنے پیشوا ''امام'' رینان کی تحقیق پیش کی ہے، حالانکہ انہیں، صرف اور صرف، قرآن مجید تک ہی محدود رہنا چاہئے تھا، لیکن وہ قرآن کی ''قید'' سے رہائی پاتے ہوئے، اناجیل میں پناہ لیتے ہیں، اور نتیجتاً یہ اعلان کرتے ہیں:

> ''غور فرمایا آپ نے کہ حضرت مسیحؑ کے متعلق اناجیل میں مذکور ہے کہ وہ حضرت داؤد کی نسل سے تھا، اور یہ سلسلہ، یوسف نجار کی وساطت سے، حضرت داؤد تک پہنچتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ ان نسب ناموں کی رُو سے بھی، حضرت مسیحؑ یوسف نجار کے بیٹے ہی قرار پاتے ہیں۔'' [1]

طاہر سورتیؒ کی مخالفتِ پرویز کی اصل وجہ:

اس کے بعد، ''مصنفِ کتاب''، طاہر سورتی کی طرف سے کی گئی مخالفتِ پرویز کی اصل وجہ کا انکشاف بایں الفاظ کرتے ہیں:

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۱۰۱

''طاہر سورتی مرحوم کی پرویز مخالفت کی اصل وجہ تو مجھے معلوم نہیں، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انہوں نے ملاؤں کے بتائے ہوئے عقائد کے خلاف لکھنا شروع کر رکھا تھا، جن میں قرآن کے خلاف، یہ عقیدہ بھی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ، بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے، اور حضرت مریمؑ، ان کی کنواری ماں تھی۔ طاہر سورتی بھی بنیادی طور پر ایک ملا تھے۔'' [۱]

جی ہاں! درست فرمایا، جناب ''مصنفِ کتاب'' نے، کہ ''پرویز صاحب نے ملاؤں کے خلاف لکھنا شروع کر رکھا تھا'' کیونکہ یہ مُلا ''لوگ دینِ مصطفوی کے محافظ اور پاسبان تھے، اور قرآن کے نام کی آڑ میں، ''مفکر قرآن'' صاحب، مغربی معاشرت کے اطوار و اقدار کے ساتھ، اشتراکیت کی پیوندکاری کرتے ہوئے، جس باطل نظام کے علمبردار تھے، اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ، وہ دینِ مصطفوی ہی تھا، جس کے مبلغ اور داعی، یہ ''مُلا لوگ'' تھے (اور ہیں)۔ اس لیے پرویز صاحب کا مفاد اسی میں تھا کہ وہ ''ملاؤں'' کے خلاف، جنگ کی آگ کو مسلسل بھڑکائے رکھیں، اور طلوع اسلام کے ذریعہ، اس آگ میں، ہر ماہ بلا وقفہ، ایندھن ڈالتے رہیں، تاکہ یہ آگ، نہ صرف یہ کہ بجھنے نہ پائے، بلکہ اس کی شدت، اضعافاً مضاعفہ ہوتی رہے، کیونکہ:

''اگر کسی طرح جنگ میں وقفہ پیدا کر دیا جائے، تو جذبات کا یہ اشتعال مدھم پڑ جاتا ہے، اور پھر ختم ہو جاتا ہے۔ اس لیے دوبارہ اس آگ کو بھڑکانا مشکل ہو جاتا ہے۔'' [۲]

اگر مغرب پرستی اور اشتراکیت پرستی کی کوکھ سے جنم لینے والا، یہ ''قرآنی نظام'' واقعی صحیح اسلام ہوتا، تو پھر تو اپنی عین فطرت کے اعتبار سے، سب سے پہلے ارباب اقتدار ہی پر اس کی چوٹ پڑتی، اور وہ اس چوٹ پر بلبلا اٹھتے، اور اس کی مخالفت میں مقدور بھر کوشش کرتے، اور اسے کچل ڈالنے میں وہ کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ چھوڑتے، اور اس کے علمبردار

---

[۱] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۶۰   [۲] طلوع اسلام، اکتوبر ۱۹۸۶ء، صفحہ ۴۶

''مفکر قرآن'' پر قافیۂ حیات، اسی طرح تنگ کر ڈالتے جس طرح کفارِ مکہ نے محمد رسول اللہ والذین معہ کا تنگ کر ڈالا تھا، لیکن ہماری حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قیام پاکستان سے لے کر تا دمِ مرگِ پرویز، (اور اب تک بھی) کسی بھی حکمران کو اس سے کبھی کوئی تشویش لاحق نہیں ہوئی، بلکہ الٹا پرویز صاحب اور اربابِ اقتدار کے درمیان، (بقول پرویز صاحب) ہمیشہ خوشگوار راہ و رسم رہی ہے۔

> ''قیامِ پاکستان کے بعد ہمارے جو راہنما برسرِ اقتدار آتے رہے ہیں، ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ساتھ میری راہ و رسم تھی۔'' [۱]

سوال یہ ہے کہ ''مفکر قرآن'' کا پیش کردہ یہ کیسا ''اسلام'' تھا جسے اربابِ اقتدار کی طرف سے کھلی حمایت یا خاموش تائید، ہمیشہ میسر رہی؟ اور پھر یہ کیسی ''قرآنی خدمات'' تھیں جس پر علماءِ یہود ہوں یا احبار و رہبانِ عیسائیت، علمبردارانِ کفر ہوں یا پشتبانانِ الحاد، فلاسفۂ زندقہ ہوں یا دانشورانِ دہریت، وہ سب کے سب راضی اور خوش ہو کر، ''مفکر قرآن'' کو خراجِ تحسین اور گلہائے عقیدت پیش کرتے ہیں؟ (تفصیل کے لیے دیکھئے میری کتاب ''جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینہ میں'') ۔اگر واقعی، پرویز صاحب کا پیش کردہ یہ ''انقلابی اسلام'' وہ حقیقی اسلام ہوتا، جو محمد رسول اللہ والذین معہ کا نافذ کردہ اسلام تھا، تو پھر تو اس کی مخالفت، ہر طرف سے ہونی چاہئے تھی، اور ہر اُس شخص کو، اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہئے تھا، جس کی خدائی کا ڈنکا، کسی بھی شعبۂ زندگی میں بج رہا تھا۔صرف ''ملا'' ہی کی طرف سے یہ مخالفت کیوں؟ وقت کے فراعنہ اور نمارِدہ کی طرف سے کیوں نہیں؟

طاہر سورتیؒ پر بے بنیاد طعن:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کو مُلاّ قرار دینے کے بعد، ''مصنفِ کتاب''، یہ کہتے ہوئے، انہیں اپنے بے بنیاد طعن کا نشانہ بناتے ہیں:

---

[۱] طلوعِ اسلام، فروری ۱۹۷۸ء، صفحہ ۵۶ + مارچ ۱۹۸۵ء، صفحہ ۶۰

''وضعی روایات کی عینک پہن کر کوئی اندھا ہو جائے اور اسے نظر نہ آئے تو یہ اور بات ہے۔'' [1]

کیا ستم ظریفی ہے کہ طنز و طعن کے تیر، اُس شخص پر برسائے جا رہے ہیں، جس نے اپنی پوری تصنیف (ابن مریم اور پرویز) میں...... وضعی روایات تو رہیں ایک طرف...... کسی صحیح اور مستند حدیث سے بھی تمسک نہیں کیا، اور سراسر قرآن ہی کی بنیاد پر، اپنے استدلالی مواد کو مرتب کیا ہے۔ اس کے برعکس، خود ''مصنفِ کتاب''، ایسی ''روایات کی عینک پہن کر'' بے بصر ہو چکے ہیں، اور پھر ساون کے اس اندھے کو ''عیون زمزم'' نامی کتاب میں سے، مندرجہ ذیل روایت کے سوا، کچھ دکھائی نہیں دیا۔

ان عیسٰی حملته امه کما تحمل المرءة ثم وضعته کما تضع المرءة ولدها غذّی کما تغذی المرئة الصَّبِیَّ مریم کو اسی طرح **جائز** حمل ہوا جس طرح کہ دیگر عورتوں کو **جائز** حمل ہوا کرتا ہے، اور پھر اس نے اسی طرح یہ وضع کیا جیسے کہ عورتیں اپنے اپنے حملوں کو وضع کیا کرتی ہیں، اور پھر اسی طرح اسے دودھ پلا کر پرورش کیا گیا جیسے دیگر عورتیں اپنے اپنے بچوں کو دودھ پلا کر پرورش کیا کرتی ہیں۔'' [2]

پھر اس روایت کو اپنے مطلب کے سانچے میں ڈھالنے کے لیے ترجمہ میں لفظ ''جائز'' کا اضافہ کرتے ہیں، اور یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اس سے صاف واضح ہے کہ عیسٰیؑ کی والدہ مریم نے، جائز حمل کے ذریعہ، انہیں اپنے پیٹ میں لیا جس طرح تمام عورتیں حاملہ ہو کر لیتی ہیں، اور حمل، مرد کے ذریعہ قرار پاتا ہے۔'' [3]

جو لوگ، حضرت عیسٰیؑ کی ولادت کو، معجزانہ حمل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں، ان میں سے کوئی بھی، نہ تو مریمؑ کے استقرارِ حمل کا منکر ہے، نہ ہی اُس کے وضعِ حمل کا، اور نہ ہی وضع

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۱ [2] + [3] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۰

حمل کے بعد، شیر مادر کی صورت میں غذا بہم پہنچاتے ہوئے، مریم کے ہاتھوں، اُن کی پرورش کا منکر ہے۔ یہ تمام امور، منکرینِ معجزات اور قائلین معجزات میں بالاتفاق تسلیم کیے جاتے ہیں۔ جو چیز مابہ النزاع ہے، وہ صرف یہ ہے کہ حملِ مریم کا وقوع کیسے ہوا؟ اول الذکر گروہ، حضرت مریمؑ کے استقرارِ حمل کو، دائرہ نکاح میں معمول کا عادی عمل قرار دیتا ہے جب کہ مؤخر الذکر گروہ کے نزدیک، کنواری مریمؑ کا یہ حمل، بلامسِ بشر، معجزانہ طور پر واقع ہوا ہے، اور ''عیونِ زمزم'' کے حوالہ سے، جس روایت کو پیش کیا گیا ہے، اُس میں سرے سے نہ تو نکاحِ مریمؑ کا ذکر ہے، اور نہ ہی ان کے نام نہاد شوہر، یوسف نجار کا ذکر ہے۔

''مصنفِ کتاب'' نے یہاں جو کچھ فرمایا ہے، وہ دراصل، دوسروں کی عبارت میں اپنے خیالات کو پڑھنے کی عادت کا کرشمہ ہے، ورنہ اس روایت کا کوئی لفظ بھی، اُن کے موقف کی تائید نہیں کرتا۔ استقرارِ حمل خواہ معجزانہ طور پر واقع ہو، یا نکاح کے بعد اختلاطِ زوجین کا نتیجہ ہو، یا حدودِ نکاح سے باہر ناجائز مجامعت کے ذریعہ وقوع پذیر ہو، ان تینوں قسم کے احمال میں (وقوعِ حمل، وضعِ حمل، اور تغذیہ و تربیتِ نومولود بذریعہ شیرِ مادر) میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اس یکسانیت کو دیکھتے ہوئے معجزانہ وقوعِ حمل کو نظر انداز کر دینا، اور پھر ایک ہی (معمول کے مطابق) عادی حمل کو مراد لینا، ایک بے جا ہٹ دھرمی ہے، جسے صرف انکارِ معجزات کے پیشِ نظر، ''میں نہ مانوں'' ہی کی روش قرار دیا جا سکتا ہے۔

بن باپ پیدائش کی قرآنی تصریحات:

ولادتِ مسیحؑ کا مسئلہ ایک ایسا مسئلہ ہے، جس میں منکرین معجزات اور منکرینِ حدیث کے جملہ فرقوں اور ٹولوں میں، صرف اس امر میں اتفاق پایا جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش، معمول کا ایک عام اور عادی واقعہ ہے لیکن اسے ثابت کرنے کے لیے، ان لوگوں کی استدلالی موشگافیوں میں سخت اختلاف بلکہ تعارضات پائے جاتے ہیں۔ اس گروہ کے جس شخص نے بھی اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے، اُس نے قرآنی آیات کے مفہوم کو توڑنے مروڑنے میں، نئی راہ اختیار کی ہے، اور ہر شخص کی تشریحِ آیات، دوسرے سے مختلف ہے۔

جہاں تک پرویز صاحب کا تعلق ہے، وہ اپنی تصنیفات کے ابتدائی دور میں معجزاتِ انبیاء کے بھی قائل تھے اور ولادتِ مسیح میں اعجازی پہلو کے بھی معترف تھے، لیکن بعد میں منکرینِ معجزات کے امام و پیشوا بن گئے۔ اپنے ماضی میں، اُن کا معجزات کو تسلیم کرنا، بر بناءِ اخلاص تھا، یا محض فقیہہِ مصلحت بین کی حیثیت سے ان کا ایسا کرنا کوئی مجبوری تھی، اسے ہم اللہ تعالیٰ پر چھوڑتے ہیں۔ لیکن ان کے اس طرزِ عمل نے نہ صرف یہ کہ خارزارِ تضادات پیدا کیا ہے بلکہ قرآنی آیات کی تحریف میں بھی، ان کی تحریفی صلاحیتوں کو بے نقاب کر دیا ہے۔ وہ، قرآن کریم کے بارے میں، اِس کے **مفصّل**، **مُبین**، **تبیاناً لِکُلِّ شَیءٍ** ہونے کا ڈھنڈورا بھی پیٹتے ہیں، لیکن اس کے باوجود، ان کی قرآنی بصیرت:

> ''قرآن سے بالتصریح یہ معلوم نہ کر سکی کہ حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے یا باپ کے ذریعہ! تحقیقی اور علمی دیانت کا تقاضا تو یہ تھا کہ جب انہیں بالتصریح نہ بے باپ کے پیدا ہونے کا ثبوت ملتا ہے، نہ بالتصریح باپ کے ذریعہ پیدا ہونے کا ثبوت ملتا ہے، تو خاموشی اختیار کر لی ہوتی اور اپنے معارف القرآن میں اکاذیب واباطیل کی آمیزش نہ کرتے۔ لیکن اگر پرویز صاحب کو حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس مختلف فیہ عقیدہ کے متعلق بالتصریح کچھ نہ مل سکا، تو وہ بالاستعارہ، بالکنایہ اور بالمجاز تو بہت کچھ پا سکتے تھے، انہیں اتنی جلدی قرآن مجید کو چھوڑ کر، اربابًا من دون اللہ کے سایۂ عاطفت میں پناہ گزیں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر وہ قرآن مجید کو حرفِ آخر مانتے ہوئے، اس پر پورا اعتماد کرتے اور من مانے معنوں کی تائید کے لیے، اناجیل اور ''علمائے یورپ'' کی تحقیق پر بھروسہ نہ کرتے، تو قرآن مجید وضاحت کے ساتھ بالتصریح، انہیں اس بارے میں راہِ راست پر پہنچا دیتا۔'' [1]

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۵۰

قرآنی تصریحات اور منکرینِ حدیث کی ''تردید'':

مولانا طاہر سورتی مرحوم، یہ کچھ لکھنے کے بعد، اگلے صفحہ پر، فرماتے ہیں:

''اچھا لیجئے! اب ہم قرآن مجید سے وہ تصریحات بیان کرتے ہیں جن سے ہر سمجھ دار آدمی یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہوگا کہ حضرت مریمؑ نے حضرت عیسیٰ کی پیدائش سے قبل، شادی نہیں کی تھی، اور حضرت عیسیٰؑ بے باپ کے پیدا ہوئے تھے، لیکن یہ تصریحات اسی کو نظر آسکتی ہیں جو عربی ادب ولغت سے بہرۂ وافر رکھنے کے ساتھ، اسالیبِ قرآن پر گہری نظر رکھتا ہو، اور جسے عربوں کے عوائد ومراسم کا اچھی طرح علم ہو۔'' [۱]

پہلی قرآنی تصریح (لفظ ''امرء ة'' کا استعمال):

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی پیش کردہ پہلی قرآنی تصریح، لفظ اِمْرَءَ ة کے استعمال سے تعلق رکھتی ہے، وہ عربوں کے اسلوب بیان اور قرآن کریم کے طرز ادا کی روشنی میں، فرماتے ہیں:

''عربوں کا دستور ہے اور قرآن مجید نے بھی عربوں کے اس دستور کی تصویب فرمادی ہے کہ جب کنواری لڑکی کا نام لیا جائے تو اسے باپ کی طرف منسوب کیا جائے، اور جب بیاہی عورت کا نام لیا جائے، تو اسے اس کے شوہر کی طرف منسوب کیا جائے۔ قرآن مجید اس اسلوب کا شدت سے پابند ہے اور ایک جگہ بھی اس کی مخالفت نہیں کرتا۔ وہ جہاں بھی شادی شدہ عورت کا ذکر کرتا ہے، اُسے اس کے شوہر کی طرف منسوب کرتا ہے۔ دیکھئے، وہ عورت، جس نے حضرت یوسفؑ پر ڈورے ڈالے تھے، قرآن مجید اُسے اِمْرَءَ ةُ الْعَزِیْزِ عزیز کی بیوی (۱۲/۳۰) کہتا ہے۔ اسی طرح اِمْرَءَ ة نُوْح، نوحؑ کی بیوی (۶۶/۱۰) اِمْرَءَ ة لُوط، لوطؑ کی بیوی (۶۶/۱۰)۔ اِمْرَءَ ة فِرْعَوْنَ، فرعون کی بیوی

---

[۱] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۵۱

(۶۶/۱۱)، اور خو حضرت مریمؑ کی والدہ کے لیے اِمْرَءَ ۃُ عِمْرَان (۳/۳۵) قرآن میں موجود ہے۔ اس استعمال کے خلاف کہیں ایک مثال بھی قرآن مجید سے نہیں مل سکتی، اور صرف قرآن مجید ہی ہمارے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن مجید کے اس اصول کے لحاظ سے اگر حضرت مریمؑ، یوسف کی بیوی تھیں تو قرآن مجید عرب کے اسلوب، نیز اپنی سنت کے مطابق، انہیں اِمْرَاءَ ۃ یُوسَف کہہ کر پکارتا، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن مجید حضرت مریمؑ کو، بجائے شوہر کے باپ کی طرف منسوب کرتے ہوئے اِمْرَءَ ۃ ابْنَتَ عِمْرَان، مریمؑ، عمران کی بیٹی (۶۶/۱۳) کہہ رہا ہے، جس سے صاف ظاہر ہے کہ قرآن مجید، حضرت مریمؑ کو غیر شادی شدہ تسلیم کرتا ہے۔'' [۱]

منکرینِ معجزات کی ''تردیدی دلیل'':

''مفکر قرآن'' صاحب کی حمایت میں، اور مولانا طاہر سورتی مرحوم کی مخالفت میں، ''مصنفِ کتاب''، جن ''پرویزی حیلوں'' سے اپنے ''دلائل'' پیش کرتے ہیں، ان میں، ایک حیلہ، ترجمۂ آیت میں، خودساختہ الفاظ کا اضافہ ہے، تاکہ قرآن کے منہ میں، اپنی بات ڈال کر، مقصد برآری کی جائے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''یہ آیت اس طرح پر ہے وَمَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ الَّتِيْ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِن رُّوْحِنَا وَ صَدَّقَتْ بِكَلِمٰتِ رَبِّهَا وَكُتُبِهٖ وَكَانَتْ مِنَ الْقَانِتِيْنَ (التحریم - ۱۲) ترجمہ: اور (دوسری مثال) مریم، عمران کی بیٹی کی (دی ہے) جس نے (ہیکل کے کے بے لگاموں کے شر سے) اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی، لہٰذا ہم (خدا) نے (ایک بشر رسول کے نکاح کے ذریعہ سے) اس کی شرمگاہ میں (روحوں میں سے) ایک روح کو نفخ کر دیا۔ وہ اپنے رب کے قوانین اور اس کی کتابوں کی تصدیق کرتی تھی، اور فرمانبرداروں سے تھی۔'' [۲]

---

[۱] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۵۲ [۲] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۶۱

مخمل میں ٹاٹ کی پیوندکاری:

اس آیت کے ترجمہ میں چھ، بین القوسین اضافے کیے گئے ہیں، جن میں سے تین اضافوں کا جواز اس لیے فراہم ہو جاتا ہے کہ سیاق و سباق اور مرجعِ ضمیر کے اعتبار سے، ان کی حیثیت ''تشریحات'' کی ہے جبکہ بقیہ تین اضافے ناجائز ہیں۔ یہ اضافے، تشریح کی بجائے، دہنِ قرآن میں خود اپنی بات ڈالنے کے مترادف ہے تاکہ مفہوم آیت کو کھینچ تان کے ذریعہ، قلب و دماغ میں رچے بسے اُن افکار و نظریات پر منطبق کیا جائے جن کا سرچشمہ، بہرحال، قرآن نہیں ہے۔ خود سوچئے کہ (۱) ''ہیکل کے بے لگاموں کے شر سے'' (۲) ''ایک بشر رسول کے نکاح کے ذریعہ سے'' (۳) ''روحوں میں سے'' کے الفاظ میں یہ اضافے، کن قرآنی الفاظ کے تراجم یا مترادفات ہیں؟ کیا یہ قرآن کے منہ میں اپنی بات ڈال کر، اس سے اگلوانے کی بیجا حرکت نہیں ہے؟ کیا اس سے یہ واضح نہیں ہوتا کہ یہ لوگ، قرآن سے ہدایت لینے کی بجائے، الٹا اسے ہدایت دینا چاہتے ہیں؟ مزید برآں، یہ اضافے، کیا مخمل میں ٹاٹ کے پیوند نہیں ہیں؟

ان حشو و زوائد پر ایک اچٹتی سی نظر بھی، اس حقیقت کو واضح کر ڈالتی ہے کہ حضرت مریمؑ کو شادی شدہ ظاہر کرنے کے لیے اور حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ معجزانہ ولادت کا انکار کرنے کے لیے، ''مصنفِ کتاب'' نے یہ کرشمہ کاری کی ہے، چنانچہ وہ اس ترجمہ کے متصل بعد فرماتے ہیں:

> ''اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا سے، جس کا ترجمہ اوپر دیا گیا ہے، صاف ظاہر ہے کہ وہ ہیکل میں کنواری تھی، ہیکل سے گھر آ کر شادی کی، لہٰذا، اللہ تعالیٰ نے اسے عمران کی بیٹی کہنے میں کوئی غلطی نہیں کی۔'' [۱]

حالانکہ اَلَّتِیْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَھَا کے اُس ترجمہ سے، جو ''مصنفِ کتاب'' نے پیش کیا ہے، قطعاً یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ مریمؑ کنواری تھی، بلکہ یہ ان کے بین القوسین اضافوں سے ظاہر

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۱

ہے، یا پھر اس تشریح سے، جو جناب طاہر سورتی صاحب نے پیش کی ہے (جس کا ذکر آگے آ رہا ہے)۔

یہاں میں، اپنے اس سوال کو پھر دُہراتا ہوں کہ اگر ترجمۂ قرآن میں، اضافی الفاظ کے اسی طرح پھانے ٹھونکے جائیں، تو وہ کون سی ضلالت ہے جسے قرآن سے برآمد نہیں کیا جا سکتا؟ مزید برآں، ''مصنفِ کتاب''، ایک مقام پر فرماتے ہیں:

''مسیح، حضرت عیسیٰؑ کا لقب، عیسیٰؑ نام، اور ابن مریمؑ کنیت ہے۔''[1]

اب جس خدا نے (بقول ان کے) حضرت عیسیٰؑ کا نام، کنیت اور لقب تک بیان کر دیا، اُس خدا کو، حضرت عیسیٰؑ کے باپ کا نام چھپانے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر واقعی یوسف نامی، کوئی شخص، اُن کا باپ ہوتا، یا مریم کا شوہر ہوتا، تو جس خدا نے قرآن کریم میں، بائیس تیئیس مرتبہ ابن مریم کہا ہے، وہ کیا ایک مرتبہ بھی عیسیٰؑ ابن یوسف نہیں کہہ سکتا تھا؟ یقیناً کہہ سکتا تھا لیکن اس نے نہیں کہا۔ کیوں؟ اس لیے کہ اُن کا کوئی باپ تھا ہی نہیں، وہ بن باپ، معجزانہ طور پر پیدا ہوئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا طاہر سورتی صاحب کا اس مقام پر یہ استدلال کہ حضرت مریمؑ کنواری تھیں، بڑا قوی اور وزنی استدلال ہے، اس استدلال کو، قرآنی آیت کے تراجم میں، خود ساختہ الفاظ کو گھسیڑتے ہوئے، جھٹلانا، کسی خدا ترس آدمی کا کام نہیں ہو سکتا۔

مفہومِ پرویز — تب اور اب:

حقیقت یہ ہے کہ منکرینِ معجزات اور فتنۂ انکارِ حدیث کے علمبرداروں کی یہ مستقل عادت ہے کہ وہ پہلے اپنے دل و دماغ میں ایک عقیدہ راسخ کر لیتے ہیں، اور پھر اس کی حمایت میں ''دلائل'' تلاش کرنے کے لیے، قرآن کی ورق گردانی شروع کر دیتے ہیں۔ اس مقصد کے پیشِ نظر، یہ لوگ، قواعدِ زبان کو نظر انداز کرنے سے بھی نہیں کتراتے، معنوی تحریف سے بھی دریغ نہیں کرتے، بین القوسین اضافوں سے بھی باز نہیں آتے تاکہ ان

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۲

حربوں سے قرآنی مفہوم کو بگاڑ کر اپنے ڈھب پر لایا جائے، ان پرویزی حیلوں سے، اگر کوئی شخص، قرآن کو مسخ کرنے پر اُتر آئے، تو (بقول پرویز صاحب) اُسے اپنی کون سی مصلحت کی دلیل نہیں مل سکتی۔ ''مفکر قرآن'' صاحب بھی، قرآن کا نام لے کر، کتاب اللہ کے ساتھ یہی سلوک کرتے رہے ہیں۔ انکارِ معجزات کی روش اپنانے کے بعد، اسی آیت کا جو لمبا چوڑا مفہوم، بین القوسین اضافوں کے ساتھ، اور آیت میں واقع مرجعِ ضمیر کی تبدیلی کے ساتھ، پیش کیا ہے، ایک نظر، اس پر بھی ڈال لیجئے۔

''اور تیسری مثال، عمران کی بیٹی مریمؑ کی ہے۔ اس نے خانقاہیت کے اُس گھناؤنے ماحول میں، جہاں ہر گرگ کو برۂ معصوم کی تلاش رہتی ہے، اپنی عصمت کو محفوظ رکھا اور اپنے چاکِ گریباں تک کسی کا ہاتھ نہ پہنچنے دیا۔ (اس نے خانقاہیت کی خود تراشیدہ شریعت کی پرواہ نہ کرتے ہوئے، خدا کے مقرر کردہ قاعدے کے مطابق، عائلی زندگی اختیار کی۔ اسے حمل قرار پایا)۔ پیدا ہونے والے بچے میں ہم نے اپنی توانائیوں کا شمہ ڈالا (جیسا کہ ہر انسانی بچے کی صورت میں ہوتا ہے)۔ اس طرح اُس نے اپنے خدا کے احکام و ارشادات کی، یعنی اس کی طرف سے بھیجے ہوئے قوانین کے برحق ہونے کی تصدیق کی۔ وہ خدا کے نہایت فرمانبردار بندوں میں سے تھی۔'' [1]

قلم پرویز سے برآمد ہونے والے مسرفانہ الفاظ کی اس طوفانی یلغار میں، بیچاری وہ حقیقت منہ چھپائے پھرتی ہے، جسے کبھی خود انہوں نے ہی، اپنے مفہومِ آیت میں بایں الفاظ پیش کیا تھا:

''اور عمران کی بیٹی مریمؑ، جس نے اپنی شرمگاہ (عصمت و پاکدامنی) کی حفاظت کی، چنانچہ اس میں ہم نے اپنی روح پھونک دی، اور اس نے اپنے پروردگار کے کلمات اور کتابوں کی تصدیق کی تھی، اور وہ تھی ہی مطیع و فرمانبردار لوگوں میں سے۔'' [2]

---

[1] مفہوم القرآن، جلد۳، صفحہ ۱۳۲۵ [2] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۵۶۷

وجہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک جگہ بھی، عورتوں کو محصِنات (ص کو زیر کے ساتھ، فاعل کے صیغہ میں) نہیں یاد کیا گیا۔ جو شخص قرآن مجید کا لغت، قرآن مجید کے ذریعہ سے لکھنے کا مدعی ہو، اس کا تو فرض ہے کہ ایسے معاملات میں قرآن مجید اور صرف قرآن مجید پر بھروسہ کرے تا کہ غیروں کے ضلال سے محفوظ رہے۔

دراصل عام قاعدہ یہی ہے کہ عورت مُحْصَنَة (ص پر زبر کے ساتھ مفعول) ہو۔ اس لیے کہ نگران، ماں باپ بھائی شوہر وغیرہ بچپن سے لے کر آخر تک اس کی نگرانی وحفاظت کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عورت خواہ ماں باپ وغیرہ کے ہاں محفوظ ہو، خواہ شوہر کی نگرانی میں رہے، وہ محصَنة کہلاتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن میں شادی شدہ عورتوں کے لیے اُحْصِنَّ (۲۵/۴) فعل مجہول استعمال کیا گیا، اور اسی فعل مجہول سے اسم مفعول محصَنات بنتا ہے۔ لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ شوہر یا ماں باپ کی نگہبانی نصیب نہ ہو، ایسے موقع پر عورتوں کے لیے فعل معروف احصنت استعمال ہو جاتا ہے، بعینہ یہی مؤخر الذکر کیفیت، حضرت مریم پر گذری ....

یاد رکھئے، اسم فاعل ہمیشہ معروف فعل سے بنتا ہے۔ اسی طرح حضرت مریمؑ، قرآن کے بیان کے مطابق محصِنة (ص پر زیر کے ساتھ بصیغۂ فاعل) ہوئیں یعنی بے شادی شدہ، اپنی آپ نگران، نہ کہ مُحْصَنَة (ص پر زبر کے ساتھ، بصیغۂ مفعول)، جس کے معنی ہوتے ہیں، شوہر یا کسی دوسرے کی نگرانی میں رہنے والی۔ قرآن مجید میں اَحْصَنَتْ کے بعد فَرْجَهَا کے لفظ سے اسی معنی کو تقویت مزید حاصل ہو رہی ہے، اور تصریح ہو رہی ہے کہ انہوں نے شادی نہیں کی تھی، بلکہ وہ اپنی فرج کی خود مالک ومحافظ تھیں۔'' [1]

---

[1] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۵۲ تا ۵۴

یہ سادا سا ترجمہ، پرویز صاحب کے اُس دور میں منظر عام پر آیا تھا، جب وہ، انکارِ معجزات کی عینک کے بغیر، مطالعۂ قرآن کیا کرتے تھے، لیکن پھر جب ان کا ذہن بدل گیا، تو مفہوم آیت بھی بدل گیا، لیکن وہ ڈھنڈورا یہی پیٹتے رہے کہ انہوں نے کبھی اپنے ذاتی خیالات کو قرآنی مطالب میں داخل نہیں ہونے دیا۔

....

تصریحِ ثانی احصنت فرجها:

مولانا طاہر سورتیؒ نے دوسری قرآنی تصریح، اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے الفاظ سے استدلال کرتے ہوئے پیش فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں:

''اب آیئے ذرا قرآن مجید کی راہنمائی میں اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا پر غور کرلیں۔ لغت والے تو اس موضوع پر خوب بھٹکے ہیں، اور چونکہ پرویز صاحب نے بھی، اپنی لغات القرآن میں، بجائے قرآن مجید سے لغت کا مفہوم متعین کرنے کے، انہی لغات کی اتباع کی ہے، لہٰذا انہیں بھی لغویین کی حیرانی میں سے وافر حصہ ملا ہے۔ ویسے راغب نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بڑی حد تک قرآن مجید کے مطابق ہے۔''

یقال امرء ۃ مُحْصَنٌ و مُحْصِن فَالْمُحصِنُ اذا تُصُوِّرَ حِصْنُهَا مِنْ نفسها وَالْمحصَنُ اذا تُصُوِّرَ حِصْنُهَا مِنْ غَيْرِهَا

(المفردات، مادہ حصن، صفحہ ۱۲۰)

''یعنی عورت کی صفت محصَن اور محصِن (ص پر زبر کے ساتھ مفعول اور ص پر زیر کے ساتھ فاعل) آتی ہے۔ محصِن اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ خود اپنی عفت کی حفاظت کرے، اور ص پر زبر (مفعول کے صیغہ سے) اس وقت کہا جاتا ہے جب اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کی عفت کی حفاظت کرے۔''

''دراصل، قرآن مجید کے نقطۂ نظر سے عورت نگران و نگہبان کی محتاج ہے۔ یہی

''مصنفِ کتاب'' کی بھونڈی تنقید:

اس تفصیلی، استدلال کی تردید میں، ''مصنفِ کتاب'' نے جو نکات آفرینی کی ہے، ان میں سے پہلا نکتہ بایں الفاظ مرقوم ہے:

> ''شرمگاہوں کی حفاظت سے مراد، انہیں غیر شوہروں سے بچانا ہے، یعنی یہ عورتیں، جنہیں اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے، کا حکم دیا جا رہا ہے، شادی شدہ عورتیں ہیں۔ اسی طرح احصنت فرجھا کا ایک معنیٰ، عورت کا نکاح کرنا بھی ہے، جس کا ذکر بعد میں کیا جائے گا۔'' [1]

یہاں بحث، اَحْصَنَتْ ، مُحْصِنَات اور مُحْصَنَات کے ان الفاظ پر ہو رہی ہے، جو (ح ص ن) کے مادہ سے، قرآن میں آئے ہیں، لیکن جناب ''مصنفِ کتاب'' صاحب، اردو زبان میں مستعمل لفظ ''حفاظت عصمت'' کی آڑ میں، یَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ والی آیت کو، بحث میں گھسیٹ لاتے ہیں، اور پھر جھٹ سے یہ نتیجہ نکال لیتے ہیں کہ جس طرح یَحْفَظْنَ فُرُوجَهُنَّ سے مراد ''عورتوں کا غیر شوہروں سے اپنی عصمت کو بچانا'' ہے، بالکل اسی طرح، اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا میں بھی، ''مریم کا شادی شدہ ہو کر، اپنی عفت و ناموس کو محفوظ رکھنا'' ہے حالانکہ حِفْظِ فُرُوج کی بحث الگ چیز ہے اور احصانِ فُرُوج کی بحث شئے دیگر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت مریمؑ کی عفت و عصمت کی حفاظت کے سلسلے میں، قرآن نے کہیں بھی حفاظتِ فرج کا لفظ استعمال نہیں کیا ہے، بلکہ احصانِ فرج کے ذریعہ ہی اس مفہوم کو پیش کیا ہے۔

مزید برآں، اگر حضرت مریمؑ، واقعی شادی شدہ ہوتیں، تو ان کے لیے فعل مجہول اُحْصِنَتْ آتا، جیسا کہ سورۃ النساء کی آیت ۲۵ میں فَإِذَا أُحْصِنَّ وارد ہوا ہے۔ اور آیتِ زیرِ بحث میں چونکہ فعل معروف آیا ہے، اس لیے ان کا غیر شادی شدہ ہونا واضح ہے، اور یہی وہ استدلال ہے جو مولانا طاہر سورتی مرحوم نے پیش فرمایا ہے، ایسے استدلال کو، مفہومِ

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۴

آیت میں خود ساختہ الفاظ کے ذریعہ، نشانۂ تردید بنانا، ایک بیجا جسارت ہے۔

علاوہ ازیں، اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کے الفاظ مطلق وارد ہوئے ہیں جو کسی شرط کے ساتھ مشروط اور کسی قید کے ساتھ مقید نہیں ہیں، یوں ان الفاظ کا مفاد، یہ قرار پاتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو، بالکُلّیہ، ہر طرح کے حلال یا حرام فعل سے احصان فرج حاصل تھا، اور اس کی تائید دوسرے مقام پر واقع، قرآنی الفاظ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَر وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا سے بھی ہوتی ہے۔

آخر میں یہ بھی جان لیجئے کہ ''مصنفِ کتاب'' کا یہ دعویٰ کہ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کا ایک معنیٰ ''نکاح کرنا'' بھی ہے، قطعی غلط اور بے ثبوت ہے۔

دوسرا نکتۂ تردید:

اس کے بعد، ''مصنفِ کتاب''، مولانا طاہر سورتیؒ کی تردید میں، اپنا دوسرا نکتہ، ان الفاظ میں پیش فرماتے ہیں:

> ''عربی ادب و لغت کے ماہر کا اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا کی تطبیق، آیات (16, 15 : 19) سے کرنا، بیک وقت حیرتناک اور افسوسناک ہے۔ گھر والوں سے الگ ہو کر، کسی مشرقی جانب واقع، جگہ جا کر، ان سے پردہ کر لینے یا اوٹ میں آ جانے سے شرمگاہ کی حفاظت کرنے کا کون سا پہلو نکلتا ہے؟ کیا گھر والوں سے اپنی شرمگاہ کی حفاظت کی تھی؟''[۱]

لیکن سوال یہ ہے کہ مولانا طاہر سورتیؒ نے کہاں اور کس مقام پر، اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا اور سورہ مریم کی آیات ۱۵ اور ۱۶ کے درمیان تطبیق دی ہے؟ وہ تو صرف یہ فرما رہے ہیں کہ اپنے اہل خانہ سے علیحدگی اختیار کر لینے کے بعد، حالتِ دوشیزگی میں، انہیں حمل قرار پایا، اور حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ ولادت کا معجزہ صادر ہوا۔ انہوں نے یہ تطبیق بین الآیات کہاں کی ہے؟ معلوم ہوتا ہے کہ ''مصنفِ کتاب'' کو تطبیق بین الآیات کا مفہوم تک معلوم

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۶۴ تا ۶۵

نہیں ہے، اور وہ یہ بے تکی گفتگو محض اس لیے فرما رہے ہیں کہ مولانا طاہر سورتی صاحب کے قوی استدلال کے جواب میں، کچھ نہ کچھ قلمی ورزش کے ذریعہ، اپنے قارئین کو یہ اطمینان دلا سکیں کہ ہم نے مخالفین کی تردید کر ڈالی ہے۔

تیسرا نکتۂ تردید:

اس کے بعد، وہ، اپنے تیسرے نکتۂ تردید میں ، بے جا طول بحث سے کام لیتے ہوئے، فرماتے ہیں:

> جب حضرت مریمؑ ، ہیکل میں تھیں، تو متولی ان کا دل جیتنے کے لیے، کھانے کی کوئی نہ کوئی چیز، ان کی شہ نشین (محراب) میں رکھ جاتے۔ حضرت زکریاؑ نے کئی بار جب یہ کھانے دیکھے، تو حضرت مریمؑ سے پوچھا یہ کھانا کہاں سے آتا ہے؟ تو وہ بھولی بھالی لڑکی کہہ دیتی کہ اللہ کی طرف سے آتا ہے۔ حضرت زکریاؑ سمجھ گئے کہ متولی، مریمؑ پر بُری نظر رکھتے ہیں۔ لہٰذا، انہوں نے اپنے لیے دعا کی کہ اللہ انہیں بیٹا دے جو وارث ہو۔ جب حضرت مریم جوان ہوئیں تو یہ متولی، قرعہ اندازی کرنے لگے کہ کون مریمؑ کا کفیل یعنی شوہر بنے۔ لیکن وہ قرعہ اندازی کے نتیجہ پر متفق نہ ہو سکے بلکہ جھگڑنے لگے۔ حضرت مریمؑ، ان کے شر سے بچنے کی دعائیں کرتی تھیں جو سنی گئیں، اور انہیں ایک بیٹے کی بشارت کے ذریعے ، ہیکل سے نکل کر، نکاح کرنے کا اشارہ دیا گیا جس پر آپ نے عمل کیا۔ اللہ کا فرستادہ ہی وہ شخص تھا جس نے آپ سے نکاح کیا، اور نتیجۃً آپ کو حمل ہوا۔ طاہر سورتی مرحوم پتہ نہیں کس طرح اپنی مذکورہ بالا تطبیق کی کوشش کو اسالیب قرآن پر گہری نظر کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ بالفرض یہ مان لیا جائے کہ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا کی آیت (مریم ۱۹: ۱۵، ۱۶) سے تطبیق درست ہے تو اس سے یہ کیسے لازم آتا ہے کہ وہ ہمیشہ بے شادی شدہ رہیں، اور طاہر سورتی مرحوم کس طرح دعویٰ کر سکتے ہیں کہ...... ''اس سے تصریح ہو رہی ہے کہ انہوں نے

شادی نہیں کی تھی، وہ اپنی فرج کی خود مالک و محافظ تھیں''...... کیا حضرت مریم، تمام عمر روزانہ اِذا انتبذت من اھلھا مکانا شرقیا (۱۶) فاتخذت من دونھم حجابا (۱۷) کی مصداق بنی رہیں۔ نتیجہ اخذ کرنے میں کچھ تو معقولیت ہونی چاہیئے۔ [1]

اب قرآن کریم میں، نہ تو یہ مذکور ہے کہ ہیکل کے متولی خود اشیاءِ خورد و نوش، محرابِ مریم میں رکھ دیا کرتے تھے، اور نہ ہی یہ کہ مریم ایسی بھولی بھالی، سادہ لوح اور سیدھی سادی تھیں، اور اتنی بھی عقل و دانش اور سمجھ بوجھ نہ رکھتی تھیں جتنی آج کے دور میں ''مصنفِ کتاب'' کو حاصل ہے کہ پوچھنے پر بھی حضرت زکریاؑ کو حصولِ رزق کا صحیح ذریعہ نہ بتا سکیں، اور نہ ہی یہ کہ ہیکل کے متولی، مریمؑ پر بُری نظر رکھتے تھے، اور نہ ہی یہ کہ مریمؑ ان بدطینت متولیوں کے شر سے خود کو محفوظ رکھنے کے لیے دعائیں کیا کرتی تھی، اور نہ ہی یہ کہ اللہ کا فرستادہ ہی وہ شخص تھا جو بعد میں مریمؑ کا شوہر اور حضرت عیسٰیؑ کا باپ بنا۔ یہ ساری باتیں، ''مفکرِ قرآن'' اور ''مصنفِ کتاب'' نے تسویلِ نفس کے بل بوتے پر، تحریفِ آیات اور بین القوسین اضافوں کے ذریعہ، قرآن پاک میں گھسیڑ ڈالی ہیں، اور پھر اس چوری پر الٹا یہ سینہ زوری کہ اپنے مخالفوں کو نشانۂ تضحیک بنایا جاتا ہے۔

کیا ستم ظریفی ہے کہ...... ''نتیجہ اخذ کرنے میں کچھ تو معقولیت ہونی چاہیئے''...... کا راگ وہ شخص الاپ رہا ہے جو کفیل کا معنیٰ ''شوہر'' کرتے ہوئے، اپنی ''معقولیت'' کا ثبوت فراہم کر رہا ہے، اور آیاتِ قرآن کے تراجم میں، من مانے اضافوں کے ذریعہ، اور ارتکابِ تحریف کرتے ہوئے، اخذِ نتائج میں ''معقولیت'' کا دم بھر رہا ہے، اور اپنی تضاد گوئی کے باعث، کبھی یہ کہتا ہے کہ حضرت مریمؑ کو رزق پہنچانے والے، ہیکل کے متولی تھے، اور کبھی یہ کہ، یہ کام کرنے والے وُہ موالی تھے، جن کا ذکر، حضرت زکریا نے انی خفت الموالی من ورائی کے الفاظ میں کیا ہے، چنانچہ یہاں، اقتباسِ بالا میں تو یہ کہا گیا کہ ہیکل

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۵

کے متولی، محراب مریمؑ میں اشیاء خوردنی فراہم کیا کرتے تھے، جبکہ ایک اور مقام پر، یہی صاحب فرماتے ہیں:

''ہیکل میں حضرت مریمؑ کے نگران، حضرت زکریاؑ تھے۔ انہوں نے کئی بار دیکھا کہ حضرت مریمؑ کو اُن کی غیر حاضری میں کوئی نہ کوئی، کھانے کی چیز پہنچائی جا رہی ہے، تو انہوں نے حضرت مریمؑ سے پوچھا کہ یہ کھانے کی چیزیں انہیں کہاں سے ملتی ہیں۔ اس کے جواب میں اس بھولی بھالی لڑکی نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ سے۔ اس پر حضرت زکریاؑ نے محسوس کر لیا کہ یہ کام بدنیت موالی کر رہے ہیں۔ وہ بوڑھے تھے اور اپنی کوئی اولاد نہیں تھی، اس لیے ان شریر موالی کے خوف کے باعث، اللہ تعالیٰ سے بیٹے کی دعا کی۔ سورہ مریم سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے جہاں انہوں نے فرمایا وَاِنِّي خِفْتُ الْمَوَالِيَ مِن وَّرَائِي .''[1]

یوں اپنی تضاد بیانیوں کے ذریعہ، ''معقولیت'' کا ثبوت فراہم کیا جا رہا ہے۔

اب، یہی مصنف، اپنی کتاب کے صفحہ ۶۵ پر دیئے گئے، مندرجہ بالا اقتباس کے ساتھ ہی، مزید فرماتے ہیں:

''اس معنی میں لینے کے باوجود، اگلی آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فرستادہ، وہاں پہنچا، جہاں مریمؑ، اپنے گھر والوں سے علیحدہ ہو کر، پردہ کیے بیٹھی تھی، اور انہیں نکاح کا پیغام دیا، چنانچہ نکاح ہو گیا، اور اس کے نتیجہ میں وہ حاملہ ہو گئیں۔ عورتوں کا حمل، مردوں کے ذریعہ ہوا کرتا ہے۔''[2]

قرآن کریم میں نہ تو فرستادہ (روح) کو انسان قرار دیا گیا ہے، اور نہ ہی مریمؑ کو، اُس کی طرف سے پیغامِ نکاح کے دیئے جانے کا ذکر ہے، اور نہ ہی وقوعِ نکاح کا تذکرہ ہے، اور نہ ہی کسی نکاح کے نتیجہ میں، مریمؑ کا حاملہ ہونا مذکور ہے۔ قرآن مجید کی طرف، یہ سب

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۷ [2] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۵

باتیں، صرف اس لیے منسوب کی جا رہی ہیں، تاکہ موصوف، اپنی ''معقولیت'' کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے، مسیح علیہ السلام کی معجزانہ ولادت کا انکار کر ڈالیں۔

چوتھا نکتہ، تردید:

اپنے چوتھے نکتے میں، ''مصنفِ کتاب''، کسی مسلمان ماہرِ لغت کی کتاب کی بجائے، ایک ایسی کتاب کو اپنی تائید میں پیش کرتے ہیں جس کا مصنف عیسائی ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''المنجد میں ہے: احصنت المرء ة : عفت فهي محصنة اى عفيفة، تزوجت لان زواجها قد اَحْصَنَهَا فَهِيَ مُحْصَنَة بفتح الصاد اى متزوجة . یعنی احصان کی نسبت، عورت کی طرف ہو تو اس کے دو معنی ہوتے ہیں: ایک تو یہ کہ عورت کا اپنی عفت و عصمت کی حفاظت کرنا، یا کدامن ہونا، چنانچہ اسے مُحْصِنَة یعنی عفیفہ کہا جاتا ہے، دوسرا معنی عورت کا شادی شدہ ہونا، کیونکہ شادی کر کے وہ، اپنے شوہر کی حفاظت میں آ جاتی ہے، اس لیے اسے مُحْصَنَةٌ (ص کی زبر سے) یعنی شادی شدہ کہا جاتا ہے۔'' [1]

المنجد کی یہ مثال، احصنت فرجها کے الفاظ سے قطعی غیر متعلق ہے۔ کیونکہ المنجد کے الفاظ ہیں احصنت المرء ة، جس میں مفعول کا ذکر ہی نہیں، جبکہ آیت میں مفعول (فرجها) مذکور ہے، اور یہی الفاظ مولانا طاہر سورتی مرحوم کا مبنیٰ استدلال ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ شادی شدہ عورت کے مُحْصَنَة اور غیر شادی شدہ کے لیے مُحْصِنَة کا لفظ آتا ہے۔ اول الذکر لفظ میں، عورت کی حفاظتِ عصمت کا سبب، شوہر ہوتا ہے، اور عورت کی شادی کا معنیٰ، اس وقت پیدا ہوتا ہے، جبکہ اِحْصَان سے آنے والا فعل، مجہول ہو، جیسا کہ قرآن میں فَإِذَا أُحْصِنَّ مذکور ہے۔ اس صورت میں وہ عورت مُحْصَنَة (بفتح الصاد) بصیغۂ مفعول ہوگی۔ جیسا کہ خود قرآن میں وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ النِّسَآءِ میں

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۵

محصنات (بفتح الصاد اور بصیغۂ مجہول) مراد ہے۔ اب رہا اَحْصَنَتِ المرءۃ کا معنیٰ شادی شدہ ہونا، تو یہ اس صورت میں صحیح قرار پا سکتا ہے، جبکہ اَحْصَنَتْ کی بجائے اُحْصِنَتْ کا لفظ آیا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ المنجد میں بھی، اس عورت کو،، جو شادی کے باعث، شوہر کی حفاظت میں آ جاتی ہے، اسے مُحْصَنَة کہا گیا ہے۔ اسی بات کو، علامہ راغب اصفہانی نے بھی بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

یُقَالُ اِمْرَءَۃٌ مُحْصَنٌ و مُحْصِنٌ ، فَالْمُحْصِنُ یُقَالُ اِذَا تُصُوِّرَ حِصْنُهَا مِنْ نَفْسِهَا وَالْمُحْصَنُ یُقَالُ اِذَا تُصُوِّرَ حِصْنُهَا مِنْ غَیْرِهَا.[1]

''یعنی عورت کی صفت مُحْصَن اور محصن (ص پر زبر کے ساتھ مفعول اور ص پر زیر کے ساتھ فاعل) آتی ہے ص پر زیر، فاعل کے صیغہ سے مُحْصِنْ اس وقت کہا جاتا ہے جب وہ خود اپنی عفت کی حفاظت کرے ۔ اور (ص پر زبر، مفعول کے صیغہ سے) مُحْصَن ، اس وقت کہا جاتا ہے، جب اس کے علاوہ کوئی دوسرا اس کی حفاظت کرے۔''

منکرین حدیث کے سارے مکائد، اس وقت دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں، جب ان کے سامنے، خود پرویز صاحب کا اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم مجبور ہیں کہ قطع نزاع اور واضح فیصلہ کے لیے، خود پرویز صاحب ہی کا ایک اقتباس پیش کر دیا جائے۔

''راغب نے کہا ہے کہ مُحْصِنٌ (حفاظت کرنے والی) اس وقت کہتے ہیں جب وہ (غیر شادی شدہ حالت میں) اپنی عفت کی حفاظت آپ کرے، اور مُحْصَنٌ (جس کی حفاظت کی جائے)، جب اس کی عصمت کی حفاظت، شادی کے ذریعہ سے ہو جائے۔''[2]

الحمدللہ ! پرویز صاحب کے الفاظ ہی سے یہ مسئلہ، واضح ہو گیا۔ حضرت مریمؑ کے لیے، قرآن کریم میں فعلِ معروف آیا ہے، لہٰذا وہ مُحْصِنٌ (جس کی مؤنث مُحْصِنَة

---

[1] المفردات للراغب، صفحہ ۱۲۱ [2] لغات القرآن، جلد دوم، صفحہ ۵۱۸

ہے) ہیں، نہ کہ مُحْصَنٌ (جس کی تانیث مُحْصَنَۃٌ ہے)۔ان تصریحات کو دیکھتے ہوئے بھی یہ کہنا کہ قرآن مجید میں، حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ ولادت کی صراحت نہیں ہے، نری ضد اور ہٹ دھرمی ہے۔

فنفخنا فیه اور فنفخنا فیها میں مرجعِ ضمیر:

یہاں، ایک اور بات بھی قابلِ غور ہے، سورۃ الانبیاء میں فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِن رُّوْحِنَا کہا گیا ہے، اور سورۃ التحریم میں فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِن رُّوْحِنَا کے الفاظ آئے ہیں۔یعنی ایک جگہ ضمیر مجرور، مؤنث ہے اور دوسری جگہ مذکر ہے۔ پرویز صاحب نے اپنی قدیم و جدید جملہ تصانیف میں، فیہ میں واقع ضمیر مذکر کا مرجع، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قرار دیا ہے، چنانچہ وہ اپنی ایک قدیم تصنیف میں یہ لکھتے ہیں:

"یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِن رُّوْحِنَا (۲۱/۹۱) میں فیھا کی ضمیر مؤنث ہے، لیکن سورۂ تحریم میں فَنَفَخْنَا فِيْهِ مِن رُّوْحِنَا آیا ہے(۶۶/۱۲)۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اس مؤخر الذکر آیت میں فیہ کا مرجع، فرج ہے (آیت ،قرآن کریم سے نکال کر دیکھئے)، لیکن قیاسِ غالب یہ ہے کہ فِيْهِ میں ضمیر مذکر، حضرت عیسیٰ کی طرف راجع ہے، جن کا ذکر مستور ہے۔" [1]

حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سورۂ تحریم کی یہ آیت تو رہی ایک طرف، پوری سورہ میں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ذکر موجود ہی نہیں ہے، کجا یہ کہ ان کے ذکر کو، مکشوف یا مستور قرار دیا جائے۔ بہرحال، ان کی بعد کی تصانیف میں بھی فیہ کی ضمیر کا مرجع، حضرت عیسیٰؑ ہی کو قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ مفہوم القرآن، جلد سوم، صفحہ ۱۳۳۵ اور شعلۂ مستور، صفحہ ۱۲۲ کے مطالعہ سے ظاہر ہے۔ لیکن "مصنفِ کتاب" اس ضمیر کا مرجع، فرج کو قرار دیتے ہوئے ...... "اس کی شرمگاہ میں (روحوں میں سے) ایک روح کو نفخ کر دیا" ...... کے الفاظ میں، ترجمۂ آیت پیش کرتے ہیں۔ اب رہی سورۃ الانبیاء والی آیت، جس میں ضمیر مجرور،

---

[1] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۵۵۹

مؤنث واقع ہوئی ہے، تو پرویز صاحب اپنی ابتدائی کتاب میں، اس ضمیر کا مرجع، حضرت مریمؑ کو قرار دیا کرتے تھے: جیسا کہ ان کے مندرجہ ذیل اقتباس ظاہر کرتا ہے:

''حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے سلسلہ میں یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ میں اپنی روح پھونک دی فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا (۲۱/۹۱)''[۱]

لیکن اپنی بعد کی تصنیفات میں، ''مفکر قرآن'' نے انتہائی ژولیدہ فکری کا مظاہرہ کیا ہے، مثلاً مفہوم القرآن میں، سادہ اور صاف ترجمہ کی بجائے، وہ مفہوم آیت کے نام سے الفاظ کا ایسا سیل رواں پیش کرتے ہیں، جس میں حقیقت ڈھونڈے سے نہیں ملتی۔ اور نفخ روح کو، انسانی تخلیق کے ساتھ گڈ مڈ کر کے، لفاظی اور طول نویسی کے ذریعہ، اصل حقیقت سے مفہوم کو بہت دور لے جاتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے، ان کا یہ اقتباس، جس میں، وہ، ساحرانہ طرز تحریر اپناتے ہوئے، بڑے زورِ قلم کے ساتھ، بھرپور لفاظی کی آڑ میں، مغالطہ آرائی کے ذریعہ، مسخِ حقیقت پر اُتر آتے ہیں، اور فیھا میں واقع مونث ضمیر کا مرجع، عیسیٰؑ کو قرار دیتے ہیں۔

''اور ان کے ساتھ ہی اُس عفت مآب خاتون کا معاملہ بھی یاد کرو جسے ہم نے (یہودیوں کی خودساختہ شریعت کے علی الرغم) عیسیٰؑ جیسا بیٹا عطا کیا، اور جس طرح ہر انسانی بچے میں خدائی توانائی کا شمہ ڈال کر اسے صاحبِ اختیار وارادہ انسان بنا دیا جاتا ہے، اسے بھی ایسا ہی بنایا (۳/۴۴، ۱۹/۱۶، ۳۲/۹)۔ وہ دونوں، اقوامِ عالم کے لیے اس بات کی نشانی تھے کہ احکام خداوندی اور انسانوں کی خودساختہ شریعت کے فیصلوں میں کتنا فرق ہوتا ہے۔ (یہودیوں کی خودساختہ شریعت نے انہیں ...... معاذ اللہ...... مردود وملعون قرار دیا، اور خدا کی شریعت نے انہیں مقرب ومقبول ٹھہرایا)۔''[۲]

قبل اِس کے کہ اِس مغالطہ آرائی کی حقیقت واضح کی جائے، یہ جان لیجئے کہ اس

---

[۱] معارف القرآن، جلد۳، صفحہ ۵۵۹ [۲] مفہوم القرآن، جلد۲، صفحہ ۷۴۵

اقتباس میں ۳۲/۴۴ اور ۱۹/۱۶ کے جو حوالے دیئے گئے ہیں ان میں نفخِ روح کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے، البتہ ۳۲/۹ میں اس کا ذکر ہے، اور اسے مغالطہ آفرینی اور چکمہ دہی کا ذریعہ بنایا گیا ہے۔ الفاظ آیت ملاحظہ فرمائیے:

ثم سَوّٰاهُ وَ نَفَخَ فِيْهِ مِن رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لكم السَّمْعَ ....

''پھر اس کو درست کیا اور اس میں روح پھونک دی اور تمہارے کان بنائے۔''

کسی کے ہیولیٰ بدن میں روح پھونکنے کا سادہ صحیح اور عام فہم مفہوم یہ ہے کہ ''اسے زندہ کیا''، ''زندگی بخشی''، ''بے جان سے جان دار بنایا''۔ کسے زندہ کیا؟ کسے زندگی بخشی؟ کسے بے جان سے جان دار بنایا؟ اُسے جس میں ''روح پھونکی''، (نہ کہ اُسے جو اُس کے پیٹ میں ہے)۔ اب آیت ۲۱/۹۱ کے الفاظ ملاحظہ فرمائیے:

وَالَّتِيْٓ اَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيْهَا مِن رُّوْحِنَا وَجَعَلْنٰهَا وَابْنَهَآ اٰيَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ (الانبياء — ۹۱)

''اور وہ خاتون جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تھی، ہم نے اس کے اندر اپنی روح میں سے پھونکا، اور اسے اور اس کے بیٹے کو دنیا بھر کے لیے نشانی بنا دیا۔''

اب غور فرمائیے کہ حضرت مریمؑ میں روح پھونکنے سے مراد، تو یہ نہیں ہو سکتا کہ ''اسے زندگی بخشی'' اور ''بے جان سے جان دار بنایا'' کیونکہ وہ تو خود اس نفخ روح سے قبل، نہ صرف زندہ تھیں بلکہ اپنی عصمت کو بھی محفوظ رکھے ہوئے تھیں، لا محالہ، اس نفخ روح سے مراد، انہیں بلا مسِّ بشر حاملہ کر کے، حضرت عیسیٰ کی بن باپ ولادت کو واقع کرنا ہے، اور یہی وہ چیز ہے، جو نفخ روح کے نتیجہ میں، حضرت مریمؑ اور ان کے فرزند کو ایک نشانی بناتی ہے، فیہا میں واقع ضمیر مؤنث کا مرجع، نہ تو اس آیت ہی میں حضرت عیسیٰؑ کو قرار دیا جا سکتا ہے، اور نہ ہی سورہ تحریم کی آخری آیت میں، جس میں اگرچہ ضمیر مذکر فِيْهِ آئی ہے، لیکن اس کا مرجع فرجها (شرمگاہ مریم) ہے۔ حضرت عیسیٰؑ کا ذکر، نہ صرف اس آیت میں بلکہ پوری سورت میں موجود نہیں ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ یہ لوگ، اپنی تحریفی

کارگزاریوں کے ذریعہ، قرآن مجید سے من مانے معانی اخذ کرنے کی خاطر، نہ تو مراجعِ ضمیر کا لحاظ رکھتے ہیں اور نہ ہی، معانی آیت کو بدلنے کے لیے بین القوسین الفاظ کے اضافوں سے گریز کرتے ہیں۔

بہرحال جناب طاہر سورتی کی یہ تصریح بھی حضرت عیسیٰؑ کی بے باپ ولادت پر دال ہے۔

....

تصریح ثالث......لفظ اھل کا اہم پہلو:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی تیسری تصریح، لفظ اَھل کے اُس مدلول و مفہوم سے تعلق رکھتی ہے، جو عربوں کے ہاں بھی معروف و متداول تھا۔ پرویز صاحب کا ذہن، چونکہ اپنا الو سیدھا کرنے کی خاطر، تاویلات ہی میں الجھا رہتا ہے، اس لیے قرآنی حقائق، خود اُن سے بُعد اختیار کرنے پر مجبور تھے، ایسے اہم موضوعات، ان کی موشگافیوں میں انہماک کے باعث، نظر انداز ہو جایا کرتے تھے۔ طاہر سورتیؒ فرماتے ہیں:

> ''جب ہم اس لفظ کو کسی مرد کی طرف مضاف بنا کر اھل الرجل ''مرد کے اہل'' کہیں تو اس میں سب سے پہلے، اس کی بیوی اور پھر اس کے بچے اور پھر اس سے وابستہ متعلقین اور بعد ازاں اس کے دیگر اقرباء (بشرطیکہ قرینہ اجازت دے) کا تصور سامنے آتا ہے............
>
> لیکن جب اھل کا مضاف الیہ، مرد کی بجائے عورت ہو، یعنی ہم کہیں ''اھل المرء ۃ'' تو اس میں سب سے پہلے عورت کے ماں باپ، بھائی بہن، اس کے دیگر میکے کے رشتہ دار مراد ہوتے ہیں، اور پھر آخر میں اس کے بچے یا اس کا شوہر مراد لیے جا سکتے ہوں تو غور کیا جا سکتا ہے، کیونکہ قرآن مجید میں مجھے مؤخر الذکر معنی کے لیے کوئی دلیل نہیں ملی، یعنی اگر اھل الرجل کہا جائے تو اس میں مرد کی بیوی سے لے کر اس کے بچے، اقرباء، سب ہی آ جاتے ہیں، لیکن اھل المرء ۃ کہا جائے تو اس میں عورت کے شوہر کا تصور تقریباً مفقود ہوتا ہے۔ مثلاً

قرآن مجید میں ہے فَانْكِحُوهُنَّ بِإِذْنِ أَهْلِهِنَّ عورتوں سے ان کے اہل کی اجازت سے نکاح کرو (۴/۲۴)۔ ظاہر ہے کہ یہاں عورتوں کے اہل سے مراد، ان کے ماں باپ اور دیگر میکے کے رشتہ دار ہی ہیں۔ یا پھر وہ لوگ، جن کی سرپرستی میں غیر شادی شدہ عورتیں رہتی ہوں۔ اسی بناء پر قرآن مجید میں جہاں یہ لفظ کسی عورت کی طرف مضاف ہے اس سے مراد شوہر کے علاوہ عورت کے میکے کی طرف سے اس کے رشتہ دار ہی بتائے گئے ہیں، اور یہی وجہ ہے کہ سورہ یوسف میں جہاں ہے شَاهِدٌ مِّنْ أَهْلِهَا اور اس (عزیز کی بیوی) کے اہل میں سے ایک نے گواہی دی (۱۲/) تو یہاں بھی مفسرین نے اس سے مراد، بیوی ہی کا کوئی رشتہ دار لیا ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ یہ لفظ مرد سے مضاف ہو تو اس کے معنٰی بیوی کے علاوہ مرد کے دیگر رشتہ دار ہوں، لیکن یہ نہیں ہوتا کہ یہ لفظ کسی عورت کی طرف مضاف ہو اور اس کے معنٰی، عورت کے شوہر کے ہوں۔ قرآن مجید میں تو ایسا قطعاً نہیں ہے اور یہی اس لفظ کا صحیح قرآنی استعمال ہے۔ دیکھئے قرآن مجید میں جہاں میاں بیوی کے جھگڑے میں فیصلہ کرانے کے لیے کہا گیا ہے، وہاں ہے فابعثوا حکما من اھلہ و حکما من اھلھا تو مرد کے اہل میں سے ایک ثالث اور عورت کے اہل میں سے ایک ثالث بھیجو۔

یہاں قرینہ سے ظاہر ہے کہ مرد کے اہل سے مراد، بیوی نہیں بلکہ اس کے رشتہ دار ہوں گے، لیکن عورت کے اہل سے مراد، اس کے میکے کے رشتہ دار ہی ہوں گے۔ اہل کے متعلق، اس تفصیل کو مدنظر رکھتے ہوئے، اب ذرا ذیل کی آیات ملاحظہ فرمایئے:

وَاذکر فی الکتاب مریم اذا نتبذت من اھلھا مکانا شرقیا (١٦) فاتخذت من دونھم حجاباً .... الخ اور کتاب میں مریم کا ذکر کرو، جب وہ اپنے گھر سے دور ہو کر ایک مشرقی جگہ چلی گئی۔ پھر اس نے ان کے

درمیان حجاب کرلیا (۱۶، ۱۹/۱۷)۔

اھل کی مندرجہ بالا تفصیل کے بعد صاف ظاہر ہے کہ حضرت مریمؑ، اپنے گھر والوں یعنی میکے والوں سے دور چلی گئی تھیں۔ اگر وہ اپنے شوہر سے یا شوہر کے رشتہ داروں سے دور ہوتیں، تو اھلھا کا لفظ استعمال نہ ہوتا۔ اھلھا کے اس معنی سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس وقت حضرت مریمؑ کی شادی نہیں ہوئی تھی، اور اسی حالت میں جب وہ اپنے گھر والوں سے دور چلی گئیں تو ان کو فرشتے نے بچہ دیا۔ لیکن اگر کسی کو اصرار ہو کہ اھلھا سے مراد شوہر ہے اور وہ اپنی ازدواجی زندگی بسر کر رہی تھیں تو یہ ایسے لوگوں کے لیے مزید دشواری کا باعث بن جائے گا، کیونکہ آگے کی عبارت کا یہ مفہوم ہوگا کہ جب مریمؑ اپنے شوہر سے حجاب اختیار کر لیتی ہیں، اس وقت انہیں حمل قرار پاتا ہے، ساتھ ہی اگلی آیتوں میں یہ بھی تصریح ملتی ہے کہ مریم کہتی ہیں کہ مجھے کسی بشر نے چھوا ہی نہیں ہے۔ ملاحظہ فرمایا آپ نے، قرآن کا ایک ایک لفظ کس طرح بالتصریح بتا رہا ہے کہ حضرت مریمؑ غیر شادی شدہ تھیں جب کہ انہیں حضرت عیسیٰ دیئے جاتے ہیں، مگر یہ تصریح دیدۂ بینا ہی دیکھ سکتی ہے۔'' [1]

''مصنفِ کتاب'' کی تردید کا پہلا نکتہ اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتی کے اس جاندار استدلال کی تردید میں ''مصنفِ کتاب'' نے جو کچھ رقم فرمایا ہے وہ یہ ظاہر کرتا ہے کہ کچھ نہ کچھ لکھ ڈالنے ہی کو وہ اپنا کارنامۂ تردید سمجھتے ہیں، قطع نظر اس کے کہ اس کے اندر کوئی معقولیت پائی بھی جاتی ہے یا نہیں۔ چنانچہ وہ اپنی تردید کے اولین نکتہ میں لکھتے ہیں:

''پہلے تو طاہر سورتی مرحوم نے شکایت کی ہے کہ پرویز مرحوم نے لغات القرآن میں اھل کے مفاہیم کا استیعاب نہیں کیا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے

---

[1] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۵۶ تا ۵۹

سورہ مریم کی آیات ۱۶، ۱۷ میں اھلھا کا کیا معنیٰ لیا ہے۔ مریم کے گھر (میکے) والے یا شوہر کے رشتہ دار۔" [1]

یہ ایک قطعی مہمل اور بے جا اعتراض ہے، تاہم اگر "صاحبِ کتاب" یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ پرویز صاحب نے سورہ مریم کی آیات متذکرہ میں اھلھا سے جو کچھ مراد لیا ہے، اسے بیان کیا جائے، تو ہم عرض کیے دیتے ہیں کہ اپنے قدیم و جدید ترجمہ و مفہوم میں ژولیدہ فکری کا شکار ہو کر وہ، کبھی کچھ اور کبھی کچھ مراد لیتے ہیں۔ اپنی قدیم کتاب میں، وہ، اَهْلِهَا سے مراد، "اپنے گھر کے آدمی" لیا کرتے تھے، جیسا کہ درج ذیل اقتباس سے عیاں ہے:

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذِانْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (۱۶، ۱۷/۱۹)

"اور (اے پیغمبر!) کتاب میں مریم کا معاملہ بیان کر۔ اس وقت کا معاملہ، جب وہ ایک مکان میں کہ پورب کی طرف تھا، اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوگئی، اور پھر اس نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کر لیا۔ پھر ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا، اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا۔" [2]

یہ ان کے دورِ ماضی کا ترجمہ ہے جس میں انتبذت من اھلھا کا ترجمہ "اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہوگئی" کے الفاظ میں پیش کیا گیا ہے، لیکن بعد میں، جب یار لوگوں نے انہیں "مفکرِ قرآن" قرار دے کر بانس پر چڑھا دیا، تو انہی آیات کا یہ لفظی کباڑ خانہ، "مفہومِ آیات" قرار پا گیا۔

"اے رسول! اب تو اس کتاب (قرآن) میں، لوگوں سے، مریم کا قصہ بیان کر، اور سلسلۂ کلام کا آغاز اس وقت سے کر جب وہ خانقاہیت کی زندگی کو

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۷

[2] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۱

چھوڑ کر، (اپنے گاؤں ناصرہ میں) چلی گئی تھی جو (وہاں سے) مشرق کی سمت واقع تھا۔

(خانقاہیت کی زندگی اور وہاں کے ناخوش آیند واقعات نے اس کے دل پر ایسا اثر چھوڑا تھا کہ وہ) وہاں بھی لوگوں سے الگ تھلگ رہتی تھی۔ ہم نے (ان اثرات کو مٹانے کے لیے، اسے زندگی کے خوشگوار پہلوؤں کے متعلق) تقویت بخش اشارہ کیا جو (اس کے خواب میں) ایک اچھے بھلے انسان کی شکل میں سامنے آیا۔"[1]

الفاظ کی اس موسلا دھار بوچھاڑ میں سے جو چاہے وہ انتبذت من اهلها کا معنی "اپنے گھر کے آدمیوں سے الگ ہونا" سمجھ لے، اور جو چاہے، وہ "خانقائیت کی زندگی کو چھوڑ کر، چلے جانا" مراد لے لے۔ الفاظ کے اس جنگل میں، من پسند معنی مراد لینے کی کھلی آزادی ہے۔ صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے

دوسرا تردیدی نکتہ اور اس کا جائزہ:

مولانا طاہر سورتیؒ پر یہ اعتراض کرنے کے بعد، کہ انھوں نے یہ نہیں بتایا کہ پرویز صاحب نے سورہ مریم کی آیت ۱۶، ۱۷ میں اهلها کا کیا مفہوم مراد لیا ہے؟ "مصنفِ کتاب" اپنا دوسرا تردیدی نکتہ بایں الفاظ پیش فرماتے ہیں:

پھر استادی دکھائی ہے اور اس کے دونوں معنے لیکر غلط طور پر ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ (1) جب وہ (مریم) اپنے گھر والوں سے دور چلی گئیں، تو ان کو فرشتہ نے بچہ دیا (2) جب حضرت مریمؑ اپنے شوہر سے حجاب اختیار کر لیتی ہیں، اس وقت انہیں حمل قرار پاتا ہے۔"

بندۂ خدا! ان دو آیات میں کہیں بھی نہ تو (فرشتہ) کے بچہ دینے کا ذکر ہے، اور نہ ہی (2) شوہر سے حجاب اختیار کرنے پر حمل قرار پانے کا کوئی ادنیٰ اشارہ

---

[1] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۴

موجود ہے، مگر قرآن مجید کے اسالیب پر گہری نظر والے کو پتہ نہیں کس عبارت سے یہ مفہوم اخذ کرنے کا ذہول ہوا۔"[۱]

اب اس "فاضل تنقید نگار" کو یہ بات کون سمجھائے کہ جب کوئی مصنف، ایک، دو یا تین آیات کا متن پیش کر کے "الخ" لکھ دیتا ہے، تو اس کا پورا استدلال، صرف اُنہی آیات تک محدود نہیں رہتا جن کا متن پیش کیا جا چکا ہے بلکہ اگلی آیات تک وسیع ہو جاتا ہے۔ مولانا طاہر سورتی نے، سورہ مریم کی آیات ۱۶، ۱۷ کا متن درج کر کے "الخ" کا لفظ بھی لکھا ہے تا کہ ان کا استدلال سمجھنے کے لیے اگلی آیات کو بھی قارئین ملحوظ نظر رکھیں۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ خود "مصنفِ کتاب" نے بھی "الخ" کا لفظ، اس طویل اقتباس میں درج کیا ہے جسے مولانا طاہر سورتی کی کتاب پر (صفحہ ۵۷ تا صفحہ ۵۸ تک) سے پیش کیا گیا ہے۔

مزید برآں، مولانا طاہر سورتیؒ نے، اپنے استدلال کے دوران، "آگے کی عبارت" اور "اگلی آیتوں میں" کے الفاظ میں (جنہیں خطِ نسخ میں لکھا گیا ہے) یہ صراحت کر دی ہے کہ ان کا مکمل استدلال، صرف آیات ۱۶، ۱۷ پر ہی موقوف نہیں ہے، بلکہ ان آیات سے "آگے کی عبارت" اور "اگلی آیتوں" پر بھی اساس پذیر ہے، لیکن قرآن کے نام پر باطل پرستی میں مبتلا، اور خواہشاتِ نفس کے پیروکاروں کا یہ حال ہے کہ دل کی آنکھوں سے تو وہ اندھے ہیں ہی، سر کی آنکھوں سے بھی اندھے ہیں، یا پھر جان بوجھ کر، لوگوں کو دھوکہ دینے کے لیے، یہ کہتے ہیں کہ آیات ۱۶، ۱۷ میں، "نہ تو فرشتہ کے بچہ دینے کا ذکر ہے، اور نہ ہی مریمؑ کے حاملہ قرار پانے کا"...... حالانکہ طاہر سورتی کی یہ دونوں باتیں، بعد کی ان آیات میں موجود ہیں، جن کی طرف "الخ" کہہ کر توجہ دلائی گئی ہے۔ رہیں آیات ۱۶ اور ۱۷، تو ان کا متن، بطورِ خاص، اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ اھل کے لفظ سے استدلال، مقصود تھا۔

اب غور فرمائیے کہ "فاضل تنقید نگار"، "الخ"، "آگے کی عبارت" اور "اگلی آیتوں میں" کے الفاظ کو نظر انداز کرتے ہیں، اور مولانا طاہر سورتی صاحب کے پورے استدلال

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۶۷ تا ۶۸

کو، از خود، آیات ۱۶ اور ۱۷ تک محدود و محصور قرار دیتے ہوئے، اپنے ہی خیالات کی دنیا میں گھوم پھر کر، الٹا یہ طنز و طعن کرتے ہیں:

(۱) قرآن مجید کے اسالیب پر گہری نظر والے کو پتہ نہیں کس عبارت سے یہ مفہوم اخذ کرنے کا ذہول ہوا'' ۱

(۲) پھر یہ تصریح دیدۂ بینا کس طرح دیکھ سکی؟ اور یہ معلوم کر سکی کہ حضرت مریمؑ غیر شادی شدہ تھیں ......'' ۲

اس کے بعد، جناب معترض صاحب، آیت ۱۷ کا ٹکڑا پیش کرتے ہوئے، فرماتے ہیں:

''اس ٹکڑے سے بھی، حضرت عیسیٰؑ کے دیئے جانے کا قطعاً کوئی ذکر نہیں، صرف اتنا کہا گیا ہے...... ''تب ہم نے اس (مریمؑ) کی طرف اپنی ایک نیک روح کو بھیجا چنانچہ وہ اس کے روبرو ہوا۔ وہ نیک روح ایک تندرست انسان تھا'' ...... یہ اس ٹکڑے کا سادہ ترجمہ ہے۔'' ۳

ہم بصد ادب، عرض گزار ہیں کہ بظاہر سادہ لوح مگر بباطن پُرکار لوگوں کا یہ ''سادہ ترجمہ'' قطعی غلط ہے۔ اس کی غلطی واضح کرنے کے لیے، ہم مجبور ہیں کہ وہ صحیح ترجمہ پیش کر دیا جائے، جو کبھی خود، پرویز صاحب نے بایں الفاظ تحریر فرمایا تھا۔

''پس ہم نے اس کی طرف اپنا فرشتہ بھیجا، اور وہ ایک بھلے چنگے آدمی کے روپ میں نمایاں ہو گیا۔'' ۴

''مصنفِ کتاب'' کے ترجمہ کی غلطی اس امر سے بھی واضح ہے کہ آیت ۱۷ کا متعلقہ ٹکڑا، دو جملوں پر مشتمل ہے، اس کا ترجمہ بھی دو فقروں ہی پر مشتمل ہونا چاہئے، جیسا کہ پرویز صاحب کے درست ترجمہ سے ظاہر ہے، لیکن جناب ''صاحبِ تصنیف'' نے اپنا ''سادہ ترجمہ'' اِن تین جملوں میں پیش کیا ہے (۱) تب ہم نے اس (مریمؑ) کی طرف اپنی ایک نیک روح کو بھیجا۔ (۲) چنانچہ وہ اس کے سامنے رو برو ہوا (۳) وہ نیک روح ایک

---

۱ + ۲ + ۳ ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۶۸ ۴ معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۱

تندرست انسان تھا۔

مت بھولیے کہ یہ وُہی، ''فاضل تنقید نگار'' ہیں، جو مولانا طاہر سورتیؒ کے کَذَٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ کے اس ترجمہ پر کہ...... ''جو کچھ تو نے کہا ہے واقعہ ایسا ہی ہے، اللہ جو کچھ چاہتا ہے کر دیتا ہے''...... یہ کہہ کر اعتراض وتردید کرتے ہیں:

''کَذَٰلِكَ اور يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ دو جملے نہیں، بلکہ ایک ہی جملہ ہے جب کہ طاہر سورتی کے مطابق یہ دو جملے بنتے ہیں۔ (۱) جو کچھ تو نے کہا واقعہ ایسا ہی ہے (۲) اللہ جو کچھ چاہتا ہے کر دیتا ہے۔ طاہر سورتی مرحوم نے اس غلطی کے تدارک کے طور پر، اپنی تشریح میں دو جملوں کے درمیان، اپنی طرف سے ''مگر'' کا اضافہ کر کے، ان دو جملوں کو ایک جملہ بنانے کی کوشش کی ہے۔''[1]

اب خود سوچئے کہ ''معترض صاحب'' کیا خود وُہی ''غلطی''، سورہ مریم کی آیت ۱۷ کے ''سادہ ترجمہ'' میں نہیں کر رہے ہیں، جس کا الزام، وہ مولانا طاہر سورتی پر عائد کر چکے ہیں؟۔ اگر مولانا طاہر سورتی کا یہ طرزِ عمل غلط ہے کہ وہ ''مگر'' کا اضافہ کر کے، دو جملوں کو، ایک جملہ بنا ڈالتے ہیں، تو خود اُن کا یہی عمل، کیوں غلط نہیں، جب کہ وہ ''چنانچہ'' کا اضافہ کر کے، یہی ''کارنامہ'' انجام دیتے ہیں؟

الغرض، لفظ اھل کی اس جاندار بحث کے مقابلہ میں فاضل تنقید نگار کی تنقید بے معنی ہے۔

....

تصریحِ رابع (اولاد کو منسوب کرنے کا قاعدہ):

حضرت عیسیٰؑ کی بے باپ ولادت پر، چوتھی تصریح، جو مولانا طاہر سورتی مرحوم نے قرآن مجید سے پیش کی، وہ ان الفاظ میں مرقوم ہے:

قرآن مجید اور عربوں کا دستوار ہے کہ وہ ہمیشہ لڑکی کو (شادی سے قبل تک) اور لڑکے کو مطلقاً باپ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ ابھی آپ پچھلے صفحات میں

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۳

دیکھ آئے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو قرآن مجید نے مَرْيَمَ ابْنَتَ عِمْرَانَ (۱۲/٦٦) کہا ہے، یہاں عورت کی باپ سے نسبت ایک طرف تو یہ بتا رہی ہے کہ مریم کنواری رہیں اور دوسری طرف یہ بھی بتا رہی ہے کہ قرآن کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اولاد کو باپ کی طرف منسوب کرتا ہے، یہ عربوں کا مالوف طریقہ ہے۔ وہ اپنی لڑکی کے بیٹے کو، لڑکی کا بیٹا یا لڑکی کی اولاد تسلیم ہی نہیں کرتے، ان کا شاعر کہتا ہے:

بَنُوْنَا وَبنُوا اَبْنَآءِ نَا اَبْنَاءُ نَا
وَبَنُوْهُنَّ اَبْنَاءُ الرِّجَالِ الْاَبَاعِدِ

ترجمہ: ہمارے بیٹے اور ہمارے بیٹوں کے بیٹے (پوتے) تو ہمارے بیٹے ہیں، لیکن ہماری بیٹیوں کی اولاد تو دور کے مردوں کی اولاد ہے۔

"غور طلب امر یہ ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے، عربوں کے دستور کو چھوڑ کر، خود قرآن مجید اپنے دستور سے انحراف کرتے ہوئے، حضرت عیسیٰؑ کو عیسی ابن مریم اور المسیح ابن مَرْيَمَ کیوں کہہ رہا ہے؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لیے پہلے ہم جناب پرویز صاحب کی بصیرتِ قرآنی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اگرچہ یہ معلوم ہے کہ وہ اپنی عادت کے مطابق، قرآن سے کم اور اپنے مغربی اولیاء سے زیادہ مدد لیں گے۔

ان کی قرآنی بصیرت پہلے ہی کہہ چکی ہے کہ قرآن مجید نے اس باب میں کچھ نہیں کہا ہے۔ بہرحال، ملاحظہ فرمایئے کہ کس دیدہ دلیری سے وہ بغیر اس کے کہ قرآن میں غور و فکر کے بعد کسی نتیجہ تک پہنچتے، فوراً ہی اپنے ولی خصوصی، عقلیت پرستوں کے امام، جناب رینان کو مدد کے لیے بلاتے ہیں اور اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کو خیر باد کہہ دیتے ہیں۔ پھر ملاحظہ فرمایئے کہ العروۃ الوثقی اور حبل اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کی دعوت دینے والا کس طرح مکڑی کے جالے میں پناہ گیر ہوتا ہے۔

ذرا آپ بھی اِس نسیجِ عنکبوت یعنی ریٖنان کے بیان کو ملاحظہ فرمائیے اور داد دیجئے اس قرآن پر ایمان لانے کے مدعی کو، جو بجائے قرآن کے، رینان کی بوگس اور شک سے بھری ہوئی عبارت یوں نقل کرتا ہے:

آپ (حضرت عیسٰی) عوام سے متعلق تھے، آپ کے والد یوسف اور آپ کی والدہ مریمؑ، دونوں غریب گھرانے کے افراد تھے۔ دستکاری ان کا پیشہ تھا .... حضرت مسیح کے اور بہن بھائی بھی تھے لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں سے سب سے بڑے آپ ہی تھے .... مادری زبان آپ کی آرامی تھی، یونانی زبان سے آپ واقف نہیں تھے .... آپ کے والد کا انتقال جلد ہی ہوگیا، اور اس کے بعد، حضرت مریمؑ ہی خاندان کی سرپرست رہ گئیں۔ یہ وجہ ہے کہ حضرت مسیحؑ عام طور پر، ابن مریمؑ کے نام سے مشہور ہوئے، یعنی جب آپ کو آپ کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنا ہوتا تھا تو ''یسوع ابن مریم'' کہا جاتا تھا .... الخ (شعلہ مستور، صفحہ ۳۰ نیز لغات القرآن، جلد۴، صفحہ ۱۵۳۷)

ملاحظہ فرمایا آپ نے اس بیان میں ''ایسا معلوم ہوتا ہے'' کا فقرہ، جو قرآن کے یقین کے سامنے شک سے بھرا ہوا ہے، یعنی قرآنی تصریحات علی وجہ الیقین بتا رہی ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ، حضرت مریمؑ کے سب سے بڑے اور پہلے بیٹے تھے۔ پھر ذرا غور فرمائیے، لڑکے کو باپ کی بجائے، ماں کی طرف منسوب ہونے کے متعلق، رینان کس قدر بوگس اور لچر تاویل پیش کر رہا ہے، جس کو نہ قانون کی تائید حاصل ہے، نہ قرآن مجید کی، نہ عرب اور اقوام سامیہ کے مالوف قاعدہ کی، اور نہ عقل ہی کی۔

قارئین حضرات! رینان کی اس عبارت سے شاید آپ خیال کر رہے ہوں گے کہ حضرت عیسٰیؑ کا یہ مصنوعی باپ، بچہ کو ماں کے پیٹ میں چھوڑ کر مر چکا

ہوگا، ورنہ زیادہ سے زیادہ بچہ کے ایک ڈیڑھ سال کی عمر ہونے تک مر چکا ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ اس ''چھوٹی عمر'' کے معنٰی، پرویز صاحب اور ریتان کے نزدیک، تقریباً جوانی کی عمر ہے، اس لیے کہ خود پرویز صاحب، اپنی کتاب شعلۂ مستور کے صفحہ ۲۲ پر، انجیل برنباس کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

جب یسوع عمر کے بارھویں سال تک پہنچا، وہ مریم اور یوسف کے ہمراہ یروشلم میں آیا تھا کہ وہاں خدا کو موسیٰ کی کتاب میں لکھی ہوئی شریعت کے موافق سجدہ کرے (فصل صفحہ ۹)

گویا اس واقعہ کے بعد، اگر دو سال ہی اور، ان کے باپ کو زندہ رکھا جائے، تو وہ اپنے بیٹے کو نوجوان چھوڑ کر مرتے ہیں۔ غور فرمایئے کیا اسے چھوٹی عمر کہا جائے گا؟ کس قدر لغو دلیل ہے جو پیش کی جا رہی ہے۔ کبرت كلمة تخرج من افواههم ان يقولون الا كذبا۔'' [1]

جملہ معترضہ:

قبل، اس کے کہ مولانا طاہر سورتیؒ صاحب کی اس مفصل قرآنی تصریح پر، ''مصنفِ کتاب'' کے تردیدی موقف کو پیش کیا جائے، یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ جناب پرویز صاحب اور ان کے اندھے مقلدین کی طرف سے، آقایانِ مغرب کی ہمنوائی میں، یہ جو راگ الاپا جاتا ہے کہ...... ''مسیحؑ کے والد کے انتقال کے بعد، چونکہ حضرت مریم ہی واحد سرپرستِ خاندان تھیں، اس لیے وہ ابن مریمؑ کے نام سے مشہور ہوئے'' یا یہ کہ ''حضرت عیسیٰ کو، ان کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنے کے لیے، انہیں ابن مریم کہا جاتا تھا''......اس کی لغویت کو واضح کر دیا جائے۔

کنواری مریمؑ کے بطن میں، ابھی وجودِ پسر کی بناء ہی نہیں پڑی تھی، اور حضرت عیسیٰؑ، ابھی متولد ہی نہیں ہوئے تھے، اور اُن کے ہم نام بچوں سے انہیں متمیز کرنے کا سوال ہی پیدا

---

[1] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۵۹ تا صفحہ ۶۲

نہیں ہوا تھا کہ بحکمِ خدائے قدوس، فرشتوں نے، حضرت مریمؑ کو یہ کہہ کر بشارتِ فرزند دی:

إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِنْهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ

''بیشک اللہ تمہیں اپنی طرف سے ایک ایسے کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح، عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔''

اب کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ولادتِ مسیح سے قبل ہی، ان کے ہم نام بچوں سے متمیز کرنے کا سوال پیدا ہو چکا تھا؟ یا یہ کہ وہ قبل از پیدائش، ابن مریم کی ''کنیت'' سے شہرت پا چکے تھے؟ ان لوگوں کی ایسی ہی بے تکی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ انہیں، قرآن مجید کے مقابلہ میں، اپنے تصورات کس قدر عزیز ہیں۔

''معترض'' کا پہلا تردیدی نکتہ:

اب ملاحظہ فرمائیے، ''معترض صاحب'' کا پہلا تردیدی نکتہ، اور پھر خود ہی اندازہ لگا لیجئے کہ اولاد کے باپ کی طرف، منسوب ہونے کا عملی تقاضا کیا ہے، اور ہمارے ناقد و معترض، اس عملی تقاضے کی کہاں تک پاسداری فرماتے ہیں:

''اولاد کو منسوب کرنے کے متعلق، طاہر سورتیؒ مرحوم نے جو تصریحات رقم فرمائی ہیں، ان سے ثابت ہوتا ہے کہ مالوف عرب دستور اور قرآن کے مطابق اولاد، باپ کی طرف منسوب کی جاتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے باپ ضرور ہوتے ہیں، اگر کچھ بچے بغیر باپ کے ہوتے ہوں یا ہو سکتے ہوں، تو یہ دستور اور عام قاعدہ، غلط ٹھہرے گا۔'' [۱]

تردیدی نکتہ کا جائزہ:

''تنقید نگار'' صاحب کا یہ جواب، سوال گندم، جواب چنا، کی حیثیت رکھتا ہے۔ مولانا طاہر سورتیؒ مرحوم نے اسلوبِ عرب اور قرآن کریم کی روشنی میں یہ سوال اٹھایا تھا کہ اگر

۱۔ ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷

واقعی، حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا کوئی باپ ہوتا، تو قرآن کو یہ چاہئے تھا کہ انہیں (ماں کی بجائے) باپ کی طرف منسوب کرتا۔ دیکھئے حضرت مریمؑ، چونکہ بن باپ کے پیدا نہیں ہوئیں، اور عمران نامی شخص، ان کا باپ تھا، قرآن نے اپنے قاعدے کے مطابق، حضرت مریم کو، مریم ابنت عمران کہہ کر، ان کے باپ کی طرف منسوب کیا۔ اسی طرح، اگر حضرت عیسیٰؑ کا بھی یوسف نامی کوئی شخص باپ ہوتا، تو قرآن، اپنے قاعدے کے مطابق، ضرور انہیں عیسیٰ بن یوسف کہہ ڈالتا۔ جس قرآن نے متعدد مرتبہ، انہیں، عیسیٰؑ بن مریم اور مسیح ابن مریم کہا، کیا وہ ایک مرتبہ بھی عیسیٰ بن یوسف نہیں کہہ سکتا تھا؟ کہہ سکتا تھا، لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ کیوں؟ اس ''کیوں؟'' کا جواب، جناب ''فاضل تنقید نگار''، محض معجزانہ ولادتِ مسیحؑ کا انکار کرنے کی خاطر، بایں الفاظ دیتے ہیں کہ...... ''اس کی وجہ یہ ہے کہ اولاد کے باپ ضرور ہوتے ہیں، اگر کچھ بچے، بغیر باپ کے ہوتے ہوں یا ہو سکتے ہوں، تو یہ دستور اور عام قاعدہ، غلط ٹھہرے گا''...... گویا، اس ''دستور اور عام قاعدہ کو، غلط نہ ٹھہرانے کی خاطر''، یہ ساری سخنسازی کی گئی ہے، لیکن اس سخنسازی کے دوران، جناب ''تنقید نگار'' صاحب کو یہ خیال نہ آیا کہ خدا کی طرف سے، **اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ** ''لوگوں کو ان کے باپ کی طرف منسوب کر کے بُلایا کرو'' کا قاعدہ طے کر ڈالنے کے بعد، خود خدا ہی کے ہاتھوں، اس کی دھجیاں اڑ جاتی ہیں جبکہ وہ خود، حضرت عیسیٰؑ کو، باپ کی بجائے، اُن کی ماں کی طرف منسوب کر ڈالتا ہے (باوجودیکہ، بقول منکرینِ حدیث، اُن کا باپ، یوسف، موجود تھا، اور اللہ تعالیٰ نے یوں، اپنے مقرر کیے ہوئے ضابطے کو، خود اپنے عمل سے غلط ٹھہرا دیا)۔

دوسرا تردیدی نکتہ اور اس کا جائزہ:

جناب ''فاضل تنقید نگار'' صاحب کا دوسرا تردیدی نکتہ بھی، ان کے پہلے نکتے کی طرح، سوال از آسماں و جواب از ریسماں، کا مصداق ہے، وہ لکھتے ہیں:

''جہاں تک طاہر سورتی مرحوم کے ایک عرب شاعر کے نقل کردہ قول کا تعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹے اور پوتے تو ہم مردوں کی اولاد ہوتے ہیں

اور ہماری بیٹیوں کی اولاد ہمارے دامادوں کی اولاد ہوتی ہے، بالکل صحیح ہے، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ بیٹے ہوں یا پوتے، نواسے ہوں یا نواسیاں، ان کے باپ ضرور ہوتے ہیں۔ لیکن طاہر سورتی مرحوم حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا شدہ منوانے پر تلے ہوئے ہیں، اور اس دستور اور قاعدہ کی صریح خلاف ورزی کر رہے ہیں۔'' [1]

جی ہاں! جن کے باپ ضرور ہوتے ہیں ان کے باپوں کا انکار نہیں، اور نہ ہی شاعر نے یہ بات کہی کہ ''ہمارے بیٹے اور پوتے تو ہماری اولاد ہیں، لیکن ہماری بیٹیوں کی اولاد، بے باپ ہوا کرتی ہے''، اور نہ ہی شاعر کا یہ مطلب ہے کہ ''ہماری بیٹیوں کی اولاد، اگر ہماری اولاد نہیں، تو وہ کسی کی بھی اولاد نہیں''، طاہر سورتی صاحب نے شاعر کے شعر سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ عربوں کے ہاں اولاد، باپوں ہی کی طرف منسوب ہوتی ہے، نہ کہ ماؤں کی طرف۔ اگر واقعی حضرت عیسیٰؑ کا باپ، یوسف ہوتا، تو اس دستور کے مطابق، انہیں بھی ماں کی بجائے، باپ ہی کی طرف منسوب کیا جاتا، اور انہیں عیسیٰ بن مریم کہنے کی بجائے، عیسیٰ بن یوسف کہا جاتا۔ لیکن ''معترض صاحب''، اس شعر سے، کچھ اور ہی نتیجہ برآمد کرتے ہیں، بالکل اُس بھوکے بھکاری کی طرح، جس سے جب یہ پوچھا گیا کہ ''دو اور دو کتنے ہوتے ہیں؟'' تو وہ جھٹ بول اٹھا ''چار روٹیاں''، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ ''بیٹے ہوں یا پوتے، نواسے ہوں یا نواسیاں، چونکہ سب کے باپ ہوتے ہیں، لہٰذا، ثابت ہوا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بھی باپ تھے'' اور پھر الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق، طاہر سورتیؒ صاحب کو یہ کہہ کر نشانۂ طنز بناتے ہیں کہ...... ''وہ، حضرت عیسیٰؑ کو بغیر باپ کے پیدا شدہ منوانے پر تلے ہوئے ہیں''...... حالانکہ طاہر سورتی صاحب کا، اور خود ہمارا مطالبہ صرف یہ ہے کہ...... ''جن کا باپ ہے، ان کے باپ کو ضرور تسلیم کیجیے، لیکن جن کا باپ نہیں، انہیں، محض اپنے مسلکِ انکارِ معجزات کی لاج رکھنے کے لیے، اناجیلِ محرفہ اور ''امام'' رینان کی تقلید میں، ''ابن یوسف''

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۰

قرار نہ دیجیے، بلکہ ''ابن مریمؑ'' ہی رہنے دیجیے، کیونکہ قرآن کریم میں، نہ تو حضرت مریمؑ کے نکاح کا ذکر ہے، نہ ہی ان کی رخصتی کا، نہ ہی ان کے شوہر کا ذکر ہے، نہ ہی ان کی ازدواجی زندگی کا۔ لیکن جناب ''معترض'' صاحب کی سینہ زوری کا یہ عالم ہے کہ وہ طنز کرنے کے علاوہ، مولانا مرحوم پر یہ الزام بھی عائد کرتے ہیں کہ ''وہ دستور اور قاعدہ کی خلاف ورزی کر رہے ہیں''، جب کہ وہ خود، ایسی پوزیشن اختیار کیے ہوئے ہیں، جس میں، ان کے نزدیک، اللہ تعالیٰ، خود اپنے اس طے کردہ قاعدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہے کہ لوگوں کو ان کے باپ کی طرف نسبت کر کے بُلایا کرو۔

تیسرا تردیدی نکتہ اور اس کا جائزہ:

ہمارے ''فاضل تنقید نگار''، اپنے تیسرے تردیدی نکتہ میں، ایک آیت سے استدلال کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> جہاں تک اولاد کے باپوں کی طرف منسوب ہونے کا تعلق ہے، تو یہ عام دستور ہے، اور جہاں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سب بچوں کے باپ ضرور ہوتے ہیں، وہاں یہ بھی مراد ہے کہ ان کی مائیں بھی ضرور ہوتی ہیں جیسا کہ ارشاد خداوندی ہے: یَآاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَا کُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے (ترجمہ تھانویؒ)۔ طاہر سورتی اس آیت کو پیش نظر کیوں نہیں رکھتے؟''[۱]

جناب ''معترض'' صاحب نے، اپنے اس اقتباس میں، جس آیت سے استدلال فرمایا ہے، وہ اپنے پورے متن کے ساتھ، درج ذیل ہے۔

یَآ یُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنَا کُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنَا کُمْ شُعُوبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقَاکُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ

(الحجرات – ۱۲)

---

[۱] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۰

"اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور تمہیں جماعتیں اور قبیلے بنایا تاکہ تمہاری باہم جان پہچان رہے، بیشک تم میں سے، اللہ کے ہاں، سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے بڑھ کر متقی ہے، یقیناً اللہ خوب صاحب علم و خبر ہے۔"

اس آیت میں، جس ایک مرد اور عورت سے تمام انسانوں کو (خواہ وہ دورِ حاضر کے ہوں یا ماضی قریب و بعید کے، اور خواہ وہ مستقبلِ قریب کے ہوں یا مستقبلِ بعید کے) پیدا کرنے کا ذکر ہے، اس سے مراد، حضرت آدمؑ، اور ان کی بیوی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اسی انسانی جوڑے سے پیدا ہونے کے بعد، انسانی آبادی، شعوب و قبائل میں بٹی تھی، لہٰذا، اس سے مراد، کوئی ایسا انسانی جوڑا، نہیں ہو سکتا، جس سے قبل، شعوب و قبائل کا وجود پایا جائے۔ آیت میں، چونکہ، لوگوں کی ایک ہی مرد و زن سے تخلیق کا ذکر مقدم ہے، اور شعوب و قبائل میں لوگوں کے منقسم ہو جانے کا ذکر، مؤخر ہے، اس لیے، لامحالہ، اس آیت میں مذکور، ذکر و انثٰی سے مراد، اولین انسانی جوڑا ہی ہے، نہ کہ شعوب و قبائل کے وجود پذیر ہو جانے کے بعد کا ہر انسانی جوڑا، جیسا کہ "مصنفِ کتاب" نے گمان کر رکھا ہے، اور پھر اسی گمان کی بنیاد پر اپنے استدلال کی عمارت اٹھا کھڑی کی ہے، اور جب بنیاد ہی غلط بلکہ لاشے ہے تو اس پر قائم استدلال کا کیا معنٰی؟

اگر "تنقید نگار" صاحب، پرویز صاحب کی بے جا وکالت پر نہ اُتر آتے، اور واقعتاً قرآن ہی کی پیروی پر کمربستہ رہتے، اور قرآن کے نام پر غیر قرآنی تصورات کو اپنانے اور پھر انہیں کتاب اللہ سے ثابت کر ڈالنے کی فکر میں مبتلا نہ ہوتے، تو وہ یقیناً راہ راست سے بھٹکنے سے بھی بچ جاتے اور قرآنی آیات کے تراجم میں بین القوسین اضافی الفاظ کے پھانے ٹھونکنے سے بھی محفوظ رہتے، اور آیات میں واقع ضمیروں کو غلط مراجع کی طرف لوٹانے سے بھی مصئون رہتے، اور عربی زبان کے قواعد میں خود ساختہ اصولوں کے اضافے سے بھی متنع رہتے۔

چوتھا تردیدی نکتہ اور اس کا جائزہ:

اپنے چوتھے تنقیدی نکتہ میں، ''مصنفِ کتاب''، ایک اور آیت سے استدلال کرتے ہیں، اور اپنے استدلال میں پھر اسی کوتاہ نظری کا مظاہرہ فرماتے ہیں جس کا صدور، سورۃ الحجرات کی آیت سے اخذِ دلیل میں ہوا ہے، چنانچہ وہ، بطور گلہ وشکایت، فرماتے ہیں:

اور اس آیت کو (طاہر سورتی صاحب) کیوں نظر انداز کرتے ہیں، جس میں ارشاد ربانی ہے:

وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ مِنْ طِينٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِنْ سُلَالَةٍ مِّنْ مَّاءٍ مَّهِينٍ (السجدہ - ۳۲:۸)

''اور انسان کی پیدائش، مٹی سے شروع کی، پھر اس کی نسل کو خلاصہ اخلاط یعنی ایک بےقدر پانی سے بنایا (ترجمہ تھانوی)۔'' [1]

اب جناب ''معترض'' صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ اس آیت میں، جس انسان کا ذکر ہے، اس سے مراد، حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہرگز نہیں ہیں، جن کی اعجازی پیدائش کا واقعہ، زیرِ بحث ہے، بلکہ اس سے مراد، وہ اولین انسان ہے جس سے ساری نسل بشر وجود میں آئی، جیسا کہ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ کے الفاظ سے ظاہر ہے۔ پھر آیت کے شروع کے الفاظ بَدَءَ خَلْقَ الْإِنْسَانِ بھی، اس حقیقت پر شاہدِ عدل ہیں کہ اس سے مراد، صرف اور صرف وہ انسان ہے جو جملہ نسل انسانی کا نقطۂ آغاز ہے، جیسا کہ خود پرویز صاحب کی مندرجہ ذیل عبارت سے بھی ظاہر ہے جسے انہوں نے ''نقطۂ آغاز'' کے زیرِ عنوان، بایں الفاظ تحریر فرمایا ہے:

''بیج کو درخت، قطرے کو گوہر، خاک کے ذرے کو انسان بننے کے لیے ان تدریجی مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ کارگہِ مشیت کے ان عظیم المرتبہ امور (Schemes) میں سے ایک اہم اسکیم انسان کی تخلیق ہے، اس اسکیم کا نقطۂ

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۰ تا صفحہ ۷۱

آغاز، طین (درجۂ جمادات) بتایا گیا ہے۔

وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۝ ج (۳۲/۷)

انسانی تخلیق کی ابتدا مٹی سے کی۔" [1]

اس مختصر سی بحث سے یہ واضح ہے کہ اگر مولانا طاہر سورتی مرحوم نے اس آیت کو نظر انداز کیا ہے، تو صرف اس لیے کہ زیر بحث مسئلہ (معجزانہ ولادتِ مسیحؑ) سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے، اور خود "تنقید نگار" صاحب نے اسے بلا ضرورت اپنی بحث میں لا گھسیٹا ہے، اور پھر الٹا یہ فرماتے ہیں کہ:

"اگر طاہر سورتی مرحوم، ان آیات اور انسانی تخلیق کے متعلق دوسری آیات کو سامنے رکھتے تو وہ راستہ سے بھٹکنے سے بچ جاتے، اور آیات کا غلط مفہوم نہ لیتے۔" [2]

یقیناً یہ عجیب اور دلچسپ ستم ظریفی بھی لائقِ ملاحظہ ہے کہ مولانا طاہر سورتی صاحب کو "راستہ سے بھٹک جانے" اور "آیات کا غلط مفہوم لینے" کا الزام، وہ لوگ دے رہے ہیں، جو خود آیات کو غلط مفہوم پہنانے کے لیے، انہیں، زمانی سیاق وسباق سے اکھاڑ کر پیش کرتے ہیں، ضمیروں کو ان کے اصل مراجع کی طرف لوٹانے سے اِبا کرتے ہیں، اور محض اپنے ذہنی مزعومات اور دماغی اوہام کو، ٹھیک بٹھانے کے لیے، نئے قواعدِ زبان کا اختراع کرتے ہیں، خلافِ مطلب، اگر پہاڑ کی سی وزنی دلیل بھی انہیں مل جائے، تو چشم پوشی سے کام لیتے ہیں، لیکن اگر کوئی چیز بال برابر بھی مفیدِ مطلب محسوس ہو، تو اُسے غیر متعلقہ آیات میں سے کشید کر کے، پہاڑ بنا کر پیش کرتے ہیں، اور پھر بھی، وہ، اس غرّہ میں مبتلا رہتے ہیں کہ صرف اور صرف وُہی، راہِ راست پر قائم ہیں، اور دوسرے لوگ، "راستہ سے بھٹک چکے ہیں۔

---

[1] معارف القرآن، جلد۲، صفحہ۶ + ابلیس وآدم، صفحہ ۷ تا ۸

[2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۷

بادۂ عصیاں سے دامن، تر بتر ہے تیغؔ کا
پھر بھی دعویٰ ہے کہ اصلاحِ دو عالم ہم سے ہے

پانچواں تردیدی نکتہ اور اس کا جائزہ:

اپنے پانچویں تردیدی نکتہ میں، ''فاضل تنقید نگار'' صاحب، ''ابن مریم'' کو، حضرت مسیحؑ کی کنیت قرار دے کر فرماتے ہیں:

''جہاں تک قرآن مجید کا حضرت عیسیٰؑ کو، عیسیٰ ابن مریمؑ کہنے کا تعلق ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اسی کنیت سے معروف و مشہور تھے۔''[1]

اس کے بعد چند مشاہیر امت کی کنیت کی مثالیں پیش کر کے، آخر میں لکھتے ہیں:

''ان چند مثالوں سے ثابت ہے کہ عربوں میں لوگ کنیت سے بھی مشہور تھے، اور اس دستور کا بھی انکار ممکن نہیں، لہٰذا حضرت عیسیٰؑ بھی، اسی دستور کے مطابق، اپنی والدہ کی طرف نسبت کی وجہ سے مشہور تھے، اور اس سے یہ نتیجہ نہیں اخذ کیا جا سکتا کہ وہ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے۔''[2]

یقیناً یہ مشاہیرِ امت، جن کی مثالیں دی گئی ہیں، اپنی ماؤں کی طرف منسوب کنیت سے مشہور و معروف تھے۔ مگر کب؟ پیدا ہونے سے پہلے؟ یا بعد میں؟ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کی یہ شہرت، پیدا ہونے کے بعد، اسی دنیا میں پھیلی ہوئی تھی، مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی پیدائش سے قبل ہی ''ابن مریم'' (نہ کہ ابن یوسف) قرار پا چکے تھے۔ فرشتوں نے قبل از ولادتِ مسیح، اُن کی والدۂ ماجدہ، حضرت مریمؑ کو یہ کہہ کر بشارتِ پسر دی تھی کہ ......اے مریم! اللہ تعالیٰ اپنی طرف سے تجھے، ایک کلمہ کی بشارت دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریمؑ ہوگا ...... ''......کیا مشاہیر امت میں سے بھی، کسی کی ماں کو، اس بیٹے کی ولادت سے قبل، بیٹے کو ماں کی طرف منسوب کرتے ہوئے، ایسی بشارت دی گئی ہے؟ کیا جس آدمی کو، بعد از پیدائش، ماں کی طرف منسوب کنیت کی بدولت، اس دنیا

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۱ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۲

شہرت ملی ہو، اُسے اُس ہستی پر قیاس کیا جا سکتا ہے، جس کا قبل از ولادت ہی، ''ابنِ مریم'' ہونا طے پا چکا تھا؟ اور وہ بھی اُس خدا کی طرف سے، جو اُدْعُوهُمْ لِآبَائِهِمْ کا قاعدہ مقرر کر ڈالنے کے باوجود، حضرت عیسٰی کو ''ابن مریم'' کہہ رہا ہے، جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ خود خدائے قدوس کے نزدیک بھی، وہ، صرف اور صرف اپنی ماں ہی کے بیٹے تھے، ان کا اگر کوئی باپ ہوتا، تو یقیناً اللہ تعالٰی، اُنہیں باپ ہی کی طرف منسوب کرتا۔

اب یہ کس قدر عجیب بات ہے کہ منکرینِ معجزات، حضرت عیسٰیؑ اور مشاہیرِ امتِ محمدیہ کے درمیان، ماں کی طرف منسوب کنیتوں میں واقع مشابہت کو تو دیکھتے ہیں، لیکن یہ واضح فرق ان کو نظر نہیں آتا کہ مشاہیرِ امت کو یہ شہرت، بعد از ولادت ملی ہے، اور حضرت عیسٰیؑ، قبل از ولادت ہی، اس ''کنیت'' کے باعث ''ابن مریم'' قرار پا چکے تھے، حالانکہ سارا فرق، اسی بنیاد پر ہے۔ کیا اِن مشاہیرِ امت میں سے کوئی ایک بھی ایسا ہے، جسے قبل از پیدائش، ''ابن حنفیہ'' یا ''ابن صفیہ'' خود اللہ تعالٰی نے قرار دیا ہو؟ اگر نہیں، اور یقیناً نہیں، تو کیا محض مشابہتِ کُنٰی کی بناء پر، یہ اصرار کرنا، کہ ''جس طرح یہ اصحابِ کُنٰی، بن باپ کے پیدا نہیں ہوئے تھے، اُسی طرح، حضرت عیسٰیؑ بھی بن باپ متولد نہیں ہوئے''، کیا خلطِ مبحث کے ذریعہ، لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف نہیں ہے؟ کیا لوگوں کی اس معاملہ میں عام اور معمول کی پوزیشن کو، حضرت عیسٰی علیہ السلام کی خاص اور غیر معمولی (معجزانہ) پوزیشن پر قیاس کرنا، قیاس مع الفارق نہیں ہے؟

امثلۂ کُنٰی اور جناب ''معترض'' صاحب:

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ماؤں کی طرف مضاف کنیتوں کے بارے میں، جناب ''معترض'' صاحب نے جو دو قاعدے کلیے بیان فرمائے ہیں، ایک سرسری سی نظر، ان پر بھی ڈال لی جائے۔ وہ اپنے دونوں قاعدے کلیوں کو بایں الفاظ بیان کرتے ہیں:

(۱) بڑے بیٹے کے نام پر کنیت ہوا کرتی ہے، چھوٹے کے نام پر نہیں۔

(۲) احد الطرفین میں جو اشرف ہوتا ہے، اس کے نام پر کنیت ہوتی ہے، ——

دوسرے کے نام پر نہیں۔" [1]

حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بیانات میں سے کوئی ایک بیان بھی "قاعدہ کلیہ" کی حیثیت نہیں رکھتا۔ بڑے بیٹے کے نام پر کنیت ہونا تو ایک طرف سرے سے یہی ضروری نہیں کہ کنیت میں مستعمل اسم اپنا کوئی وجود رکھتا ہو۔ مثلاً حضرت عبدالرحمٰن نام کے وہ جلیل القدر صحابیٔ رسولؐ، جنہیں ابو ہریرہ کہا جاتا ہے، اُن کا ہریرہ نام کا کوئی فرزند تھا ہی نہیں، جس کی بناء پر وہ اس کنیت سے مشہور و معروف ہوئے ہیں۔ اسی طرح احناف کے پیشوائے فقہ، حضرت نعمان بن ثابت، جن کی کنیت، ابو حنیفہ تھی، اُن کے متعلق، وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ حنیفہ نام کی، نہ تو اُن کی کوئی بیٹی تھی، اور نہ ہی اس نام کا کوئی بیٹا تھا، کجا یہ کہ وہ اُن کا سب سے بڑا پسر ہو۔

یہاں یہ عرض کرنا بھی ضروری ہے کہ "صاحبِ کتاب" نے بلا ضرورت پہلے "قاعدہ کلیہ" کو پیش کیا ہے۔ کیونکہ بحث کا تعلق "ابن مریمؑ" کی "کنیت" سے ہے، نہ کہ "ام عیسیٰ" (یا "ابوعیسیٰ" کی "کنیت" سے، جس کا قرآن وحدیث، تو رہے ایک طرف، اسلامی ادب کی کسی صنف میں ذکر تک موجود نہیں ہے) کی کنیت سے۔ لیکن "دلائل کی بھرمار" پیش کرنے کے جوش میں، انہیں، اس بات کا ہوش ہی نہیں رہا کہ یہ "قاعدہ کلیہ" زیرِ بحث موضوع کی حدود ہی سے خارج ہے۔

جہاں تک دوسرے "قاعدہ کلیہ" کا تعلق ہے تو اس میں بھی یہ ضروری نہیں کہ ماں باپ میں سے اشرف الطرفین کی نسبت ہی سے کنیت اختیار کی جائے۔ خود جناب "معترض" صاحب کی پیش کردہ مثال میں محمد بن حنفیہ، جب اپنے باپ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بجائے، اپنی والدہ کی نسبت سے "ابن حنفیہ" کہلائے، تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ حضرت علی کرم اللہ وجھہ کی بیوی "حنفیہ"، خلیفہ رابع سے اشرف واعلیٰ اور افضل وبرتر تھی۔

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۷

کیا ''ابن مریم'' کنیت ہے؟:

جناب ''صاحبِ تصنیف'' کے متعلق، صاحبِ تقریظ، یہ اعلان فرماتے ہیں کہ وہ:

''.......... صاحب بھی عربی زبان ولغت کے بڑے آشنا ہیں...... قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر میں، خصوصاً عربی گرامر کے حوالہ سے، خاصی مہارت رکھتے ہیں۔'' [۱]

ممکن ہے کہ یہ اعلان درست ہو، مگر ان کی تصنیف کو خوردبین لگا کر بھی دیکھا جائے، تو ان کی مہارت خصوصی کا کوئی نشان دکھائی نہیں دیتا، بلکہ وہ قرآن کریم کی، اس صراحت کے باوجود بھی، کہ مسیح اور عیسٰی ابن مریم، ایک ہی ہستی کے نام ہیں، (اسمه المسیح عیسی ابن مریم)، وہ، ''مسیحؑ'' کو لقب، ''عیسٰیؑ'' کو نام، اور ''ابن مریم'' کو کنیت قرار دیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''مسیح، حضرت عیسٰی کا لقب، عیسٰی نام اور ابن مریم کنیت ہے۔'' [۲]

اور یہ تحریر ظاہر کرتی ہے کہ کسی شخص کے حقیقی نام اور کنیت میں جو فرق ہوتا ہے، وہ اس سے قطعی بے خبر ہیں۔ اگر کسی کو عبداللہ بن عبدالمطلب کہا جائے، تو ان کے نزدیک، عبداللہ تو نام ہوگا، اور ''ابن عبدالمطلب'' کنیت ہوگی۔ اسی طرح طاہر بن نسیم اور محمد بن حنفیہ کا نام سن کر، وہ یہ فرما دیں گے کہ ''طاہر'' اور ''محمد'' تو نام ہیں، لیکن ''ابن نسیم'' اور ''ابن حنفیہ'' ان کی کنیتیں ہیں، حالانکہ جس چیز کو، وہ بطورِ خود، کنیت، قرار دیتے ہیں، وہ، نام ہی کا حصہ ہوتا ہے جسے تعارفِ مزید یا وضاحتِ مزید کی خاطر، اس کی ولدیت کے ساتھ اس کا ذکر کر دیا جاتا ہے۔ یہی غلطی، وہ ''عیسٰیؑ ابن مریم'' میں کر رہے ہیں، اور عیسٰی کو نام سمجھ کر، ''ابن مریم'' کو، کنیت تصور فرما رہے ہیں۔ حالانکہ نام، الگ چیز ہے اور کنیت شئے دیگر۔ اس امر کی وضاحت، مندرجہ ذیل تاریخی مثالوں سے بخوبی ہو جاتی ہے۔

(۱)..... حضرت ابوبکر صدیقؓ کا نام، عبداللہ اور ان کے والد کا حقیقی نام عثمان تھا۔ اب اگر،

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ vi

[۲] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۲

انہیں عبداللہ بن عثمان کہہ دیا جائے، تو اس کا ہرگز، یہ مطلب نہیں ہے کہ ''ابن عثمان'' ان کی کنیت تھی۔ جبکہ فی الواقعہ، ان کی کنیت ابوبکر تھی۔ جو عبداللہ بن عثمان سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی۔

(۲)...... حضرت ابوبکر صدیق کے دادا کا نام عامر تھا اور خلیفہ اول کے باپ کا پورا نام عثمان بن عامر تھا۔ ممکن ہے کہ جناب ''معترض'' صاحب، اپنی ''عربی گرامر کے حوالہ سے خاص مہارت کی بناء پر، ''عثمان'' کو نام قرار دیکر ''ابن عامر'' کو ان کی کنیت بنا ڈالیں، حالانکہ ان کی اصل کنیت ابوقحافہ تھی، جس میں ان کے باپ کی نسبت سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

(۳)...... خلیفۂ ثانی، حضرت عمرؓ کا پورا نام ''عمرؓ بن خطاب'' تھا۔ جس میں سے جناب ''تنقید نگار'' صاحب ''عربی زبان و لغت کے بڑے آشنا ہونے کی بنا پر، ''ابن خطاب'' کو ان کی کنیت بنا ڈالیں گے، حالانکہ ان کی کنیت ''ابوحفص'' تھی، جس کا اُن کے باپ کے نام سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے۔

(۴)...... خلیفۂ ثالث کا پورا نام، ''عثمانؓ بن عفان'' تھا۔ ممکن ہے کہ ''قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر میں خاص مہارت'' کے کسی علمبردار کے ہاں، ''ابن عفان'' ان کی کنیت قرار پائے، جبکہ فی الواقعہ، ان کی کنیت ''ابوعبداللہ'' بھی تھی، اور ''ابوعمر'' بھی تھی، اور یہ دونوں کنیتیں، ان کے باپ کے نام سے قطعی غیر متعلق ہیں۔

(۵)...... خلفیۂ رابع، حضرت علی ابن ابی طالب تھے۔ پرویز صاحب کے کسی ''وکیل صفائی'' کے نزدیک، ان کی کنیت، ''ابن ابی طالب'' ہوگی، جبکہ فی الواقعہ، ان کی کنیت ''ابوالحسن'' بھی تھی، اور ''ابوتراب'' بھی، جن کا، ان کے باپ کے ساتھ، کوئی تعلق ہی نہیں بنتا۔

ان مثالوں کی روشنی میں، ''مسیح ابن مریم'' اور ''عیسیٰ ابن مریم'' کو از روئے قرآن، ایک ہی ہستی کے دوم نام قرار دینے کی بجائے، محض اپنی ذہنی اپج کی بناء پر، ''مسیح'' کو لقب،

"عیسیٰ" کو نام، اور "ابن مریم" کو کنیت قرار دینا، نہ صرف عربوں کی روشِ اکتناء سے، "معترض" صاحب کی بے خبری کو ظاہر کرتا ہے، بلکہ بناء فاسد علی الفاسد کی اس عادت کو بھی عیاں کر ڈالتا ہے، جس کی بدولت، وہ "ابن مریم" کو کنیت جان کر، تاریخ سے ایسی مثالیں ڈھونڈ کر، اپنے استدلال کا قصر فلک بوس تعمیر کر ڈالتے ہیں۔

یہی تصریح ایک اور پہلو سے:

اولاد کو منسوب کرنے کی تصریح کو، جناب طاہر سورتی صاحب، "عورت کھیتی ہے" کے زیرِ عنوان، ایک اور پہلو سے واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> پرویز صاحب کو خوب معلوم ہے کہ قرآن مجید، عورت کو کھیتی اور زمین سے تشبیہ دیتا ہے۔ پھر کبھی انہوں نے دیکھا کہ آم کے بیج سے پیدا ہونے والے درخت کو، بجائے آم کے، زمین کی طرف منسوب کر کے، زمین کا پیڑ کہا گیا ہو؟ اور اس کے لیے دلیل یہ دی جائے کہ چونکہ بیج جو ایک حقیر اور چھوٹی سی چیز ہے، اسے اول سے آخر تک زمین نے پالا پوسا اور پھر ایک بڑا درخت بنایا، لہٰذا اسے زمین کی طرف منسوب کر کے، زمین کا درخت کہا جائے گا، آم کا درخت نہیں کہا جائے گا۔ یہ کس قدر مضحکہ خیز بات ہے جو قرآن مجید کے د۔ ۓ سوئے اصول کے مقابلہ میں، پرویز صاحب اختیار کر رہے ہیں۔ اب فیصلہ کیجئے کہ یوسف کے بیج کو کیونکر مریمؑ کی طرف منسوب کیا جائے گا؟ البتہ اگر کوئی خودرو پودا بغیر بیج کے، زمین کے زور سے ظہور پذیر ہو جائے، [1] اور ہم اسے زمین کا پودا یا پیڑ کہہ دیں، تو حق بجانب ہوں گے۔

لیکن ہم اپنی ہر لحہ بدلنے والی عقل کے گھوڑے کیوں دوڑاتے رہیں، آیئے! ذرا قرآن مجید سے پوچھیں کہ وہ اولاد کو منسوب کرنے کے لیے کوئی قاعدہ مقرر فرماتا ہے کہ نہیں۔ لیکن قرآن مجید ہی سے پوچھے گا، پرویز صاحب سے نہیں، ورنہ وُہ نہایت اطمینان سے اپنی بصیرتِ قرآنی کا رنگ جماتے ہوئے فرمائیں

گے کہ قرآن مجید اس بارے میں کہ اولاد کو باپ کی طرف منسوب کیا جائے یا ماں کی طرف، بالتصریح کوئی بات نہیں کہتا، اس لیے کہ اُن کی نظر میں بالتصریح یا تو وہ خود بات کرتے ہیں یا ان کے اولیاء۔ قرآن مجید تو (معاذ اللہ) ابہامات کا پلندا ہے۔

لیکن ذرا صبر کیجیے، اس مسئلہ میں قرآن مجید کی طرف رجوع کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ کیا واقعی یہ کوئی قاعدہ ہے کہ اگر بچہ کا باپ، چھوٹی عمر میں اسے چھوڑ کر مر جائے تو اس کی پرورش اور کفالت کرنے کی وجہ سے، اس کی نسبت ماں کی طرف کر دی جاتی ہے؟ ہم دور نہیں جاتے۔ اس بارے میں ہمارے لیے خود آنحضرت محمدؐ کی مثال ہے۔ آپؐ کے والد کا انتقال (صحیح روایات کے مطابق) اس وقت ہو چکا تھا، جب کہ آپؐ اپنی ماں کے پیٹ میں تھے ......) لیکن کسی نے آپؐ کو محمد بن آمنہ نہیں کہا، آپ ہمیشہ اپنے والد عبداللہ ہی کی طرف منسوب کیے گئے، یعنی آپ کو محمد بن عبداللہ ہی کہا گیا۔" [۱]

"تنقید نگار" کا پہلا تنقیدی نکتہ:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی اس عام فہم اور مُدلّل تصریح کا تردیدی جواب، ہمارے "معترض" صاحب، یہ کہہ کر دیتے ہیں کہ اگرچہ:

نباتات وحیوانات میں، نر و مادہ کا ہونا، بالکل واضح ہے، مگر انسانوں کے وہ، ان میں ماں باپ کی طرف نسبت کا کوئی دستور نہیں۔ آم کا درخت کہنے ،، اس کے باپ یا ماں کی شناخت کا کوئی تعلق نہیں، اس لیے یہ غیر متعلقہ سا ہے۔" [۲]

قارئین کرام سے درخواست گزار ہیں کہ وہ مولانا طاہر سورتی مرحوم کے استدلال ... مطالعہ فرمائیں، اور پھر خود ہی اندازہ فرما لیں کہ "مصنفِ کتاب" کے اس

---

[۱] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۶۲ تا صفحہ ۶۳ [۲] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۳

تردیدی جواب میں کتنی معقولیت پائی جاتی ہے؟ اور ان کی مثال کو غیر متعلقہ قرار دینا، میزانِ علم و استدلال میں کیا وزن رکھتا ہے؟ نیز یہ کہ کیا تردیدی جواب، اِسی حربے کا نام ہے کہ بات کو الفاظ کے پیچوں میں الجھا کر، کچھ نہ کچھ الفاظ و حروف کاغذ پر گھسیٹ ڈالے جائیں؟

آم کی تشبیہی لیکن توضیحی مثال میں یہ کہا گیا ہے کہ جس طرح، آم کا بویا جانے والا بیج، باوجودیکہ مدتِ دراز تک بطنِ زمین میں نشوونما پانے کے بعد، بصورتِ درخت قائم ہو جاتا ہے، اور وہ زمین کا پیڑ کہلانے کی بجائے، اپنے بیج کے حوالے سے، آم ہی کا درخت کہلاتا ہے، بالکل اسی طرح کشتِ مریم میں، یوسف نامی شخص کا ڈالا ہوا بیج بھی، مکمل نشوونما پانے کے بعد، جب شجرِ حیات بنتا ہے، تو اُسے بھی مریم کی بجائے، یوسف ہی کی طرف منسوب ہونا چاہئے تھا، لیکن نہ تو اللہ تعالیٰ ہی نے انہیں عیسیٰ ابن یوسف کہا اور نہ ہی عربوں نے اپنے مروجہ دستور کے مطابق ایسا کہا۔ آخر یہ کیوں؟ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ''یہ مثال ہی غیر متعلقہ ہے۔''

بسوخت عقل زحیرت ایں چہ بوالعجبی ست

لیکن پھر اسی مثال کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے، یہ کہا جاتا ہے:

> ''رہا طاہر سورتی مرحوم کا یہ کہنا کہ ''یوسف کے بیج کو، مریم کی طرف کیونکر منسوب کیا جائے، تو یہ مضحکہ خیز ہے۔ کیا کسی عورت کا اپنے بیٹے کو ''میرا بیٹا'' کہنا غیر شرعی ہے؟ اور اُسے توبہ کر کے، آئندہ ''اے میرے شوہر کے بیٹے'' کہنا چاہئے۔''[1]

یہ تخنسازی، مخاطب کی بات کو بغیر سوچے سمجھے بول دینے کی عادت کا کرشمہ ہے۔ سوال یہ نہیں کہ کوئی عورت، اپنے بیٹے کو ''میرا بیٹا'' کہہ سکتی ہے یا نہیں۔ اور نہ ہی یہ سوال ہے کہ اُسے توبہ کر کے، اُسے آئندہ ''اے میرے شوہر کے بیٹے'' کہنے پر مجبور کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ بلکہ سوال یہ ہے کہ اگر حضرت عیسیٰؑ، واقعتاً، یوسف ہی کے بیٹے ہیں، تو خود اللہ تعالیٰ،

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۲۳

بیسیوں مرتبہ، انہیں ''ابن یوسف'' کہنے کی بجائے، ''ابن مریم'' کیوں کہتا ہے؟ اور کسی ایک جگہ بھی، قرآن میں، ''ابن یوسف'' نہیں کہتا۔ اگر واقعی، یوسف، حضرت مریم کا شوہر اور حضرت عیسیٰؑ کا باپ ہوتا، جس طرح عبداللہ، آمنہ کے شوہر اور محمد رسول اللہ ﷺ کے باپ تھے، تو لوگ، اولاد کو باپوں کی طرف منسوب کرنے کے معروف قاعدے کی بناء پر، حضرت مسیحؑ کو، اُسی طرح ''یوسف کا بیٹا'' کہتے، جس طرح پیغمبر آخرالزمان ﷺ کو محمدؐ بن عبداللہ کہتے تھے۔ حیرت ہے کہ یہ سادہ سی بات سمجھنے میں آخر کیا پیچیدگی پائی جاتی ہے۔

بیاں میں نکتۂ توحید آتو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو، تو کیا کہیے

بے تکا جواب اور لایعنی تاویل:

مولانا طاہر سورتیؒ کی طرف سے یہ سوال اٹھایا گیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے خود یہ ضابطہ طے کر دیا کہ لوگوں کو ان کے باپوں کی طرف نسبت کر کے بلاؤ اُدْعُوهُمْ لِآبَآءِهِمْ لیکن اس کے باوجود، خود اللہ تعالیٰ نے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، باپ کی طرف منسوب کرنے کی بجائے، ماں ہی کی طرف منسوب کیا، ایک مرتبہ نہیں بلکہ بیسیوں مرتبہ ایسا کیا۔ آخر یہ کیوں؟ اس کا جواب، جناب ''تنقید نگار'' صاحب نے، پرویز صاحب اور ان کے یکے از اولیاء من دون اللہ، ''امام'' رینان صاحب کے حوالہ سے بایں الفاظ دیا:

> ''پرویز صاحب نے رینان کا جو قول نقل کیا ہے، اس میں یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ باپ بچپن ہی میں مر گئے تھے، اور حضرت مریمؑ نے ان کی پرورش کی تھی، اس لیے ابن مریم کہلائے۔''[1]

اس تاویلِ فاسد کا جواب دیتے ہوئے، مولانا طاہر سورتی مرحوم نے یہ فرمایا تھا:

> ''آیئے! ذرا قرآن مجید سے پوچھیں کہ وہ اولاد کو منسوب کرنے کے لیے کوئی قاعدہ مقرر فرماتا ہے یا نہیں .... لیکن ذرا صبر کیجیے، اس مسئلہ میں قرآن مجید

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۲۲

کی طرف رجوع کرنے سے پہلے ہم یہ دیکھ لیں کہ کیا واقعی یہ کوئی قاعدہ ہے کہ اگر بچہ کا باپ، چھوٹی عمر میں اسے چھوڑ کر مر جائے، تو اس کی پرورش اور کفالت کرنے کی وجہ سے اس کی نسبت ماں کی طرف کر دی جاتی ہے؟ ہم دور نہیں جاتے، اس بارے میں ہمارے لیے خود آنحضرت محمدؐ کی مثال ہے۔ آپؐ کے والد کا انتقال (صحیح روایات کے مطابق) اُس وقت ہو چکا تھا جب کہ آپؐ، اپنی ماں کے پیٹ میں تھے، (..................) لیکن کسی نے آپؐ کو محمد ابن آمنہ نہیں کہا۔ آپؐ ہمیشہ اپنے والد عبداللہ ہی کی طرف منسوب کیے گئے، یعنی آپؐ کو محمد بن عبداللہ ہی کہا گیا۔'' [۱]

اس معقول استدلال کا جو جواب، ''فاضل تنقید نگار'' نے دیا ہے، اب اسے بھی ملاحظہ فرمائیے۔

''طاہر سورتی مرحوم کی آیت (الاحزاب ۳۳:۵) کے متعلق تصریحات کا جواب، اس کتاب کے ابتدائی صفحات میں دیا جا چکا ہے۔'' [۲]

اور ابتدائی صفحات میں، جو جواب دیا گیا ہے، ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجئے:

''طاہر سورتی مرحوم کے اس استدلال کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں اُدْعُوْهُمْ کی ضمیر منصوب کا مرجع ادعیاء ہے، اولاد نہیں۔ ادعیاء منہ بولے بیٹوں کو کہا جاتا ہے، حضرت عیسیٰ، کسی کے متبنّٰی نہ تھے۔ لہٰذا معنٰی یہ ہیں کہ متبنّٰی لوگوں کو، ان کے باپوں کے ناموں سے پکارا کرو۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ ادعیاء کے باپ ضرور ہوتے تھے ☆۔ اس آیت کا حضرت عیسیٰؑ پر اطلاق نہیں ہوسکتا، کیونکہ وہ لے پالک نہیں تھے۔'' [۳]

---

[۱] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۶۲ تا ۶۳ [۲] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۷۵

[۳] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۹ تا صفحہ ۱۰

☆ لیکن حضرت عیسیٰؑ، جو لے پالک نہیں تھے، پھر ان کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیونکہ ''ادعیاء'' کے باپ ضرور ہوتے ہیں، اور عیسیٰؑ ''ادعیاء'' میں شامل نہیں۔

اس بے تکے اور لایعنی جواب سے، یہ بات خودبخود واضح ہو جاتی ہے کہ "مصنفِ کتاب" کے نزدیک ادعیاء گویا اولاد نہیں ہوتے، اور باپوں کی طرف منسوب کر کے بلانے کا حکم، چونکہ اولاد سے نہیں، بلکہ ادعیاء سے وابستہ ہے، نیز حضرت عیسیٰؑ بھی، چونکہ متبنّٰی نہیں تھے، اس لیے یہ آیت، ان سے متعلق نہیں ہے، لہٰذا ادعیاء کو تو ان کے باپوں کی طرف منسوب کر کے بلایا جائے، لیکن غیر ادعیاء کو، باپوں کی طرف منسوب کرنا "خلافِ قرآن" ہے، نیز ایک خاص محل کی آیت کو (جو ادعیاء کو سے متعلق ہے، نہ کہ عام اولاد سے)، حضرت عیسیٰؑ پر چسپاں کرنا، غلط اور بے محل بات ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر لوگ، جناب غلام احمد پرویز صاحب اور ان کے حامی "صاحبِ تصنیف" کو، ان کے باپوں کی طرف منسوب کرنے کی بجائے، ان لوگوں کی طرف منسوب کر ڈالیں، جو ان کے باپ نہیں ہیں، تو انہیں قطعاً اعتراض نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ وہ لے پالک نہیں ہیں، اور آیت صرف لے پالک افراد ہی کو، اُن کے باپوں کی طرف نسبت کر کے، بلانے کا حکم دیتی ہے۔

مزید برآں، یہاں، "معترض" صاحب کی ایک اور ذہنی چابکدستی بھی ملاحظہ فرمایئے۔ باپوں کی طرف، نسبت کر کے، بُلانے کی اس بحث میں، اچانک، انہیں، یہ خیال آ جاتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا تو ذکر، جہاں بھی قرآن مجید میں کیا گیا ہے، ماں ہی کی نسبت سے کیا گیا ہے۔ چنانچہ ماں کی طرف، اس نسبت کے جواز کی دلیل، یہ کہہ کر فراہم کی گئی:

> "پھر آباء میں تغلیباً مائیں بھی شامل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص، کسی وجہ سے، اپنی ماں کی طرف منسوب ہو تو اس کے باپ کی نفی نہیں کی جا سکتی۔ بہت سے لوگ، اپنی ماؤں کی شہرت کی وجہ سے، اُنہی کے ناموں سے مشہور ہیں۔" [1]

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۱۰

اب سوچنے کی بات تو یہ ہے کہ جن آبَاء میں، وہ تغلیباً ماؤں کو شامل فرما رہے ہیں، وہ اَدْعِیَآء ہی کے باپ ہیں، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام، اَدْعِیَآء میں شامل ہی نہیں ہیں، اور ''آیت کا اُن پر اطلاق ہو نہیں سکتا''، پھر اس آیت میں سے، جو حضرت عیسیٰؑ سے متعلق ہی نہیں ہے، لفظ آباء کو لے کر، اس میں تغلیباً ماؤں کو داخل کرنا، کیا ''دروغ گورا حافظہ نباشد'' کی واضح مثال نہیں ہے۔

تصریحِ خامس (برّاً بوالدیه اور برّاً بوالدتی کا فرق):

مولانا طاہر سورتیؒ نے اپنی پانچویں تصریح میں استدلال کرتے ہوئے فرمایا ہے:

قرآن مجید، جن مقامات پر حضرت عیسیٰؑ کے واقعہ کے ساتھ حضرت زکریا کا واقعہ بیان کرتا ہے تو یہ اس لیے نہیں کہ آپ اس پر اچٹتی سی نگاہ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ جائیں۔ دراصل حضرت زکریا کا قصہ عجیب ہے اور حضرت عیسیٰ کا اعجب، اور یہ قاعدہ ہے کہ ایک بلند مقام پر پہنچنے کے لیے اس سے کمتر بلندی پر پہنچا جائے، علاوہ ازیں، آپ اگر خود بھی تسلسل کے ساتھ سورۂ مریم میں حضرت زکریاؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے واقعات پر ایک نظر ڈالیں، تو آپ کو اس بارے میں بڑی تصریحات مل جائیں گی کہ حضرت عیسیٰؑ کے صرف ماں تھیں اور حضرت یحیٰؑ کے باپ بھی تھے اور ماں بھی۔ چنانچہ سورہ مریم کی چودھویں آیت میں حضرت یحیٰ کے لیے کہا گیا ہے وَبَرًّا بِوَالِدَيْهِ (۱۹/۱۴) یعنی وہ اپنے ماں باپ کے لیے وسیع پیمانہ پر خیر و برکت کا موجب اور ان دونوں کے لیے آخری امکانی حدود تک حسنِ سلوک اور صلہ رحمی کرنے والا ہوگا، لیکن اسی سورہ مریم کی بتیسویں آیت میں حضرت عیسیٰؑ کہہ رہے ہیں وَبَرًّا بِوَالِدَتِي یعنی میں اپنی ماں کے لیے وسیع پیمانہ پر خیر و برکت کا موجب اور اس (ماں) کے لیے آخری امکانی حدود تک حسن سلوک اور صلہ رحمی کرنے والا ہوں۔

پرویز صاحب نے قرآن کی لغت تیار کی ہے، وہ ''بر'' کے مادہ کی وسعت،

فراخی، کشادگی سے خوب واقف ہیں، پھر وہ قرآن مجید کی تعلیمات کے مطابق تسلسل حیات کے بھی قائل ہیں۔ شاید انہیں نہیں معلوم کہ ایک بچہ ماں کے پیٹ میں پہنچتے ہی ماں باپ کے لیے مسرت وشادمانی کا باعث ہوجاتا ہے، اور پیدا ہونے پر تو اس کی خیر و برکت مختلف شکلوں میں ماں باپ کے لیے باعثِ شادابیٔ رُوح بنتی ہے، ماں باپ کی قلبی مسرت کے لیے قرآن مجید نے ''قرۃ اعین'' کا استعارہ بھی استعمال کیا ہے، یعنی آنکھوں کی ٹھنڈک، دیکھئے (۲۵/۷۴، ۲۸/۹) یاد رکھئے کہ ہر بچہ بیک وقت، ماں اور باپ دونوں کے لیے قرۃ العین ہوتا ہے، بشرطیکہ دونوں اسے دیکھ رہے ہوں۔ فرعون کی بیوی نے جب موسیٰ علیہ السلام کو صندوق میں پایا تھا تو کہا تھا **قرۃ عین لی ولك لا تقتلوه** اسے قتل نہ کرو۔ یہ میری اور تیری (فرعون کی) آنکھ ٹھنڈی کرے گا، لیکن کیا وجہ ہے کہ باپ کے ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰؑ کو، اللہ، صرف ماں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک بتا رہا ہے وَقری عینا (/۱۹) معلوم ہوا کہ ان کے باپ تھے ہی نہیں۔ اور اگر بقول آپ کے تھے تو پھر یہ روایت غلط ہے کہ انہوں نے اپنے بیٹے کو دیکھا اور اس کے ساتھ بھی رہے۔ اب آپ کی مرضی ہے قرآن کو مانیں یا اناجیل اور رینان کو۔ بر کے ان معانی کے لحاظ سے دیکھا جائے تو حضرت عیسیٰؑ (معاذ اللہ) کس قدر نالائق بچے تھے کہ چودہ برس تک اپنی ماں کے لیے تو وجہ خیر و برکت اور آنکھوں کی ٹھنڈک بنے رہے، اور باپ کو سرے سے نظر انداز کر گئے، حالانکہ اس سے پہلی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کہہ رہے ہیں وَجَعَلَنِي مُبَارَكًا أَيْنَ مَا كُنْتُ. خدا نے جہاں کہیں میرا وجود ہوگا کثرتِ خیر و برکت والا بنایا ہے۔

تعجب ہے کہ ہر جگہ تک کے لیے وہ باعث خیر و برکت ہیں، بس اگر کسی کے لیے نہیں ہیں تو اپنے باپ کے لیے نہیں ہیں؟ کیا حضرت عیسیٰؑ اللہ تعالیٰ کے اس

عام قانون سے بے بہرہ تھے کہ بِالوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا ماں باپ کے ساتھ سلوک کرو، اور صَاحِبْھُمَا فِی الدُّنْیَا مَعْرُوْفًا کافر اور مشرک ماں باپ ہوں تو بھی دنیاوی معاملات میں ان کے ساتھ معروف طریقہ سے گذر بسر کرو۔

لیکن اگر آپ بر کے معنٰی صرف خدمتگذار، اطاعت شعار اور صلہ رحمی کرنے والا ہی رکھیں تو اس لحاظ سے بھی بارہ چودہ برس تک اندازہ ہو جاتا ہے کہ بچہ ماں باپ کے لیے کوفت اور زحمت بنا رہا یا خدمت گذاری اور اطاعت شعاری سے، ان کے دل کا نور اور آنکھوں کا سرور بنا رہا۔

اور اگر آپ تسلسلِ حیات کے لحاظ سے دیکھیں تو مرنے کے بعد بھی بیٹا باپ کے لیے رحمت و مغفرت کی دعا کرے، اس کی قبر پر جائے، اس کے انعامات و احسانات کو یاد کرتا رہے، اگر چھوٹے بہن بھائی وغیرہ ہوں تو ان کی دیکھ بھال کرتا رہے۔ یہ سب امور بر کے تحت آ جاتے ہیں، لیکن حیرت ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ، اپنے باپ کے لیے بر نہ ہوئے اور صرف اپنی ماں ہی کے لیے بر رہے۔ اب اس سے زیادہ اور کون سی واضح تصریح آپ قرآن سے چاہتے ہیں۔ اتنی واضح اور کھلی باتوں کی موجودگی میں آپ کو ابہام و غموض نظر آ رہا ہے، حالانکہ آپ اشارہ و کنایہ اور تعریض و استعارہ میں بات تاڑ جاتے ہیں۔ بلکہ آپ شاید اس شاعر کے ہمنوا بھی ہوں گے جو کہتا ہے

؎ برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی است

اس مضمون کی ہمارے عربی شاعروں نے یوں تائید کی ہے خیر الکلام ما کان لحنًا ۔

جناب پرویز صاحب، برا بوالدتی کے تحت (شعلۂ مستور صفحہ ۱۰۶ پر) ایک طویل نوٹ دیتے ہیں جس میں حضرت یحیٰؑ کے متعلق برًا بوالدیہ کا ذکر بھی ہے، لیکن یہ نوٹ کسی حقیقت تک پہنچنے کے لیے نہیں دیا گیا بلکہ نہایت سرسری

انداز میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں عام طور پر والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا، اسی لیے اس خصوصیت کا ذکر نمایاں طور پر کیا گیا ہے۔

ملاحظہ کیا آپ نے، کس طرح بر کے معنیٰ کو پہلے محدود کیا گیا اور پھر بجائے قرآن مجید میں غور کرنے کے، مشکوک انداز میں ''معلوم ہوتا ہے'' سے بات ختم کر دی۔ ماں باپ کے ساتھ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں اولاد فرماں بردار و خدمتگذار بھی رہی اور نافرمان و گستاخ بھی۔ یہ کوئی موسم کا پھل تو ہے نہیں کہ فلاں زمانہ میں والدین سے اچھا سلوک نہیں کیا جاتا تھا۔ البتہ اگر پرویز صاحب یہ لکھتے تو ایک بات بھی ہوتی کہ غالباً اس زمانہ کے لوگ، میری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ تسلیم کر چکے تھے کہ ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں ہے۔ (دیکھئے طاہرہ کے نام خطوط)۔ قرآن مجید کی اتنی پرمعنی اور گہری بات سے سطحی معنیٰ نکال کر آگے بڑھ جانا، بصیرت قرآنی کا دیوالیہ نہیں تو اور کیا ہے؟''[1]

''معترض'' صاحب کی سخنسازیاں:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی، اس تفصیلی اور مدلل تصریح کے بعد بھی، منکرینِ معجزات کی ہٹ دھری قابل دید بھی ہے اور قابلِ داد بھی۔ ''معترض'' صاحب، ''میں نہ مانوں'' کی جس راہِ کج کو اپنا چکے ہیں، اُسے صراط مستقیم قرار دینے کے لیے، قرآنی آیات کے مفاہیم میں، اپنے اضافی الفاظ کے پھانے ٹھونکتے ہیں، ضمیروں کے مراجع بدلتے ہیں تاکہ غیر معمولی اور خارقِ عادت امور کو، معمول کے عام اور عادی امور قرار دے سکیں، اور پھر یہ اعلان کر سکیں کہ ''ہم نے اپنا موقف، قرآن سے ثابت کر ڈالا ہے۔''

اب یہاں ملاحظہ فرمایئے، کہ سورہ مریم کی آیت ۲۲ میں، جناب ''تنقید نگار'' صاحب، پرویز صاحب سے بھی، اختلاف کرتے ہوئے، فَانْتَبَذَتْ بِهٖ میں، ضمیر مجرور کا

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۶۷ تا صفحہ ۷۰

مرجع، ''شوہر مریم'' کو قرار دے رہے ہیں، جس کا (سابقہ آیات میں کیا معنی، بلکہ پورے قرآن میں) سرے سے ذکر ہی نہیں ہے۔ یہاں، مرجعِ ضمیر وہی ہے جو اس کے متصل ساتھ ہی جملہ فَحَمَلَتْهُ میں ضمیر مفعول کا مرجع ہے، اور اس سے مراد، حضرت مریمؑ کا بلا مسِ بشر، معجزانہ حمل کا قرار پانا ہے (جیسا کہ گذشتہ ابواب میں گزر چکا ہے)، لیکن مولانا طاہر سورتی مرحوم کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے کہ...... ''اگر حضرت عیسیٰؑ کا حقیقتاً کوئی باپ تھا، اور وہ واقعی زندہ اور موجود تھا، تو پھر وہ ۔صرف ماں ہی کے لیے، کیوں بر تھے''...... اصل مرجعِ ضمیر کی جگہ ''شوہر مریمؑ'' مراد لیا جا رہا ہے، اور پھر اس کے بعد کے افعال فناداھا من تحتھا میں نادیٰ وغیرہ مذکور افعال کا فاعل بھی، اُسے (شوہرِ مریمؑ کو) ہی قرار دیا جا رہا ہے، اور پھر یہ تاثر دیا جا رہا ہے کہ چونکہ وہ، خود ہی مریم کو یہ کہنے والا تھا کہ ''غم نہ کر، ...... شجر کھجور کے تنے کو جھٹکا دے...... تازہ کھجوریں کھا اور پانی پی، اور (دیدارِ نو مولود سے) آنکھیں ٹھنڈی رکھ ......'' اس لیے اس نے خود اپنا ذکر نہیں کیا، ورنہ حضرت عیسیٰؑ، جس طرح اپنی والدہ کے لیے باعثِ خیر و برکت اور فرماں بردار تھے، اسی طرح یقیناً وہ باپ کے لیے بھی ہوں گے، (اگر چہ قرآن میں ذکر، صرف ماں ہی کا ہے)۔

جناب ''معترض'' صاحب کے اس افسانہ کی تغلیط کے لیے، اولاً، یہی بات کافی ہے کہ جسے، وہ، مریمؑ کا شوہر قرار دے رہے ہیں، اس کا ذکر، نہ صرف آیات کے سیاق و سباق میں، بلکہ پورے قرآن میں نہیں ہے۔ ثانیاً، اگر نَادٰی کا فاعل، ''شوہرِ مریمؑ'' ہی تھا، تو اس کی نداء کے لیے، جہت کے تعین کی ضرورت نہیں تھی، مِن تحتھا کے الفاظ، قطعاً بلا ضرورت ہیں، کیونکہ تعینِ جہت کا ذکر، وہاں مناسب ہوتا ہے، جہاں پکارنے والا، غیر مرئی ہو، اور مخاطب کی نگاہوں سے اوجھل ہو (جیسا کہ سرگزشتِ موسیٰؑ میں مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبَارَكَةِ میں مذکور ہے) اور پھر سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ هُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ کہنے والا ''شوہر مریمؑ'' ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ کوئی شوہر بھی ایسا بدھو، مغفل اور بے عقل نہیں ہو سکتا، کہ وضعِ حمل کے ساتھ ہی (جبکہ عورت، اس حالت میں

نقاہت اور عارضہ نفاس میں مبتلا ہو) شوہر خود، اُس (بیوی) کے لیے کھجوریں جھاڑنے کی بجائے آرام سے بیٹھ جائے، اور الٹا بیوی کو یہ حکم دے کہ نومولود کو جنم دینے کے بعد، ''اب تُو خود ہی شجرِ کھجور کو جھٹکے دے کر، اپنے لیے کھجوریں جھاڑتی رہ۔''

لیکن یہ ساری باتیں، تو، اُس شخص کے لیے قابل غور ہیں، جو فی الواقعہ، اخلاص کے ساتھ، قرآن کی پیروی کرنا چاہتا ہو، نہ کہ اس کے لیے، جو قرآن کو اپنا تابعِ فرمان بنانا چاہتا ہو۔

رہا مولانا طاہر سورتی مرحوم کا یہ اعتراض کہ...... ''تعجب ہے کہ ہر جگہ تک کے لیے، وہ (حضرت عیسیٰؑ) خیر و برکت ہیں، لیکن اگر کسی کے لیے نہیں ہیں، تو بس اپنے باپ کے لیے نہیں ہیں'' ......تو اس کے جواب میں، ''فاضل تنقید نگار'' صاحب فرماتے ہیں:

> ''اس آیت سے اس قسم کا مفہوم اخذ کرنا، طاہر سورتی مرحوم ہی کو زیب دیتا ہے، جب تک حضرت عیسیٰؑ کے والد زندہ رہے، وہ اُن کے اور والدہ کے پاس رہے، لہٰذا دونوں کے لیے خیر و برکت تھے، اور ان کے خدمت گزار، اطاعت شعار، اور صلہ رحمی کرنے والے تھے، اور ان کے دل کا نور اور آنکھوں کا سرور تھے۔'' [1]

ناطقہ سر بگریباں ہے، اسے کیا کہیئے، قرآن، نہ تو شوہرِ مریمؑ کا ذکر کرتا ہے اور نہ ہی والدِ عیسیٰؑ کا۔ خدا کی کتاب میں، نہ تو حضرت عیسیٰؑ کے اوصافِ حمیدہ اور خصائلِ حسنہ میں کہیں یہ الفاظ ہیں کہ بَرًّا بِوَالِدِهٖ اور نہ ہی یہ الفاظ کہ بَرًّا بِوَالِدَيْهِ جیسا کہ حضرت یحییٰ کے تذکرہ میں، یہ الفاظ مذکور ہیں، کہ قرآن مجید کے قطعی اور یقینی متن کے مقابلہ کے لیے، [illegible] انجیل کا سہارا لے کر، یہ کہا جاتا ہے:

> ''اُن (حضرت عیسیٰؑ) کے والد کا انجیل میں ذکر موجود ہے، اور وہ یوسف تھے۔'' [2]

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۰ [2] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۷۳

اس کے بعد علماءِ تفسیر اور مترجمین قرآن کے بارے میں، جناب ''معترض'' صاحب فرماتے ہیں:

''قرآن میں ایجاز و اختصار سے بہت کام لیا گیا ہے، جس سے علماء، مفسرین اور مترجمین نے ناجائز فائدہ اٹھا کر، غیر معقول مطلب بیان کیے ہیں۔ مثال کے طور پر، اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد، حضرت مریمؑ کے اپنے بیٹے کو سوار کرا کر، اپنی قوم کے پاس لانے کا ذکر کیا ہے، لیکن قوم کے اعتراض پر، حضرت عیسیٰؑ کے جواب ہی سے معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ جواب اس زمانہ کا ہے جب حضرت عیسیٰؑ، جوان ہو کر، نبی بنائے جا چکے تھے اور صاحب کتاب بن چکے تھے۔'' [1]

خدا کی شان کہ جو شخص، ایجاز و اختصار کی آڑ میں، ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے، قرآنی مفاہیم میں، اضافی الفاظ کے پھانے ٹھونک کر، خود ''غیر معقول مطلب بیان'' کرنے کا خوگر ہے، وہ، الٹا اس حرکت کا مرتکب، دوسروں کو قرار دیتا ہے، صرف اس لیے کہ اس کے اپنے ''غیر معقول مطلب'' کی طرف، کسی کی توجہ، مبذول نہ ہونے پائے۔

اب، یہاں، اسی اقتباس میں ملاحظہ فرمائیے کہ ''معترض'' صاحب کے نزدیک، جب ''حضرت عیسیٰؑ، جوان ہو کر نبی بنائے گئے تھے اور صاحبِ کتاب بن چکے تھے''، تو اس وقت، حضرت مریمؑ، اپنے بیٹے کو اپنی قوم کے پاس لے کر آئی تھیں، لیکن آپ نبی کب بنے؟ کتاب دیئے جانے کے وقت، آپؑ کی عمر مبارک کیا تھی؟ اس کا جواب، پرویز صاحب، بایں الفاظ دیتے ہیں:

''گمانِ غالب یہی ہے کہ آپؑ نے یہ سلسلۂ رشد و ہدایت اور وعظ و تذکیر، شرفِ نبوت سے بہرہ یاب ہونے کے بعد ہی شروع کیا تھا (جو اناجیل کی رُو سے قریب، تیس برس کی عمر کا زمانہ ہے)۔'' [2]

مریمؑ، اپنے صاحبزادے کو لے کر، اپنی قوم میں کس طرح پہنچیں؟ ''تنقید نگار''

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۰ [2] شعلۂ مستور، صفحہ ۳۹

صاحب، کا جواب یہ ہے کہ حضرت مریمؑ، سوار کرا کر، اُنہیں اپنی قوم میں لائیں، اور یہ قرآنی الفاظ تحمله کا بجائے خود ''غیر معقول مطلب'' ہے۔ اس لیے کہ ولادتِ عیسٰیؑ کے وقت، حضرت مریمؑ، جوان تھیں، اور جب حضرت عیسٰیؑ، تیس برس کی عمر میں، شباب کو پہنچے، تو لامحالہ، خود حضرت مریمؑ، بوڑھی ہو چکی ہوں گی، ایسی حالت میں، تو قرآن مجید کو یہ کہنا چاہیئے تھا کہ ''حضرت عیسٰیؑ، اپنی (بوڑھی) ماں کو سوار کرا کر لائے'' لیکن قرآن (بقول ''مصنفِ کتاب'') الٹا یہ کہتا ہے کہ ''(بوڑھی) مریمؑ، اپنے (جوان) بیٹے کو سوار کرا کر لائیں۔'' کیا ہی عجیب اور مضحکہ خیز صورت حال ہے، اب اگر واقعی، کیفیتِ آمد یہ تھی، کہ تیس سال کی عمر میں بھی، حضرت عیسٰیؑ، سوار ہونے میں، اپنی ماں کے محتاج تھے، اور بوڑھی ماں خود پیدل تھی، تو پھر یقیناً اُن کا برّاً بوالدتی کہنا غیر صحیح قرار پاتا ہے، مزید برآں، یہ سواری کا مفہوم بھی، افتراء علی القرآن ہے، جس کے اولین مرتکب، پرویز صاحب اور ان کے مؤید، ''معترض'' صاحب ہیں۔

والدہ ہی کا ذکر کیوں؟:

سوال یہ ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام نے برًّا بِوَالِدَتِی کہہ کر، صرف والدہ ہی کا ذکر کیوں کیا؟ اپنے والد کا (اگر کوئی ان کا والد تھا، تو) کیوں ذکر نہیں کیا؟ ''مصنفِ کتاب'' صاحب فرماتے ہیں:

> ''درحقیقت، حضرت عیسٰیؑ نے موقع محل کی مناسبت سے، اپنی والدہ سے اس لیے حسن سلوک کا خاص طور پر ذکر کیا کہ ان کی والدہ نے ہیکل کے متولیوں اور مجاوروں کی مرضی اور اجازت کے بغیر، ہیکل سے نکل کر، اور اپنے گھر آ کر، اپنے چچا زاد یوسف نجار سے نکاح کر لیا تھا، اور یہ نکاح جائز اور شریعت کے مطابق تھا، لہٰذا، اس نکاح کے جائز ہونے کی دلیل کے طور پر، انہوں نے اپنی والدہ کے ساتھ، نیک سلوک کرنے کے الٰہی حکم کا ذکر کیا۔'' [1]

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۸۳

حضرت مریمؑ کے ہیکل سے نکلنے، متولیوں اور مجاوروں کی مرضی و اجازت کے بغیر نکاح کرنے اور اپنے چچازاد یوسف کی زوجیت میں آنے کا یہ سارا افسانہ قطعی بے اصل اور بے حقیقت ہے، جسے صرف اس لیے تراشا گیا ہے کہ یہودِ بے بہبود کے قرآن میں موجود طعن وتعریض کا سبب گھڑا جائے، اور جو فی الواقعہ، اصل سبب، قرآنی عبارات سے ظاہر ہوتا ہے، اسے نظرانداز کرتے ہوئے، معجزانہ ولادتِ مسیح کے انکار کی راہ ہموار کی جائے۔

قرآن کریم میں سرے سے اس خودساختہ کہانی کے کسی جزو کی طرف، کوئی اشارہ پایا ہی نہیں جاتا۔ مزید برآں، قرآن کریم، حضرت مریمؑ کو صِدِّيقَة قرار دیتا ہے، اگر قوانین ہیکل کی مخالفت، اُن سے واقع ہوئی تھی، تو کسی مقام پر، تو (اپنے صدیقہ ہونے کی بناء پر) اس ''جرم'' کا اعتراف کرتیں۔ لیکن قرآن کیا، دنیا کی کسی بھی گری پڑی کتاب میں، ان کا یہ اعتراف موجود نہیں ہے۔ اب اپنی طرف سے وضع کردہ افسانے کو، قرآنی متن کی تشریح قرار دینا، اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ لوگ ''خود بدلتے نہیں، قرآں کو بدل دیتے ہیں۔''

قدرے اور آگے چل کر، یہی ''ناقد ومعترض'' صاحب فرماتے ہیں:

''حضرت عیسیٰؑ کے، اس قول کا مطلب یہ ہے کہ اگر خدانخواستہ میری والدہ نے خدا کے حکم کے برخلاف کام کیا ہوتا، تو اللہ تعالیٰ مجھے کیوں اس ماں کے ساتھ بالخصوص حسن سلوک سے پیش آنے کا الگ حکم دیتے۔''[1]

اس عبارت میں، جناب ''معترض'' صاحب کی عقلِ عیار کی یہ کرشمہ سازی ملاحظہ فرمایئے، کہ گویا اللہ تعالیٰ نے ''ماں کے ساتھ بالخصوص حسنِ سلوک سے پیش آنے کا الگ حکم'' اور جداگانہ فرمان، دیا ہے۔ حالانکہ یہ کوئی ''الگ حکم'' ہے ہی نہیں، جو ''والدین'' کے ساتھ عام حسن سلوک کے علاوہ، ''ماں کے ساتھ، بالخصوص حسن سلوک سے پیش آنے'' کے لیے دیا گیا ہو، یہی واحد، یکتا اور تنہا حکم ہے، جس میں صرف اور صرف ماں ہی کا ذکر ہے،

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۸۳

لیکن جناب طاہر سورتی صاحب کے اعتراض سے بچنے کی خاطر، اور حضرت عیسیٰؑ کے صرف اپنی والدہ کے ساتھ رویۂ احسان کو اُن کے ''والد'' کے ساتھ وابستہ کرنے کے لیے، یہ کرشمہ سازی کی گئی ہے۔

پھر یہ بھی کیا خوب استدلال ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے قول کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ ان کی والدہ نے خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی نہیں کی، اس لیے اللہ تعالیٰ نے، اُن سے حسنِ سلوک کا، اُنہیں، حکم دیا ہے۔ یقیناً حضرت مریمؑ نے کسی بھی حکمِ خداوندی سے سرکشی وسرتابی نہیں کی، نہ یہود کے بہتانات کی رو سے، اور نہ ہی منکرینِ معجزات کے من گھڑت افسانوں کی رو سے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تو اُن ماؤں (اور باپوں) کے ساتھ بھی احسان کا طرزِ عمل اپنانے کا حکم دیا ہے، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی مخالفت کرتے ہوئے، نہ صرف یہ کہ کفر وشرک پر قائم ہیں، بلکہ اپنی اولاد کو بھی، اس ضلالت میں گھسیٹنے کے درپے ہیں۔ جب امر واقعہ یہ ہے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کو ''ماں کے ساتھ، بالخصوص حسن سلوک سے پیش آنے'' کے حکم کو، ''الگ حکم'' قرار دینا، کیا محض معجزانہ ولادتِ مسیحؑ کے انکار کی خاطر نہیں ہے؟

تصریحِ سادس (ولم يمسسني بشر):

مولانا طاہر سورتی مرحوم نے، حضرت عیسیٰؑ کی بن باپ ولادت کے سلسلہ میں، اپنی چھٹی تصریح، ان الفاظ میں پیش فرمائی ہے:

> حضرت مریمؑ کے پاس، جب اللہ کی روح، ایک بھلے چنگے بشر کے روپ میں آئی، تو انہوں نے اس سے اللہ کی پناہ مانگی، جس پر اس نے کہا ''میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں، اور تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشنے کے لیے آیا ہوں۔'' اس پر حضرت مریمؑ اور فرستادہ کے درمیان، یوں کلام ہوتا ہے:
>
> قَالَتْ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِیًّا قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَیَّ هَیِّنٌ وَّلِنَجْعَلَهٗۤ اٰیَةً وَّ رَحْمَةً مِّنَّا وَ كَانَ اَمْرًا مَّقْضِیًّا (سورہ مریم – آیات ۲۰،۲۱)

''(مریم نے کہا) ''میرے بچہ کیونکر ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا، اور نہ میں زنا کار ہوں۔'' (فرستادہ نے) کہا ''اے مریم! معاملہ ایسا ہی ہے جیسے تو کہہ رہی ہے، تیرے رب کا ارشاد ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے آسان ہے، تا کہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک آیت، اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں، اور یہ طے شدہ امر ہے۔''

غور فرمائیے! اللہ کا فرستادہ (روح) حضرت مریمؑ کے پاس خلوت میں بشر کا روپ دھار کر پہنچتا ہے کہ میں بچہ دینے کے لیے آیا ہوں۔ اگر وہ ان کا شوہر ہوتا، تو وہ اس سے خدا کی پناہ کیوں مانگتیں۔

پھر ملاحظہ فرمائیے، وہ حیرت سے کہتی ہیں کہ میرے بچہ، ہوگا کیونکر جبکہ حالت یہ ہے کہ نہ مجھے کسی مرد نے چھوا ہے، اور نہ میں خود زنا کار ہوں۔ اب اگر ان کی شادی یا منگنی ہو چکی تھی تو پھر بچہ ہونے پر تعجب کی بات کون سی تھی؟ اور انہیں یہ بتانے کیا ضرورت تھی کہ نہ تو مجھے کسی مرد نے چھوا ہے، اور نہ میں بدکار ہوں۔''[1]

''معترض'' صاحب کا پہلا تردیدی نکتہ:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی اس مدلل تصریح پر، جناب ''تنقید نگار'' صاحب اپنے پہلے تردیدی نکتہ میں تحریر فرماتے ہیں:

''اگرچہ ان دو آیات کا ترجمہ اور تشریح اس مقام پر پہلے کیا جا چکا ہے، جہاں طاہر سورتی مرحوم نے ان کا سلسلہ وار ترجمہ دیا ہے، لیکن چونکہ انہوں نے وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ کا عنوان قائم کر کے، پھر اس کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے، اس لیے دوبارہ عرض ہے کہ جب حضرت مریمؑ ہیکل میں، فرشتوں کی طرف سے بشارت ملنے کے بعد، اپنے گھر آ گئیں، اور اہل خانہ سے علیحدگی میں ایک

---

[1] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۷۰ تا صفحہ ۷۱

جگہ جو شرقی جانب تھی، بیٹھی ہوئی تھیں، تو اللہ تعالیٰ نے، ایک سعید روح کو، جو ایک تندرست انسان تھا، ان کے پاس بھیجا۔ حضرت مریم نے فرشتوں کی طرف سے بشارت ملنے پر، اپنے نکاح کا معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیا تھا۔ اور وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کوئی شخص خود اپنی طرف سے آ کر، اس معاملہ میں دخل دے، چنانچہ اس سعید روح کو آتا دیکھ کر، بول اٹھیں: بلاشبہ میں تجھ سے رحمان کی پناہ میں آتی ہوں، اگر تو سچ مچ پرہیزگار ہے (جیسا کہ میں تجھے جانتی ہوں کہ تو ہے) تو اپنی طرف سے اس معاملہ میں کوئی دخل نہ دے۔ اگر مریم، اس شخص کو نہ جانتی ہوتیں، اور وہ کوئی غیر مرد ہوتا تو شور مچا کر اپنے گھر والوں کو بلا لیتیں۔ اس پر اس شخص نے کہا، میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا آیا ہوں (جس کا تجھے انتظار ہے، اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ تجھ کو پاک لڑکے کے دینے کا موجب بنوں۔'' یہ سن کر مریم نے کہا: میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، حالانکہ کسی انسان نے نہ تو (نکاح کے ساتھ) مجھے چھوا ہے، اور نہ ہی میں بدکار ہوں (تو یہ جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تجھے میرے پاس پاکیزہ بیٹا دینے کا باعث بننے کے لیے بھیجا ہے تو کیا تُو نکاح کی غرض سے آیا ہے؟) اُس شخص نے کہا بات یونہی ہے جیسے تو نے کہا (یعنی بغرض نکاح آیا ہوں، اور یہ نکاح تجھے مشکل نظر آتا ہے) تیرے رب نے فرمایا ہے کہ یہ (قوم کے اجماع کی مخالفت) میرے نزدیک، ایک ہلکی سی بات ہے، اور (ہمارا ارادہ ہے کہ) ہم اِسے لوگوں کے واسطے ایک نمونہ بنائیں اور یہ (سب کے لیے) ہماری طرف سے رحمت ہو، اور یہ بات اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہی ہے۔''[۱]

سورہ مریم کی آیت ۱۹، اور آیت ۲۰ کے چند گنے چنے الفاظ پر، ایک نظر ڈالتے ہوئے، اب اِس وسیع و عریض ترجمہ و مفہوم اور تشریح و تفسیر کو بھی ملاحظہ فرمائیے، جس میں

---

[۱] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۴ تا صفحہ ۸۵

''تنقید نگار'' صاحب کے قلم سے الفاظ کا سیلِ بے پناہ امڈ آیا ہے، اور پھر قرآنی مفاہیم میں، بین القوسین، اُن کے خود ساختہ اضافوں کو بھی پیشِ نظر رکھئے، اور ساتھ ہی قرآنی الفاظ کی حدود سے، اُس تجاوز کو بھی ملاحظہ فرمایئے جسے خود ساختہ تشریحات کرتے ہوئے، اپنایا گیا ہے۔ اس پوری کارروائی سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ کلام اللہ کی تغییر و تحریف میں یہ لوگ کس قدر جری اور دلیر واقع ہوئے ہیں۔ نیز یہ بھی، کہ ایک خدا ترس آدمی (جسے کل، روزِ قیامت، اللہ تعالیٰ کے حضور، جوابدہی کا احساس ہو)، قرآنی مفردات کی حدود سے، بال برابر تجاوز کے خیال ہی سے کانپ اٹھتا ہے، کجا یہ کہ وہ عملاً اس کا مرتکب ہو، لیکن یہ لوگ، فکرِ آخرت سے قطعی بے پرواہ، کتاب اللہ سے من چاہے مفاہیم اخذ کرنے کے لیے، یا قرآن کے منہ میں اپنے من پسند تصورات کو ٹھونسنے کے لیے، کیسے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں، نہ انہیں خدا کا خوف، نہ مخلوق سے شرم و حیا، نہ جہنم کا کوئی ڈر۔ فما اصبرھم علی النار

مولانا طاہر سورتی کی پیش کردہ ٹھیٹھ قرآنی تصریح کے بالمقابل، ''فاضل تنقید نگار'' کی پیش کردہ یہ تشریحِ آیات، ہمارے نزدیک، اتنی بھی قدر و قیمت نہیں رکھتی، جتنی اُس سیاہی کی، جو اس کی قلمبندی میں، انہوں نے استعمال کی ہے۔ اس لیے ایسی تحریفی کارگزاری پر، تبصرہ کرنے کی بجائے، کچھ نہ کہنا ہی بہترین تبصرہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خود قرآن مجید نے بھی، بعض مقامات پر، مشرکینِ عرب کے بعض لایعنی اور بے ہودہ اعتراض کو بیان کر کے، اس کا جواب دینے کی بجائے، جواب نہ دینے کی حکمتِ عملی کو اپنایا ہے، اس سکوت سے باطل پرستوں کے پندارِ غرورِ علم پر جو چوٹ پڑتی ہے، وہ جواب دینے کی صورت سے بھی شدید تر اور سنگین تر ہوتی ہے۔

ایک اور سخنسازی:

بہرحال، قرآنی مفاہیم کی تحریف کا یہ سلسلہ، ''تنقید نگار'' صاحب کے مندرجہ بالا اقتباس پر ختم نہیں ہوا، وہ، جاری ہے، چنانچہ اس کے بعد وہ رقمطراز ہیں:

''تفاسیر نے عموماً روح سے جبرائیل فرشتہ مراد لیا ہے۔ فرشتہ انسان کا ہم جنس

نہیں، اس لیے وہ کسی انسان کا باپ نہیں ہوسکتا، اس کے بعد ہے فَحَمَلَتْهُ جس کا معنی ہے: الغرض مریمؑ کے اہل میں یہ نکاح ہو گیا جس کے نتیجہ میں اس نے اس بچہ کو اپنے پیٹ میں لیا۔'' عورتیں، نکاح یا سفاح کے ذریعہ، مردوں سے حاملہ ہوتی ہیں۔ فرشتہ جبریل سے نکاح کی نسبت ناقابل تصور ہے۔''[1]

اس سخنسازی پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بات کس نے کہی یا لکھی ہے کہ ''فرشتہ انسان کا ہم جنس ہوتا ہے'' یا یہ کہ ''وہ (فرشتہ) کسی انسان کا باپ ہوسکتا ہے'' یا یہ کہ ''فرشتہ جبریل سے مریم کا نکاح ہوا، اور یوں وہ عیسیٰؑ کے والد قرار پائے۔'' جب یہ باتیں، نہ کسی نے کہیں، اور نہ کسی نے لکھیں، تو ان کی تردید کیسی؟ خود ہی ایسے مفروضے تراش لینا، اور پھر خود ہی اس کی تردید کے درپے ہونا، کیا آج کے ''ترقی یافتہ'' اور ''روشن خیالی'' کے دور میں، یہ بھی کوئی ''علمی خدمت'' ہے؟

جو بات، نزولِ قرآن سے لے کر، آج تک، تواتر و تسلسل سے کہی جا رہی ہے، وہ یہ ہے کہ...... ''حضرت مریمؑ کا حاملہ قرار پانا، نہ کسی نکاح کا نتیجہ تھا، اور نہ سفاح کا، بلکہ یہ بلا مسِ بشر، ایک معجزہ (کا نتیجہ) تھا'' ...... اس حمل کی بشارت، فرشتوں کے ذریعہ، خود اللہ تعالیٰ نے دی تھی اذ قالت الملائكة يمريم ان الله يبشرك بكلمة منه اور جبریل (فرشتہ) نے مریم کی خلوت میں، انسانی روپ میں نمودار ہو کر، اُن سے یہ کہا کہ...... ''میں تیرے رب کا فرستادہ ہوں، تاکہ تجھے بیٹا دوں'' ...... چند لمحے کی مزید باہمی گفتگو کے ذکر کے بعد، قرآن کہتا ہے فَحَمَلَتْهُ پس مریم نے اس بچے کو اپنے پیٹ میں لیا۔ یہ حمل کیسے اور کیونکر ہوا؟ وقوعِ حمل میں فرشتہ کا کردار کیا تھا؟ تھا بھی یا نہیں؟ ان میں سے کسی چیز کی وضاحت، قرآن نے یا قرآن نازل کرنے والے نے نہیں کی۔ البتہ اس ضمن میں ایک اور مقام پر صرف یہ کہا گیا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا ''ہم نے اُس (مریم) میں، اپنی روح

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۵

میں سے پھونکا'، اور دوسرے مقام پر فیھا کی بجائے فِیهِ کے الفاظ ہیں، جس میں واقع مذکر کی ضمیر مجرور، فَرْجَهَا کی طرف لوٹتی ہے، جو اس سے قبل مذکور ہے، اس سے زیادہ، مریم کے وقوع حمل کی کوئی تفصیل، قرآن میں نہیں ملتی، اس لیے کہ یہ پردے کی وہ بات ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے بھی بے نقاب کرنا، مناسب خیال نہیں کیا۔ اب جس چیز کو اللہ تعالیٰ، خود مستور رکھنا چاہتے ہیں، اس کی ٹوہ لگانا، کسی بندۂ مومن کے لیے مناسب نہیں، اور نہ ہی یہ بات، اسے زیب دیتی ہے کہ وہ قرآنی مفاہیم میں، اپنے خود ساختہ الفاظ کی پچریں ٹھونک کر، اپنے ''مزعومہ مفاہیم'' کو ''قرآنی حقائق'' بنا کر پیش کرے۔

اور یہ سخنسازی بھی:

اس کے بعد، جناب ''تنقید نگار'' صاحب کی یہ سخنسازی بھی ملاحظہ فرمایئے اور پھر قارئین کرام، خود فیصلہ فرمالیں کہ اسے ''سخنسازی'' کہا جائے یا ''تحریفِ قرآن''۔

''رُوحنا میں روح سے مراد انسان ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز کا خالق ہے، اس لیے روح بھی مخلوق ہے، اور انسان بھی مخلوق ہے۔ المنجد نے روح کے متعدد معانی لکھے ہیں، ایک روح یعنی جان ہے دوسرا معنٰی نفس ہے، اور نفس کا ایک معنٰی شخص بھی ہے نفس کے شخص کے معنٰی میں المنجد نے ایک مثال دی ہے جو یہ ہے عندی خمسۃ عشر نفسا (میرے پاس پندرہ شخص ہیں)۔ آیت کریمہ فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا کے اس لحاظ سے معنٰی ہوں گے، ''اس موقع پر ہم نے مریمؑ کی طرف ایک شخص کو بھیجا جو ان کے سامنے آیا۔ یہ شخص ایک تندرست انسان تھا، ویسے اردو میں جب کوئی کہتا ہے فلاں ایک نیک روح ہے، تو اس سے مراد ہوتی ہے ''وہ ایک باکردار شخص ہے۔''[1]

ایک طرف، جب میں اس قسم کی ''سخنسازیوں'' کو دیکھتا ہوں، جو تحریف کی حد تک پہنچی ہوئی ہوں، اور جن میں مغالطہ آفرینیوں کے کرشمے دکھاتے ہوئے، خلطِ مبحث سے

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۵

کام لیا گیا ہو، اور دوسری طرف، اس ''سخنساز'' کے بارے میں یہ پڑھتا ہوں کہ وہ:

''...... صاحب بھی عربی زبان و لغت کے بڑے آشنا ہیں۔ پنجاب یونیورسٹی سے ایم اے عربی ہیں، پاکستان میں عراقی سفارت خانہ میں قریب دس سال تک مترجم کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ عربی اردو انگریزی مجلہ اخبار العرب میں دو سال تک اردو سے عربی میں ترجمہ اور تبیین کا فریضہ بھی سرانجام دیا ہے۔ ان کے کئی تحقیقی مقالات ملکی رسالوں میں شائع ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکے ہیں...... قرآن کریم کے ترجمہ و تفسیر میں، خصوصاً عربی گرامر کے حوالہ سے خاصی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کی علامہ ہر سورتی کے استدلال پر گرفت خاصی اہم اور اکثر مقامات پر مسکت ہے۔'' [1]

تو میں سراپا حیرت و استعجاب ہو کر، انگشت بدنداں رہ جاتا ہوں، اور مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ ''سخنسازی'' واقعی، اُن ہی صاحب کی ہے، جس کی شانِ اقدس میں یہ قصیدہ خوانی کی گئی ہے۔

اس قدر ''فضائل و مناقب'' کی حامل ہستی سے بھلا یہ پوچھنے کی جرأت کون کر سکتا ہے کہ ''روحنا سے مراد، انسان'' کس ڈکشنری میں لکھا ہوا ہے۔ چھوڑیئے، دنیا و جہان کی کتبِ لغات کو، خود ''مفکر قرآن'' ہی کی اختراع کردہ ''لغات القرآن'' میں سے یہ معنیٰ دکھا دیجئے۔

اور پھر یہ بھی کیا خوب دلیل پیش کی ہے کہ...... ''اللہ تعالیٰ، ہر چیز کا خالق ہے، اس لیے روح بھی مخلوق ہے، انسان بھی مخلوق ہے ....'' حالانکہ جانور بھی مخلوق ہیں، شجر و حجر بھی مخلوق ہیں، پرند و چرند بھی مخلوق ہیں، حشرات و درند بھی مخلوق ہیں۔ نمعلوم مخلوقات کی یہ فہرست، ادھوری چھوڑ کر، وہ، جلدی سے المنجد کی پناہ گاہ میں کیوں داخل ہو گئے۔

پھر جس طرح، علم پیمائشِ ارضی (Geometry) میں، ایک زاویئے کا دوسرے سے،

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ بعد از انتساب

اور دوسرے کا تیسرے سے متماثل ہونے سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ پہلا اور تیسرا زاویہ باہم متماثل ہیں، اسی طرح المنجد کے حوالہ سے، روح سے نفس اور نفس سے انسان مراد لے کر روح بمعنٰی انسان ''ثابت'' کر کے، (Linguistic Geometry) کا جو نیا علم ایجاد کیا ہے، وہ ان کے ''فضائل ومناقب'' میں، مزید چار چاند لگا دیتا ہے۔

اور آخر میں یہ دلیل دیتے ہوئے کہ...... ''اردو میں جب کوئی کہتا ہے کہ فلاں نیک روح ہے، تو اس سے مراد ہوتی ہے وہ ایک باکردار شخص ہے''...... موصوف محترم، حقیقی اور مجازی مفہوم میں خلط مبحث سے کام لیتے ہیں، اور یہ بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالٰی نے، نہ تو ''نیک روح'' کا لفظ استعمال کیا ہے کہ اس سے ''باکردار شخص'' مراد لیا جائے، اور نہ ہی ''نفس'' کہا ہے کہ المنجد کی آڑ لے کر، اس سے کوئی ''بشری شخصیت'' مراد لی جائے، اور نہ ہی مفرد انداز میں فقط ''روح'' کہا ہے، بلکہ رُوْحَنَا کہا ہے، جس کا معنٰی ''ہمارا شخص'' بنتا ہے (بشرطیکہ روح بمعنی شخص ثابت بھی ہو)۔ اب چونکہ ترجمۂ آیت میں ''ہمارا شخص'' جچتا نہیں ہے، اور اس میں غرابت پائی جاتی ہے، اس لیے ہمارے ''مفکر قرآن'' صاحب کے ''وکیلِ صفائی'' یہاں ضمیر مفعولی کو نظر انداز کر کے، ساری بحث کا مرکز ومحور، (رُوحنا کی بجائے) صرف ''روح'' کو قرار دیتے ہیں۔ باقی رہا تمثل لھا، تو حرام ہے کہ اس کا صحیح مفہوم، ان کے ترجمہ میں کہیں آ پایا ہو۔

یہ ہے، ''ان کی مولانا طاہر سورتیؒ کے استدلال پر گرفت'' جو ''خاصی اہم'' بھی ہے، اور ''اکثر مقامات پر مسکت'' بھی ہے۔

تصریحِ سابع (کَذَالِکِ):

حضرت عیسٰی علیہ السلام کی بن باپ ولادت کی ساتویں تصریح، مولانا طاہر سورتی مرحوم نے بایں الفاظ پیش کی ہے:

کَذَالِکِ: اس کے بعد، اس فرستادہ کا کَذَالِکِ کہنا، ایک عظیم ثبوت ہے جس سے یہ ثابت ہو رہا ہے کہ یہ صحیح ہے کہ نہ تجھے کسی مرد نے چھوا ہے اور

نہ ہی تو زنا کار ہے۔ لیکن اسی حالت میں تجھے بچہ بھی دیا جائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس حالت میں بچہ کا ملنا ناممکن ہے، مگر تیرا رب کہتا ہے کہ ایسا کرنا اس کے لیے آسان ہے۔ یہاں ایک تو کَذٰلِكِ غور طلب ہے۔ اس میں شروع کا ''کاف'' تو حرفِ تشبیہ ہے، اور آخر کا ''کاف'' ضمیر حاضر مؤنث کا ہے۔ یعنی اے مریم! جس طرح تو نے کہا ہے بات ایسی ہی ہے۔ کَذٰلِكَ یا کَذٰلِكِ قرآن میں جہاں بھی آیا ہے، اپنے ماقبل کی تائید کرتا ہے، آخری کاف، مخاطب کے مطابق (مذکر، مؤنث یا واحد و مثنیٰ و جمع کے لیے) بدلتا رہتا ہے، یہاں چونکہ حضرت مریمؑ مخاطب ہیں، اور ان کی بات کی تصدیق مراد ہے، لہٰذا، آخری کاف پر زیر ہے۔ یہ اتنا واضح ثبوت ہے اِس بات کا کہ نہ تو حضرت مریمؑ کو کسی مرد نے چھوا، نہ ہی وہ زنا کار تھیں، لیکن بایں ہمہ ان کو بچہ بھی دیا گیا۔ آخری کاف کا زیر، ایسی حقیقت ہے، جس کی تصریح خود پرویز صاحب کی لغات القرآن میں بھی موجود ہے، لیکن دیکھیے، جب آدمی، حق کو چھوڑ کر دھاندلی بازی پر اُتر آتا ہے تو وہ موڑ توڑ کر کیسی کیسی تاویلات کرتا ہے، چنانچہ شعلۂ مستور کے صفحہ ۱۰۰ پر اس کَذٰلِكِ کی قوت کو ختم کرنے، اور اپنی من مانی تاویل کو ثابت کرنے کے لیے کس قدر جاہلانہ معنے کیے گئے ہیں جو نہ صرف قرآنی روح کو ختم کر دیتے ہیں، بلکہ علمی امانت کے بھی خلاف ہیں۔ فرماتے ہیں:

ہر شخص جانتا ہے کہ حمل کس طرح قرار پایا کرتا ہے۔ کَذٰلِكِ اسی طرح، جس طرح ہر شخص جانتا ہے، اور جس طرح، خود حضرت مریم کے دل میں خیال گزرا تھا کہ اس کے لیے بشر کے ساتھ تمسک کی ضرورت ہے۔

اسے کہتے ہیں یُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ قرآن مجید کچھ کہہ رہا ہے، اور یہ اپنی چرب قلمی اور سحر خطابت سے کہاں کی بات کدھر لے گئے ہیں، قرآن

مجید یہ کہہ رہا ہے کہ واقعۃً اے مریم! تیرا استعجاب برمحل ہے، اور اپنے متعلق جو کچھ تو نے کہا ہے، وہ بھی حق ہے۔ نہ تو تجھے کسی بشر نے چھوا ہے، اور نہ تو زنا کار ہے، مگر بایں ہمہ یہ خدا کا طے شدہ فیصلہ ہے کہ ایسا ہی ہوگا۔ یہاں قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ بھی بتا رہا ہے کہ یہ عام قاعدہ سے الگ ہٹی ہوئی بات ہے، ورنہ اللہ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ایسا کرنا مجھ پر آسان ہے۔ زن و شوہر کے تعلقات کے بعد بچہ کا پیدا ہونا معمول ہے۔ یہ تو خدا کا عمومی قاعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کی اُن سنتوں میں سے ہے، جنہیں تمام انسان جانتے ہیں۔'' [۱]

اس تصریح کی تردید میں، ''تنقید نگار'' صاحب، قرآنی آیات کا صاف شفاف اور سیدھا سادا ''ترجمہ'' پیش کرنے کی بجائے، اپنے خودساختہ اضافوں کے ساتھ، الفاظ کا ایسا کباڑ خانہ پیش کرتے ہیں، جسے ''مفہومِ آیات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ ان اضافوں سے قرآنی مفہوم کو مسخ کر کے، ان صاحب نے، جس طرح مطلب برآری کی ہے، وہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ظاہر ہے۔

طاہر سورتی مرحوم كَذَالِكِ سے پہلے بھی استدلال کر چکے ہیں۔ اس کے اعادہ سے جو بات وہ ثابت کرنا چاہتے ہیں، اس میں ہمیں کلام ہے۔ ہمیں دیکھنا یہ ہے کہ زیرِ بحث كَذَالِكِ سیاق وسباق کے لحاظ سے یہاں کس مفہوم کا حامل ہے۔'' [۲]

اس کے بعد، وہ جو ''سیاق وسباق'' پیش کرتے ہیں، وہ، قرآنی آیات کے کسی صاف اور صریح ترجمے سے ماخوذ نہیں ہے، بلکہ اضافی الفاظ اور الحاقی عبارات سے ماخوذ ہے۔ قارئین کرام، خود ملاحظہ فرما سکتے ہیں:

اس كَذَالِكِ کا تعلق سورہ مریم کی آیات ۱۹، ۲۰ سے ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُولُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَامًا زَكِيًّا (۱۹)

---

[۱] ابن مریم اور پرویز، صفحہ ۷۱ تا صفحہ ۷۳ [۲] ابن مریم، پرویز طاہر سورتی، صفحہ ۸۷

قالت انی یکون لی غلام وَّلَمْ یَمْسَسْنِی بَشَرٌ وَلَمْ اَ كُ بَغِیًّا (۲۰)

ترجمہ: اس (سعید روح نے) کہا: میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا آیا ہوں (جس کا تو انتظار کر رہی ہے) اور اللہ تعالیٰ نے مجھے تیرے پاس اس لیے بھیجا ہے کہ میں تجھے ایک پاکیزہ لڑکا دینے کا موجب بنوں۔ یہ سعید روح، مریمؑ کا چچا زاد، یوسف نجار تھا۔ وہ ایک تندرست انسان تھا۔ ایک تندرست انسان، اگر بیٹا بخشنے کا باعث بننے کے لیے بھیجا گیا ہو، تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ مریمؑ سے نکاح کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ مریمؑ نے اس بات کو سمجھ کر کہا: میرے ہاں بیٹا کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ کسی بشر نے مجھ سے نکاح کر کے نہ چھوا ہے، اور میں بدکار بھی نہیں ہوں (اس صورت میں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زنا کے لیے نہیں آسکتا، تو کیا تو نکاح کے لیے آیا ہے)۔ (اس فرستادہ نے) کہا: جس طرح تو نے سمجھ کر سوال کیا ہے، بات یونہی ہے (میں نکاح کے لیے ہی آیا ہوں)۔" یہ مفہوم، سیاق و سباق کے مطابق، اور اصنافِ سخن کی ایک صنف ایجاز و حذف سے بنتا ہے۔ [1]

یقیناً یہ مفہوم، "سیاق و سباق کے مطابق ہے" مگر "سیاق و سباق" قرآنی آیات کے تراجم سے نہیں بلکہ اُن خود ساختہ تشریحات سے گھڑا گیا ہے، جن کو قرآن سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ اب اس "سیاق و سباق" اور "مفہوم آیات" کو دیکھتے ہوئے، دو ہی باتیں ممکن ہیں، تیسری بات کا کوئی امکان ہی نہیں۔

اولاً ...... یہ کہ، اگر یہی، اصلی اور حقیقی سیاق و سباق ہے اور یہی صحیح اور درست مفہومِ آیات ہے، تو پھر اللہ تعالیٰ، معاذ اللہ، ثم معاذ اللہ، بیان و کلام، اور اظہارِ مدعاء کی اتنی بھی قدرت نہیں رکھتا، جتنی ہمارے "تنقید نگار" صاحب کو حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ پر، موصوف کا یہ بڑا احسان ہے کہ جس بات کو، خود خالقِ کائنات، اچھے، صاف اور شفاف انداز میں بیان

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۸

نہیں کر سکا، اُسے خود انہوں نے بڑے سلیقے اور قرینے سے بیان کر دیا، اور لوگوں کو، اللہ میاں پر ہنسنے کا موقع نہیں دیا۔

ثانیاً ...... یہ کہ، اگر ایسا نہیں ہے، تو پھر یقیناً ''تنقید نگار'' صاحب کا بیان کردہ سیاق وسباق اور مفہوم آیت قطعی غلط، سراپا باطل، نِرا جھوٹ، اور نتیجتاً ''تحریف مفہوم قرآن'' ہے۔ خود سوچیئے کہ قرآن میں یہ کہاں مذکور ہے کہ مریمؑ، اُس فرستادہ (جو بقول ''مصنفِ کتاب''، مریمؑ کا چچازاد بھائی تھا) کا انتظار کر رہی تھی؟ قرآن میں مریمؑ کا نکاح تو دُور کی بات ہے، اس کی منگنی تک کا ذکر نہیں ہے۔ پھر کیا یہ حذفِ ایجاز کی آڑ میں، قرآنی مفاہیم میں خود ساختہ اضافہ نہیں ہے؟ ''مریمؑ نے اس بات کو سمجھ کر کہا۔'' کس بات کو؟ قرآن میں کہاں مذکور ہے کہ مریمؑ نے اس بات کو سمجھا؟ مریمؑ کا آنے والے سے یہ کہنا کہ ''تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے زنا کے لیے نہیں آ سکتا، تو کیا تو نکاح کے لیے آیا ہے؟'' کہاں بصورت سوال، مذکور فی القرآن ہے؟ پھر فرشتے کا اثباتاً یہ جواب دینا کہ ''میں نکاح ہی کے لیے آیا ہوں'' کس آیت میں مذکور ہے؟ یہ ساری باتیں، تو جناب ''تنقید نگار'' صاحب نے تحریفاً قرآن کے مفہوم میں داخل کی ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ایک خدا ترس اور سچے آدمی کی صداقت کی تو بہر حال، ایک حد ہوتی ہے، جس سے آگے، وہ تجاوز نہیں کر سکتا، ورنہ اس کا قدم، گلزارِ حقیقت سے بھٹک کر، خارزارِ کذب و زور میں جا پڑے گا، لیکن جن کا اوڑھنا بچھونا، کذب و افتراء علی اللہ ہو، معنوی تحریف روزمرہ کا مشغلہ ہو، قواعدِ زبان کو نظر انداز کر کے، قرآن سے من مانے معانی اخذ کرنا، جن کی مستمر عادت ہو، تنکیسِ واقعات، مسخ حقائق، اور تقلیبِ امور، جن کی دائمی روش ہو، اُن کی تحریفی کارگزاریوں کی تو کوئی حد ہی نہیں، جہاں جا کر، وہ، رک جائیں۔ ایسے لوگوں کا مقابلہ، کوئی شریف النفس کہاں کر سکتا ہے۔ اس لیے، اس خود ساختہ سیاق و سباق اور تحریف آیات پر مشتمل ایسی تشریحات کا جواب دینے کی نسبت، جواب نہ دینا ہی بہتر ہے، کیونکہ خدا نے ہمیں ایسے ذوقِ فضولیات سے محفوظ رکھا ہے۔ اس لیے ہم، اس کی

تردید میں اپنا اور اپنے قارئین کا وقت ضائع کرنے کی بجائے، آگے بڑھتے ہیں۔

"مہمل" ترجمہ کا الزام:

اپنے سابقہ اقتباس کے متصل ساتھ ہی، جناب "تنقید نگار" صاحب، مولانا طاہر سورتی مرحوم کے بارے میں فرماتے ہیں:

"طاہر سورتی مرحوم نے سورہ مریم کی آیات ۲۰، ۲۱ کا جو ترجمہ کیا ہے، اور جو ان کی چھٹی دلیل میں اوپر درج ہے ایک مہمل ترجمہ ہے۔" [۱]

اب ذرا اس ترجمہ کو بھی ملاحظہ فرما لیجیے، جس پر "مہمل ترجمہ" ہونے کا حکم جاری کیا گیا ہے:

"(مریمؑ نے) کہا میرے بچہ کیونکر ہوگا، حالانکہ مجھے کسی بشر نے چھوا نہیں اور نہ میں زنا کار ہوں۔ (فرستادہ نے) کہا "اے مریمؑ! معاملہ ایسا ہی ہے جیسے تو کہہ رہی ہے۔ تیرے رب کا ارشاد ہے کہ ایسا کرنا میرے لیے آسان ہے تاکہ ہم اسے لوگوں کے لیے ایک آیت اور اپنی طرف سے رحمت بنا دیں، اور یہ طے شدہ امر ہے۔" [۲]

قبل اس کے کہ اس ترجمہ کے "مہمل" ہونے کی وہ دلیل پیش کی جائے، جو "تنقید نگار" صاحب نے تحریر کی ہے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِن ہی آیات کا وہ ترجمہ بھی پیش کر دیا جائے، جو کبھی خود پرویز صاحب کے قلم سے برآمد ہوا تھا، پھر ان دونوں متماثل تراجم کو دیکھتے ہوئے، قارئین کرام، خود فیصلہ فرمالیں کہ "مہمل ترجمہ" ہونے کے فتویٰ کی زد، کہاں جا پڑتی ہے۔

مریم بولی "یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو، حالانکہ کسی مرد نے مجھے چھوا نہیں، اور نہ میں بدچلن ہوں۔" فرشتہ نے کہا "ہوگا ایسا ہی۔ تیرے پروردگار نے فرمایا کہ یہ میرے لیے کچھ مشکل نہیں۔ وہ کہتا ہے یہ اس لیے ہوگا کہ اسے

---

[۱] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتی، صفحہ ۸۸ [۲] ابن مریمؑ اور پرویز، صفحہ ۷۰ تا صفحہ ۷۱

لوگوں کے لیے ایک نشانی بنا دوں، اور میری رحمت کا اس میں ظہور ہو، اور یہ ایسی بات ہے جس کا ہونا طے پا چکا۔'' [۱]

دونوں تراجم میں کَذٰلِكِ کا ایک ہی مفہوم بیان کیا گیا ہے، فرق اگر ہے تو الفاظ میں ہے، ورنہ حقیقت ایک ہی ہے جو دونوں تراجم میں پائی جاتی ہے۔ پرویز صاحب کے الفاظ۔ ''ہوگا ایسا ہی'' مختصر اور جامع ہیں جبکہ طاہر سورتی مرحوم کے الفاظ ''معاملہ ایسا ہی ہے جیسے تو کہہ رہی ہے'' میں قدرے اطناب ہے۔ بہرحال، اب مولانا طاہر سورتی مرحوم کے ترجمہ کے ''مہمل'' ہونے کی دلیل، ملاحظہ فرمائیے:

''اس ترجمہ کے مطابق، مریمؑ کے یہ سوال کرنے کا کہ میرے بچہ کیونکر ہوگا حالانکہ مجھے کسی بشر نے نہیں چھوا، اور نہ میں زنا کار ہوں، یہ کوئی جواب ہی نہیں کہ ''اے مریمؑ! معاملہ ایسا ہی ہے جیسے تو کہہ رہی ہے۔ اس سے کسی کے کچھ بھی پلے نہیں پڑے گا۔'' [۲]

چونکہ ''تنقید نگار'' صاحب کے اپنے پلّے کچھ نہیں پڑ رہا ہے، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ کسی کے پلّے بھی کچھ نہیں پڑے گا۔ اور اُن کے اپنے پلے کچھ نہ پڑنے کی وجہ، بقول علامہ اقبال، صرف یہ ہے:

بیان میں نکتۂ توحید آ تو سکتا ہے
ترے دماغ میں بت خانہ ہو تو کیا کہیے

مقتضاءِ جواب:

اس کے ساتھ ہی، وہ فرماتے ہیں:

''''میرے بچہ کیونکر ہوگا؟ کا جواب، اس بات کا متقاضی ہے کہ مجھے بتایا جائے کہ کیا تو مجھ سے نکاح کے لیے آیا ہے، کیونکہ زنا کے لیے آنا تو ناقابل تصور ہے، اللہ تعالیٰ نے تجھے زنا کے لیے ہرگز نہیں بھیجا ہوگا۔'' [۳]

---

[۱] معارف القرآن، جلد ۳، صفحہ ۴۹۲ [۲] + [۳] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۸۸

اب جناب ''تنقید نگار'' صاحب کو، (جو ''قرآن کریم کے ترجمہ وتفسیر میں، اور خصوصاً عربی گرامر کے حوالہ سے خاصی مہارت رکھتے ہیں'') یہ بات کون سمجھائے کہ .... جواب صرف اور صرف، اس بات کا متقاضی ہے کہ ''مجھے بتایا جائے کہ اس حال میں کہ نہ میں بدکار ہوں، اور نہ ہی کسی مرد کی ممسوسہ ہوں، تو پھر میرے ہاں بچہ کیسے پیدا ہوگا؟...... جواب دیا گیا کَذَالِكِ (بمطابق ترجمۂ پرویز صاحب) ''ہوگا ایسا ہی'' یا (بقول طاہر سورتی صاحب) ''معاملہ ایسا ہی ہے جیسا تو کہہ رہی ہے'' اور ''اسی طرح'' بچہ کا عطا کیا جانا، تیرے رب پر مشکل نہیں ہے۔

هو علی هين :

اس کے بعد، جناب ''ناقد ومعترض'' صاحب، مولانا طاہر سورتی مرحوم کے اُس استدلال کے جواب میں، جو انہوں نے هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے الفاظ سے پیش کیا ہے، فرماتے ہیں:

''رہ گیا طاہر سورتی مرحوم کا یہ فرمانا کہ یہاں قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ بھی یہ بتا رہا ہے کہ یہ عام قاعدہ سے الگ ہٹی ہوئی بات ہے، ورنہ اللہ کو یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی کہ ''ایسا کرنا مجھ پر آسان ہے''، تو جناب! سورہ مریم کی آیت ۹ میں، یہی بات حضرت زکریا کو بھی کہی گئی تھی، جہاں ارشاد ہے قال کذالك قال ربك هو علی هين حضرت زکریاؑ نے بشارت ملنے پر عرض کیا تھا کہ میرے لڑکا کیونکر ہوگا جبکہ میری بیوی بانجھ ہے، اور میں بڑھاپے کی حد کو پہنچا ہوا ہوں، تو اللہ نے ان کی بیوی کا بانجھ پن دور کر دیا (وَاَصْلَحْنَا لَهٗ زَوْجَهٗ)، اور حضرت زکریاؑ کو بھی سَوِيًّا تندرست کر دیا۔'' [1]

جناب ''تنقید نگار'' صاحب کی، اس ''سخنسازی'' کا جواب، گذشتہ صفحات میں، جہاں ولادتِ یحییٰؑ پر بحث کی گئی ہے، تفصیل سے دیا جا چکا ہے، اور یہ بتایا جا چکا ہے کہ حضرات یحییٰ وعیسیٰ علیہما السلام، دونوں کی پیدائش میں، اعجازی شان پائی جاتی ہے، اول الذکر کی ولادت

---

[1] ابن مریم، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۸۹

میں رکاوٹ، باپ کا انتہائی بڑھاپا اور ماں کا بانجھ پن تھا جبکہ ثانی الذکر کی پیدائش میں رکاوٹ، باپ کا عدمِ وجود تھا۔ پہلی صورت میں حضرت یحیٰی کی والدہ (یعنی حضرت زکریاؑ کی بیوی) کی اصلاح، معجزانہ طور پر ہوئی (جیسا کہ پہلے گزر چکا ہے) اور باپ کے انتہائی بڑھاپے کے باوجود، حضرت یحیٰی پیدا ہوئے، جبکہ دوسری صورت میں، حضرت مریمؑ، بلا مَسّ بشر حاملہ قرار پائیں، اور انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کو جنم دیا۔ دونوں صورتوں میں، جو اعجازی پہلو موجود ہیں، اُن ہی کے پیشِ نظر هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے الفاظ وارد ہوئے ہیں کیونکہ دونوں صورتوں میں ولادت کا عمل، ذرائع و اسباب کے اعتبار سے، معمول سے ہٹا ہوا ہے۔ اس پوری بحث سے یہ ظاہر ہے کہ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ کے الفاظ سے مولانا طاہر سورتی مرحوم کا استدلال، خاصا وزنی اور جاندار ہے، اور جناب ''تنقید نگار'' صاحب کی طرف سے ،ان الفاظ کی توجیہ، بہت ہی ضعیف، انتہائی بودی اور ازحد لچر ہے۔

کلمۂ اختتامیہ:

مولانا طاہر سورتی مرحوم کی ان ساتوں مدلل تصریحات، اور ان کی تردید و مخالفت میں، جناب ''ناقد و معترض'' صاحب کے پیش کردہ دلائل کا موازنہ، جو صاحبِ علم بھی، غیر جانبداری اور بے لاگ عدل و انصاف کے ساتھ کرے گا، وہ اول الذکر کے دلائل و براہین کو، انتہائی وزنی اور جاندار پائے گا، اور منکرینِ حدیث کے تجدد کے پا ۂ چوبیں کو سخت بے تمکین پائے گا اور یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے گا کہ فتنۂ انکارِ حدیث و معجزات کے علمبردار، نہ تو صاف شفاف اور سیدھا سادا ترجمۂ آیات کرنے پر آمادہ ہیں، اور نہ ہی قواعدِ زبان کا لحاظ کرنے پر تیار۔ اس کے برعکس، قرآنی آیات کے مفاہیم میں تحریف کی خاطر، دور کی کوڑی لاتے ہوئے، ایسی بات کرتے ہیں، جس کا قرآن سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ قرآن کریم کی نہایت مختصر اور جامع بات کو، بین القوسین خودساختہ اضافوں کے ذریعہ، من مانے معانی پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ضمیروں کو ان کے صحیح مراجع کی طرف لوٹانے کی بجائے، ان کے غلط مراجع مقرر کرتے ہیں۔ محاورۂ عرب کا نام لے کر، ایسے دور خیز اور

رکیک معانی بیان کرتے ہیں، جو کسی عرب کے سان و گمان میں بھی نہیں آ سکتے۔ ''تفسیر القرآن بالقرآن'' کا نعرہ، زبانوں پر سجا کر، عملاً قرآن کی تفسیر، مغربی نظریات کے زیر اثر کرتے ہیں، بلکہ امر واقعہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ، اپنے فکر و نظر کے اعتبار سے، مکمل طور اسیرِ فرنگ اور کُلی طور پر غلامِ مغرب ہیں۔ ان کے ہاں شرفِ تقدم، قرآن کو نہیں، بلکہ مغرب کی تحقیقات کو حاصل ہے۔ قرآن مجید، خواہ کتنے ہی حتم و یقین کے ساتھ، کوئی بات کہے، ان لوگوں کی نگاہ میں وہ صرف، اُس وقت قابل قبول قرار پاتی ہے، جب مغرب کے مآخذ، اس کی تائید کر ڈالیں، ورنہ قرآن کی بات، ان لوگوں کے نزدیک مبہم اور غیر واضح ہوتی ہے، اور مغرب کی طرف سے جو بات (خواہ کتنی ہی گری پڑی کتاب میں سے) پیش ہو، وہ واضح اور ٹھوس علم قرار پاتی ہے۔ جیسا کہ گذشتہ صفحات کی بحث سے واضح ہے۔

اب آخر میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کتاب ''ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ'' کے مصنف کی ایک ایسی دلیل کا جواب بھی دے دیا جائے، جسے انہوں نے اپنی تصنیف میں صفحہ ۱۰، صفحہ ۲۲، صفحہ ۸۳ اور صفحہ ۹۳ پر بتکرار و اعادہ پیش کیا ہے۔ وہ سورۃ الانعام کی آیت ۸۸ کے حوالہ سے فرماتے ہیں:

> ''اس سے پہلے جن انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، اور جو من اٰباء ھم وذریتھم واخوانھم میں ضمیرِ مجرور کا مرجع ہیں، وہ، ابراہیم، اسحاق، یعقوب، نوح، داوٗدؑ، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسماعیل، الیسع، یونس و لوط علیہم السلام ہیں۔ جس سے ظاہر ہے کہ ان سب انبیاء کے باپ تھے، اولاد تھی اور بھائی تھے۔'' [1]

امر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت میں مذکور انبیاء کرام کے باپوں، بھائیوں اور اولاد کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ تغلیباً کیا گیا ہے۔ یہ قطعاً ضروری نہیں ہے کہ ان انبیاء میں سے فرداً فرداً، ہر ایک کے وہ رشتہ دار موجود ہوں، جن کا تذکرہ من اٰباء ھم وذریتھم واخوانھم کے

---

[1] ابن مریمؑ، پرویز اور طاہر سورتیؒ، صفحہ ۱۰

الفاظ میں کیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر، حضرت یحییٰ علیہ السلام کی تو شادی ہی نہیں ہوئی تھی، پھر ان کی اولاد کا کیا سوال؟ نیز یہ کہ وہ اپنے والدین کے واحد فرزند تھے، ان کا سرے سے کوئی بھائی تھا ہی نہیں جبکہ آیت میں اولاد و اخوان کا بھی ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت عیسیٰ بھی اپنی والدہ کے اکلوتے بیٹے تھے، ان کا کوئی بھائی نہیں تھا۔ اناجیل کی رو سے، جن افراد کو ان کے بھائی قرار دیا گیا ہے وہ علماءِ محققین کے نزدیک، ان کے حقیقی بھائی نہیں تھے، بلکہ (Cousins) تھے۔ جیسا کہ ڈاکٹر مورس بکائے نے اس کی وضاحت کی ہے۔

Mary was a virgin mother. She preserved her virginity and did not have any children apart from Jesus. Jesus is biological exception. ¹

الغرض آیت میں، انبیاء کرام کے جن رشتہ داروں کا ذکر کیا گیا ہے، وہ تغلیب کے پہلو سے ہیں۔ جس کا مفاد یہ ہے کہ ان انبیاء مذکورین کی غالب تعداد کے ایسے اقارب موجود تھے، (نہ کہ ان میں سے ہر ایک کے ایسے رشتے دار موجود تھے)۔ اب جس طرح حضرت یحییٰ کا بھائی نہیں تھا اور ان کی اولاد بھی نہیں تھی، بالکل اسی طرح حضرت عیسیٰ کے والد بھی نہیں تھے، (اور اولاد بھی نہیں تھی)۔

اس باب کی پوری بحث سے یہ واضح ہے کہ ولادتِ مسیح میں بھی یہ لوگ، قرآن کی بات کو ماننے کی بجائے، مغرب کی بات مانتے ہیں جو خود منکرینِ معجزات ہیں، اور مغرب ہی کے طبیعی قوانین پر ایمان کے سہارے اپناتے ہوئے، یہ لوگ، قرآنی معجزات کو تسلیم کرنے کی بجائے، قرآن کریم کی تاویل، بلکہ تحریف پر اُتر آتے ہیں، تاکہ عام لوگ، قرآن کے نام پر دھوکہ کھا کر، محمد رسول اللہ والذین معه، کی پیروی سے دستکش ہو کر، منکرینِ حدیث کی اتباع کرنے لگ جائیں۔ مرزا غلام احمد قادیانی نے مسلمانوں کو، پیغمبر آخر الزماں ﷺ کی پیروی سے ہٹا کر، اپنی پیروی کے راستے پر ڈالنے کا کام، اپنی نبوتِ زائفہ کی آڑ میں کیا، لیکن منکرینِ حدیث اور منکرینِ معجزات، یہی کام، قرآن کا نام

¹ The Bible, The Quran and Science, by Maurice, Bucaille, Page 96

لے کر، اپنی کھوٹی تعبیرات کی آڑ میں کر رہے ہیں۔ نتیجہ اس کا بھی یہی ہے کہ لوگ محمد مصطفیٰ ﷺ کی پیروی سے ہٹ کر، ان لوگوں کی راہِ اتباع اختیار کریں۔

☆..........☆..........☆

ہماری دیگر کتابیں

جناب غلام احمد پرویز، اپنے الفاظ کے آئینے میں	ڈاکٹر پروفیسر حافظ محمد دین قاسمی
اسلام، پیغمبر اسلامؐ اور مستشرقین مغرب کا اندازِ فکر	ڈاکٹر سید عبدالقادر جیلانی
ہم کیوں مسلمان ہوئے؟	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
ہمیں خدا کیسے ملا؟	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
اوصافِ حمیدہ	ڈاکٹر عبدالغنی فاروق
مسلم نشاۃِ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	ڈاکٹر محمد امین
خطبۂ حجۃ الوداع	ڈاکٹر نثار احمد
مغربی جمہوریت، حقیقت اور سراب	ڈاکٹر مستفیض احمد علوی
حضور ﷺ بحیثیت سپہ سالار	محمد فتح اللہ گلن

کتاب سرائے
پبلشرز، ڈسٹری بیوٹرز، مشیران کتب خانہ جات
الحمد مارکیٹ، غزنی سٹریٹ، اردو بازار، لاہور۔ پاکستان
فون: 042-7320318، فیکس: 042-7239884
ای میل: hikmat100@hotmail.com

فضلی کتاب
فضلی بک سپر مارکیٹ
اردو بازار، نزد ریڈیو پاکستان، کراچی۔
فون: 2212991-2629724